خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ
خواتین ڈائجسٹ
اکتوبر 2022
www.pklibrary.com

آپ سے کیا پردہ

یاد رفتہ

مجھ سے ملیے

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

نظمیں غزلیں

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پہ ڈراما، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بہ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

pklibrary.com

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) .... 1,440 روپے
ایشیا افریقہ، یورپ .... 21000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ۔ 24000 روپے
سالانہ خریداری کے لیے ای میل کریں
subscriptions@khawateendigest.com

بیوٹی بکس

واٹس ایپ
03172266944

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617 Fax: 92-21-32766872 0317 2266944
Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

خواتین ڈائجسٹ اکتوبر کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

ربیع الاوّل کے مبارک مہینے کا آغاز ہو چکا ہے۔ وہ مبارک مہینہ جس میں فخرِ انسانیت، شافع محشر باعثِ تخلیقِ کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہوا۔ جو پوری کائنات پر اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی رحمت اور برکت ہے، آپؐ پر کروڑوں درود، لاکھوں سلام۔

آپ انبیا علیہم السلام میں بھی سب سے افضل مقام پر فائز ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذکر کو رفعت و بلندی عطا کی۔ ایسی بلندی کہ اپنے نام کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کو جوڑ دیا۔ پوری انسانی تاریخ میں کوئی ایسی شخصیت نہیں گزری جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمسری کا دعوا کر سکے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اخلاق کے جس بلند درجہ پر فائز تھے، اللہ تعالیٰ نے اس کی قرآن پاک میں تعریف کی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم واحد ہستی ہیں جن کی زندگی کا ہر گوشہ محفوظ اور روشن ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہالت کی دلدل میں پھنسی قوم کو رفعت اور کامیابی سے ہمکنار کیا۔ انہیں تہذیب و تمدن سے آشنا کیا۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات تھیں جن پر عمل کر کے مسلمانوں نے دنیا پر حکمرانی کی۔ آج بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات ایک عالم میں روشنی پھیلا رہی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام انسانیت کی راہوں کو منور کر رہا ہے۔ اور قیامت تک کرتا رہے گا۔

آج بھی انسانیت کی بقا کا ایک ہی راستہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل کیا جائے۔

سانحہ ارتحال،

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے ایک مخلص کارکن، ہمارے ساتھی عابد حسین صاحب دنیا سے رخصت ہو گئے۔

اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔

عابد صاحب نے بہت طویل وقت ہمارے ساتھ گزارا۔ وہ خواتین ڈائجسٹ کے ابتدائی دور سے ہمارے ساتھ تھے۔ چار عشروں سے زیادہ عرصہ پر محیط اس سفر میں انہوں نے بڑی فرض شناسی اور لگن کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیے۔ وہ ایک سادہ دل اور مخلص انسان تھے اور اچھا اخلاق ان کی سب سے بڑی خوبی تھی جس کی بنا پر وہ ادارے میں ہر دل عزیز تھے۔ ان کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا ہے، وہ پُر ہونا مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کے متعلقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

دعائے مغفرت،

اکتوبر کا مہینہ آتا ہے تو یادوں کی راہ گزر پر چراغ سے جل اٹھتے ہیں۔ یہی مہینہ تھا جب محمود بابر فیصل ہمیں داغِ مفارقت دے گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔

قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

اس شمارے میں،

- عمیرہ احمد کا ناول۔ دانہ پانی، ٭ نمرہ احمد کا مکمل ناول۔ مالا،
- سمیرا حمید کا مکمل ناول۔ مشکِ بام، ٭ آسیہ رئیس خان کا مکمل ناول۔ وہ جو پیچھے رہ گئے،
- ام ایمان قاضی کا مکمل ناول۔ مالِ غنیمت، ٭ قرۃ العین سکندر کا ناولٹ۔ تیرے جیسا کوئی اور نا،
- قرۃ العین خرم ہاشمی، سمابنت عاصم اور سونیا ربانی کے افسانے،
- آپ کی پسندیدہ مصنفہ نایاب جیلانی سے ملاقات، ٭ باتیں شنا نادر سے،
- کرن کرن روشنی۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ، ٭ ازدواجی نفسیاتی الجھنیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

pklibrary.com

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔
قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔
پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔
کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔
ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرامؓ اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

نبیؐ کو جبرئیل علیہ السلام کا دم کرنا

ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہوتے تو جبرئیل علیہ السلام آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ دعا پڑھتے۔
''اللہ تعالیٰ کے نام سے میں مدد چاہتا ہوں، وہ آپ کو ہر بیماری سے اچھا کرے گا۔ آپ کو ہر جلنے والے کی جلن سے بچائے گا اور ہر بری نظر ڈالنے والے کی نظر سے آپ کو بچائے گا۔''
سیدنا ابوسعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ جبریل علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہنے لگے۔
''اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! آپ بیمار ہو گئے؟''
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''ہاں۔''
سیدنا جبرئیل علیہ السلام نے کہا۔ ''میں اللہ تعالیٰ کے نام سے آپ پر دم کرتا ہوں، ہر اس چیز سے، جو آپ کو ستائے اور ہر جان کی برائی سے یا حاسد کی نگاہ سے۔ اللہ آپ کو شفا دے۔ اللہ کے نام سے میں آپ پر دم کرتا ہوں۔''

یہودیوں کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو

ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں۔
''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بنی زریق کے ایک یہودی نے جادو کیا جس کو لبید بن اعصم کہتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خیال آتا کہ میں یہ کام کر رہا ہوں۔ حالانکہ وہ کام کرتے نہ تھے۔ ایک دن یا ایک رات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی پھر دعا کی پھر فرمایا۔
''اے عائشہ! تجھے معلوم ہوا کہ اللہ جل جلالہ نے مجھے وہ بتا دیا جو میں نے اس سے پوچھا۔ میرے پاس دو آدمی آئے، ایک میرے سر کے پاس بیٹھا اور دوسرا پاؤں کے پاس (وہ دونوں فرشتے تھے) جو سر کے پاس بیٹھا تھا، اس نے دوسرے سے کہا (یا جو

pklibrary.com

پاؤں کے پاس بیٹھا تھا اس نے سر کے پاس بیٹھے ہوئے سے کہا)

"اس شخص کو کیا بیماری ہے؟"

وہ بولا۔ "اس پر جادو ہوا ہے۔"

اس نے پوچھا۔ "کس نے جادو کیا ہے؟"

وہ بولا۔ "لبید بن اعصم نے۔"

پھر اس نے پوچھا۔ "کس میں جادو کیا ہے؟"

وہ بولا۔ "کنگھی میں اور ان بالوں میں جو کنگھی سے جھڑے اور نر کھجور کے گابھے کے ریشے میں۔"

اس نے پوچھا۔ "یہ کہاں رکھا ہے؟"

وہ بولا۔ "ذی اردان کے کنویں میں۔"

ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چند اصحاب کے ساتھ اس کنویں پر گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اے عائشہ! اللہ کی قسم۔ اس کنویں کا پانی ایسا تھا جیسے مہندی کا زلال اور وہاں کے کھجور کے درخت ایسے تھے جیسے شیطانوں کے سر۔"

میں نے عرض کیا۔ "یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو جلا کیوں نہیں دیا؟" (یعنی وہ جو بال وغیرہ نکلے)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "مجھے تو اللہ نے ٹھیک کر دیا۔ اب مجھے لوگوں میں فساد بھڑکانا برا معلوم ہوا۔ پس میں نے حکم دیا وہ گاڑ دیا گیا۔"

اللہ کے نام کا دم اور پناہ مانگنے کا بیان

سیدنا عثمان بن ابی العاص ثقفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے ایک درد کی شکایت کی جو ان کے بدن میں پیدا ہو گیا تھا، جب سے وہ مسلمان ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم اپنا ہاتھ درد کی جگہ پر رکھو اور تین بار بسم اللہ کہو۔ اس کے بعد سات بار یہ کہو۔ "میں اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتا ہوں، اس چیز کی برائی سے جس کو پاتا ہوں اور جس سے ڈرتا ہوں۔"

بچھو کے ڈسے آدمی کو سورۃ فاتحہ سے دم

سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے کچھ لوگ سفر میں تھے اور عرب کے کسی قبیلہ کے پاس سے گزرے اور ان سے مہمان نوازی چاہی تو انہوں نے مہمانی نہ کی۔ وہ کہنے لگے۔

"تم میں سے کسی کو منتر یاد ہے؟"

ان کے سردار کو بچھو نے کاٹا تھا۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں سے ایک شخص بولا۔

"ہاں، مجھے منتر آتا ہے۔"

پھر اس نے سورۃ فاتحہ پڑھی تو وہ اچھا ہو گیا اور انہوں نے اس کو بکریوں کا ایک گلہ دیا تو اس نے نہ لیا اور یہ کہا۔

"میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ لوں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا اور کہا۔

"یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اللہ کی قسم میں نے کچھ نہیں کیا سوائے سورۃ فاتحہ کے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہنسے اور فرمایا۔

"تجھے کیسے معلوم کہ وہ منتر ہے؟"

پھر فرمایا۔

"وہ بکریوں کا گلہ لے لے اور اپنے ساتھ ساتھ ایک حصہ میرے لیے بھی لگانا۔" (کیونکہ قرآن نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا)۔

ہر زہر کو دفع کرنے کے لیے دم کرنا

اسود کہتے ہیں۔ میں نے ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے دم کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کے ایک گھر والوں کو زہر کے لیے دم کرنے کی اجازت دی۔" (جیسے سانپ بچھو کے کاٹنے سے)۔

pklibrary.com

”نملہ“ (ایک قسم کی پھنسی) کے لیے دم کا بیان

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نظر اور ڈنک (زہر) اور نملہ کے لیے دم کیا۔ (نملہ) ایک پھنسی ہے۔ جس میں جلن ہوتی ہے اور جگہ بدلتی رہتی ہے یا وہ پھنسیاں جو بغل میں ہوں)۔

بچھو کے لیے دم کی اجازت

سیدنا جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دم سے منع کیا تو عمرو بن حزم کے لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا۔

”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہمارے پاس بچھو کا دم ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دم کرنے سے منع فرمایا ہے۔“

راوی کہتے ہیں کہ انہوں نے وہ دم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”میں اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتا۔ تم میں سے اگر کوئی اپنے بھائی کو نفع پہنچا سکتا ہو تو پہنچائے۔“

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا۔

ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور بولا۔

”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے اس بچھو سے بڑی تکلیف پہنچی جس نے کل رات مجھے کاٹا۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”اگر تو شام کو یہ کہہ لیتا کہ ”اعوذ بکلمات اللہ التامات“ تو تجھے ضرر نہ کرتا۔“ (نہ کاٹتا)

نظر بد کے لیے غسل

سیدنا ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”نظر سچ ہے (یعنی نظر میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے تاثیر ہے) اور اگر کوئی چیز تقدیر سے آگے بڑھ سکتی تو نظر ہی بڑھ جاتی (لیکن تقدیر سے کوئی چیز آگے بڑھنے والی نہیں) جب تم سے غسل کرنے کو کہا جائے تو غسل کرو۔ (کیونکہ جس کی نظر بد لگ جائے، اس کے غسل کے پانی سے نظر لگے ہوئے کو غسل کرا دیا جائے تو ٹھیک ہو جاتا ہے۔)“

نظر بد کا دم

ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے نظر (لگ جانے کی وجہ سے) دم کرنے کا حکم دیتے۔

سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حرم کے لوگوں کو سانپ کے (کاٹے کے) لیے دم کرنے کی اجازت دی اور اسماء بنت عمیس سے فرمایا۔

”کیا سبب ہے کہ میں اپنی بھائی کے بچوں کو (یعنی جعفر بن ابو طالب کے لڑکوں کو) دبلا پاتا ہوں تو کیا وہ بھوکے رہتے ہیں؟“

اسماء نے کہا۔ نہیں بلکہ ان کو نظر جلدی لگ جاتی ہے۔“

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”کوئی دم کر۔“

میں نے ایک دم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”ان کو دم کر دیا کر۔“

نظر بد سے دم کرنے کے متعلق

ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں ایک لڑکی کو دیکھا جس کے منہ پر چھائیاں تھیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

pklibrary.com

"اس کو نظر لگی ہے، اس کے لیے دم کرو۔"

زمین کی مٹی سے دم

ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے۔

"جب ہم میں سے کوئی بیمار ہوتا یا اس کو کوئی زخم لگتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی شہادت کی انگلی کو زمین پر رکھتے اور فرماتے۔

"اللہ کے نام سے ہمارے ملک کی مٹی، کسی کے تھوک کے ساتھ اس سے ہمارا بیمار شفا پائے گا اللہ تعالیٰ کے حکم سے۔"

سیدہ خولہ بنت حکیم السلمیہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے۔

"جو شخص کسی منزل میں اترے پھر کہے کہ میں تمام مخلوق کی شرارتوں سے اللہ تعالیٰ کے ان کامل التاثیر کلمات کی پناہ لیتا ہوں، اس کی پیدا کی ہوئی ہر چیز کے شر سے بچنے کے لیے" تو اس کو کوئی چیز نقصان نہ پہنچائے گی۔ یہاں تک کہ اس منزل سے کوچ کرے۔"

گھر والوں کو بیماری میں دم کرنا

ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ جب ہم میں سے کوئی بیمار ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا دایاں ہاتھ اس پر پھیرتے پھر فرماتے۔

"اے مالک! تو اس بیماری کو دور کر دے اور تندرستی دے، تو ہی شفا دینے والا ہے۔ ایسی شفا دے کہ بالکل بیماری نہ رہے۔"

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری سخت ہوئی تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ ویسے ہی کرنے کو پکڑا جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے (یعنی میں نے ارادہ کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا ہاتھ پھیروں اور یہ دعا پڑھوں) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں سے چھڑا لیا پھر فرمایا۔

"اے اللہ! مجھے بخش دے اور مجھے بلند رفیقوں کے ساتھ کر۔" (یعنی فرشتوں اور پیغمبروں کے ساتھ)

ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ پھر جو میں نے دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو چکی تھی (یعنی اس دعا کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے پاس بلا لیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون)۔

ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دم پڑھا کرتے۔

"اے مالک تو اس بیماری کو دور کر دے اور تندرستی دے۔ تو ہی شفا دینے والا ہے، تیری ہی شفا ہے، ایسی شفا دے کہ بالکل بیماری نہ رہے۔"

سیدنا عوف بن مالک اشجعی رضی اللہ تعالیٰ عنہا کہتے ہیں کہ ہم جاہلیت کے زمانہ میں دم کیا کرتے تھے۔ ہم نے کہا۔

"یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بارے میں کیا فرماتے ہیں۔"

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اپنے دم کو میرے سامنے پیش کرو۔" (دم میں کچھ قباحت نہیں۔ اگر اس میں شرک کا مضمون نہ ہو۔)

بخار کو پانی سے ٹھنڈا کرو

سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب ان کے پاس کوئی بخار والی عورت لائی جاتی تو وہ پانی منگواتیں اور اس کے گریبان میں ڈالتیں اور کہتیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اس (بخار) کو پانی سے ٹھنڈا کرو اور فرمایا کہ بخار جہنم کی بھاپ سے ہوتا ہے۔"

pklibrary.com

بہنوں کا اپنا ماہنامہ
شعاع

اکتوبر 2022
کے شمارے کی ایک جھلک

اکتوبر 2022
کا شمارہ شائع ہوگیا ہے

- "ہم اور بلبلیں" فرزانہ کھرل کا مکمل ناول،
- "ہم ملے" حبیبہ شیراز کا مکمل ناول،
- "والعصر" امت العزیز شہزاد کا ناول،
- "نور القلوب" تنزیلہ ریاض کے ناول کی آخری قسط،
- "تیرے اقرار کا موسم" شازیہ جمال طارق کا ناولٹ،
- ہاجرہ ریحان، شازیہ الطاف ہاشمی، تحسین گل، حمیرا شفیع، زارا ہنجرا اور قرۃ العین خرم ہاشمی کے افسانے،
- معروف اداکارہ "فضیلہ قیصر" سے ملاقات،
- اداکارہ "ثنا نادر" سے باتیں،
- "جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" قارئین کے تجربات،
- "دستک" معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ،
- "پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتیں" احادیث کا سلسلہ،
- خط آپ کے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

شعاع ہر ماہ پوری محنت سے ترتیب دیتے ہیں، لیکن آپ کے خط ہمیں بتاتے ہیں کہ ہم اپنی محنت میں کتنے کامیاب ٹھہرے، ہمیں خط لکھنا نہ بھولیے گا۔

شعاع اکتوبر 2022 کا شمارہ آج ہی خرید لیں

فقیر بن کر

انشاء جی

فقیر بن کر تم ان کے در پر ہزار دھونی رما کے بیٹھو
جبیں کے لکھے کو کیا کرو گے، جبیں کا لکھا مٹا کے بیٹھو

اے ان کی محفل میں آنے والو، اے سودو سودا بتانے والو
جو ان کی محفل میں آ کے بیٹھو تو ساری دنیا بھلا کے بیٹھو

بہت جتاتے ہو چاہ ہم سے، مگر کرو گے نباہ ہم سے؟
ذرا ملاؤ نگاہ ہم سے، ہمارے پہلو میں آ کے بیٹھو

جنوں پرانا ہے عاشقوں کا، جو یہ بہانا ہے عاشقوں کا
تو اک ٹھکانا ہے عاشقوں کا، حضور جنگل میں جا کے بیٹھو

ہمیں دکھاؤ نہ زرد چہرا، لیے یہ وحشت کی گرد چہرا
رہے گا تصویر درد چہرا، جو روگ ایسے لگا کے بیٹھو

جناب انشاء یہ عاشقی ہے، جناب انشاء یہ زندگی ہے
جناب انشاء جو ہے یہی ہے، نہ اس سے دامن چھڑا کے بیٹھو

pklibrary.com

باتیں ثنا نادر سے

شاہین رشید

1 ''اصلی نام؟''
''ثناء نادر شاہ۔''
2 ''پیار کا نام؟''
''سنو، بی بی......(Sanu bibi)''
3 ''تاریخ پیدائش؟''
''11 فروری 2000ء۔''
4 ''ہائیٹ/ستارہ؟''
''5 فٹ 6 انچ برج دلو۔''
5 ''مادری زبان؟''
''اردو۔''
6 ''فیملی ممبرز؟ / آپ کا نمبر ؟''
''امی دو بھائی اور میں، میں درمیان کی ہوں۔''
7 ''شادی ؟''
''ابھی نہیں ہوئی۔''
8 ''تعلیم؟''
''بی بی اے۔''
9 ''شوبز میں آمد/گھر والوں کا ردعمل؟''
''امی ہیں اس فیلڈ میں/ اور گھر والوں کو بہت خوشی ہوئی تھی...... کیونکہ اس فیلڈ میں آنا میرا خواب تھا۔''
10 ''بچپن میں کس سے بہت ڈر لگتا تھا؟''
''اندھیرے سے اور ابھی تک ڈر لگتا ہے اندھیرے سے۔''
11 ''پہلی کمائی کتنی تھی اور کس کے ہاتھ میں رکھی تھی؟''
''20.000 تھی اور مما کے ہاتھ میں رکھی تھی۔''
12 ''بچپن کا پہلا پیار؟''
''کوئی بھی نہیں۔''
13 ''گھر میں کون روک ٹوک زیادہ کرتا ہے؟''
''کوئی نہیں روک ٹوک کرتا۔''
14 ''کیا آپ صبح جلدی اٹھنے کی عادی ہیں؟''
''جی بالکل۔ میں صبح خیز ہوں اور صبح کے وقت اگر بلیک کافی نہ ملے تو صبح نہیں ہوتی میری۔''
15 ''کیا برداشت نہیں بھوک یا غصہ؟''
''غصہ۔''
16 ''پاکستان کے لیے کیا سوچتی ہیں؟''
''ترقی اور امن۔''

pklibrary.com

18 ''کس ملک کی شہریت کی خواہش ہے؟''
''کسی ملک کی بھی نہیں۔''
19 ''آپ کی آج کل کی مصروفیات؟''
''ابھی صرف کام پر فوکس ہے۔ اس لیے یہی مصروفیات ہیں۔''
20 ''میڈیا میں کیا اچھا ہے، کیا برا ہے؟''
''انسان کو اچھا ہونا چاہیے تب اسے سب اچھا لگے گا۔ میڈیا میں ابھی تک ایسا کچھ فیس نہیں کیا۔ برائی ابھی تک دکھائی نہیں دی۔''
21 ''کھیلوں سے آپ کا لگاؤ/ کون سا گیم پسند ہے؟''
''بہت لگاؤ ہے/ اور مجھے ٹینس اور کرکٹ پسند ہے۔''
22 ''کس بات پر آپ کی آواز اونچی ہو جاتی ہے؟''
''جب کوئی جھوٹ بولے۔''
23 ''تین چیزیں جنہیں خریدنا آپ کا خواب ہے؟''
''اپنا ذاتی گھر اور گاڑی بس۔''
24 ''کس کی خاطر یہ فیلڈ چھوڑ سکتی ہیں؟''
''کسی کی بھی خاطر نہیں چھوڑوں گی۔ یہ فیصلہ صرف میرا ہوگا۔''
25 ''کون سا کام ہے جو پہلے کبھی نہیں کیا تھا؟''
''ڈرامے...... ہاہاہا......''
26 ''تنہائی کا احساس کب ہوتا ہے؟''
''جب مما گھر پر نہیں ہوتیں تب تنہائی کا احساس ہوتا ہے۔''
27 ''گھر کی کوئی چیز خراب ہو تو ٹھیک کرانے کی ذمہ داری کس کی ہوتی ہے؟''
''مما اور میری۔''
28 ''زندگی میں کچھ واپس ملنے کا چانس ملے تو کیا واپس لینا چاہیں گی؟''
''میرے بابا...... کیونکہ جب میں سولہ سال کی تھی تو اپنے بابا سے محروم ہو گئی تھی۔''
29 ''گھر میں آپ کے فیصلے پر مداخلت کون کرتا ہے؟''
''کوئی بھی نہیں۔''
30 ''بیمار ہونے پر بیماری کو سیریس لیتی ہیں؟''
''جی بالکل ...... کیونکہ جان اور صحت ہے تو سب کچھ ہے۔''
31 ''آپ کے اب تک کے ڈراموں کی تعداد/شہرت کس نے دی؟''
''پہلا ڈرامہ ۔ سیریل بدنصیب ہے اور اسی نے شہرت بھی دی۔''
32 ''کون سے رول کرنے کی خواہش ہے نیگیٹیو یا پوزیٹو؟''
''نیگیٹو۔''
33 ''ادب سے لگاؤ/کس کو پڑھا؟''
''کسی کو نہیں۔''
34 ''کوئی فیصلہ جو غلط ثابت ہوا ہو؟''
''کوئی فیصلہ غلط ثابت نہیں ہوا۔''
35 ''کچن سے لگاؤ؟ کبھی شیف بننے کی خواہش ہوئی؟''
''کچن سے بہت لگاؤ ہے اور کھانا بنانے کا بھی بہت شوق ہے۔ مگر شیف بننے کا نہیں سوچا۔''
36 ''کس شخصیت پر چاہتے ہوئے بھی غصہ نہیں کر سکتیں؟''
''اپنی ماں پر۔''
37 ''Looks بدلنے کا موقع ملے تو کس کی طرح نظر آنا چاہیں گی؟''
''میں جیسی ہوں، ویسی ہی ٹھیک ہوں۔''
38 ''ملک کی ترقی کی راہ میں کون رکاوٹ ہے؟ عوام یا حکمران؟''
''دونوں ہی رکاوٹ ہیں۔ عوام بھی اور حکمران بھی۔''

pklibrary.com

39 ''کبھی غربت میں وقت گزارا ہے؟''
''جی گزارا ہے۔ اور وہ بھی بہت زیادہ ......
لیکن غربت انسان کو بہت کچھ سکھاتی بھی ہے۔''
40 ''طالب علمی کے زمانے میں کون سا مضمون برا لگتا تھا؟''
''اکنامکس بہت برا لگتا تھا۔''
41 ''ڈاکٹر، حکیم اور ہومیو پیتھک ...... کس پر یقین ہے؟''
''سب اپنی دلچسپی کے حساب سے تعلیم حاصل کرتے ہیں اور سب کا اپنا اپنا یقین ہوتا ہے۔ مجھے ڈاکٹرز پر یقین ہے۔''
42 ''دنیا کا سب سے بورنگ کام؟''
''کپڑے استری کرنا ...... اس کام سے میں ہمیشہ بھاگتی ہوں۔ میرا بس چلے تو میں کپڑے استری ہی نہ کروں۔''
43 ''کیا دل سے اترا ہوا شخص پہلے جیسا مقام حاصل کر سکتا ہے؟''
''بالکل بھی نہیں دل سے جو ایک بار اتر گیا، وہ اتر گیا۔''
44 ''اپنے ہر کام کے لیے کس سے مشورہ لیتی ہیں؟''
''مما سے لیتی ہوں ...... کیونکہ ماں سے بہتر کوئی اچھا دوست نہیں۔''
45 ''گھر کا کون سا کام پسند نہیں؟''
''کام، میں سارے کر لیتی ہوں۔ مجھے گھر صاف کرنا بہت پسند ہے۔ جب میرا شوٹ سے آف ہوتا ہے تو میں گھر کے کاموں میں ہی لگی رہتی ہوں۔ بس استری کرنا پسند نہیں۔''
46 ''غصے میں منہ سے کیا نکلتا ہے؟''
''میں غصے میں چپ ہو جاتی ہوں۔ کیونکہ غصے میں کہی ہوئی کوئی بھی بات سامنے والے کو ''ہرٹ'' کر سکتی ہے۔ تو بہتر یہی ہوتا ہے کہ میں اس وقت کے لیے تھوڑا فاصلہ اختیار کر لیتی ہوں۔''
47 ''ٹی وی ٹاک شو کے بہترین اینکر؟''
''سلمان خان (بگ باس)۔''
48 ''آپ کا راز دار کون ہے؟''
''میرے بھائی اور مما۔''
49 ''فیملی پر آپ کا کتنا رعب ہے؟''
''گھر میں کسی کا کسی پر رعب نہیں ہے، ہم سب پیار سے رہتے ہیں۔''
50 ''کون سی تاریخیں یاد رکھتی ہیں؟''
''صرف اپنی برتھ ڈے کی ...... ہاہاہا۔''
51 ''ایک کھانا جو کسی بھی وقت کھا سکتی ہیں؟''
''دال چاول مجھے بہت پسند ہیں۔ میں پورا مہینہ بھی کھا سکتی ہوں۔''
52 ''کیا اپنا ڈرامہ بار بار دیکھتی ہیں؟''
''جی بالکل ...... بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے، اپنا ڈرامہ دیکھ کر۔''
53 ''اپنے ڈرامے دیکھ کر کیا کمی محسوس ہوتی ہے؟''
''کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی ...... کیونکہ میں ہمیشہ اپنا بیسٹ ہی دیتی ہوں۔''
54 ''ایک غلطی جس پر کبھی معافی نہیں مانگتیں؟''
''میں ہر غلطی پر معافی مانگ لیتی ہوں۔ تاکہ بات دلوں میں نہ رہ جائے۔''
55 ''پہلی فلم جو سینما میں دیکھی؟''
''یاد نہیں۔''
56 ''بچپن میں کس وجہ سے مار کھاتی تھیں؟''
''بچپن میں کبھی مار نہیں پڑی۔''
57 ''کون سا رول کرنے کی خواہش ہے؟''
''نفسیاتی اور اس کے ساتھ تھوڑا پاگل پن والا رول کرنے کی خواہش ہے۔''
58 ''ایک گانا جو اکثر گنگناتی ہیں؟''
''آنکھیں ملانے والے، دل کو چرانے والے، نازیہ حسن کا یہ گانا مجھے بہت پسند ہے اور میں اکثر گنگناتی رہتی ہوں۔''

pklibrary.com

59 ''کس رول کو کرنے سے انکار کر دیں گی؟''
''وہ رول کرنے سے منع کر دوں گی جس سے ناظرین کو غلط پیغام ملے میری طرف سے۔''
60 ''کس سیاست دان کا رول کرنے کی خواہش ہے؟''
''مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح صاحبہ کا۔''
61 ''علم نجوم پر کتنا یقین ہے۔ کبھی نجومی کو ہاتھ دکھایا؟''
''ہاتھ تو دکھایا ہے۔ مگر یقین نہیں ہے کیونکہ میں سمجھتی ہوں کہ آپ کا نصیب صرف اللہ ہی جانتا ہے اور کوئی نہیں۔''
62 ''کس کام کو کرنے کے لیے بہت سوچتی ہیں؟''
''تیار ہونے سے پہلے اور میک اپ کرنے سے پہلے بہت سوچتی ہوں۔''
63 ''کب جھوٹ کا سہارا لیتی ہیں؟''
''جھوٹ میں نہیں بولتی۔ سچ کا ہی ہمیشہ سہارا لیا ہے سچ سے چیزیں صحیح رہتی ہیں۔''
64 ''تقریب میں جانے کے لیے کس کی مرضی سے تیار ہوتی ہیں؟''
''اپنی مرضی سے تیار ہوتی ہوں۔''
6 5 ''ادھار کس سے بلا جھجک مانگ لیتی ہیں؟''
''صرف اپنے بھائیوں سے۔''
66 ''اپنا فیوچر کیسا دیکھتی ہیں؟''
''بہت آگے تک دیکھتی ہوں اپنے آپ کو...... لیکن اللہ کے ہاتھ میں ہے سب کچھ، میں صرف محنت ہی کر سکتی ہوں۔''
67 ''سگنل پر کھڑے ہو کر کس چیز کا جائزہ لیتی ہیں؟''
''ہاہاہا...... کہ یہ لوگ ایک لائن میں کیوں نہیں چل سکتے۔''
68 ''بچپن میں کون سے فنکار پسند تھے؟''
''میں شاہ رخ خان کی بہت بڑی فین ہوں۔ بچپن سے ہی اور ابھی تک ہوں۔''
69 ''خواتین رائٹرز میں آپ کی پسندیدہ رائیٹر؟''
''میں بکس زیادہ نہیں پڑھتی۔ اس لیے ان کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں۔''
70 ''بچپن میں کون سے گیمز کھیلے؟''
''کھوکھو Hide and seek (آنکھ مچولی) بہت پسند تھا اور ابھی بھی موقع ملے تو اسی طرح کھیلوں گی جیسا بچپن میں کھیلتی تھی۔''
71 ''شاپنگ کے لیے نکلتی ہیں تو پہلے کس کا خیال آتا ہے؟''
''اپنا ہی خیال آتا ہے۔ مگر اپنے لیے کم اور باقی کے لیے چیزیں خرید لیتی ہوں۔ اپنے لیے کیا لینا ہے کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا۔''
72 ''اپنی تعریف سن کر کیسا محسوس ہوتا ہے؟''
''بہت اچھا محسوس ہوتا ہے۔''
73 ''کبھی چھپ چھپ کر دوسروں کی باتیں سنیں؟''
''بہت دفعہ اور بہت مزہ آتا ہے باتیں سننے میں۔''
74 ''اپنی کمائی کس چیز پر خرچ کرتی ہیں؟''
''کھانے پینے میں ...... کھانا پینا بہت پسند ہے۔ میرا بس چلے تو سارا دن ہی کچھ نہ کچھ کھاتی رہوں۔''
75 ''کس طرح کے کام کرنے مشکل لگتے ہیں؟''
''جو مجھ سے ہو نہیں پاتے...... ہاہاہا۔''
76 ''یوٹیوب میں آپ کا پسندیدہ چینل؟''
''کامیڈی چینل ...... یا پھر جو چینل اچھا لگتا ہے، وہ ہی دیکھتی ہوں۔''
77 ''کیا آپ کے اندر بھی ایک ولن ہے؟''
''ولن نہیں کہہ سکتی، لیکن کبھی کبھی غصہ بہت

pklibrary.com

آ جاتا ہے۔"

78 "آپ کے علاوہ کون اس فیلڈ سے ہے؟"

"میری مما "فرح نادر" اس فیلڈ سے ہیں۔"

79 "بچت کس شکل میں کرتی ہیں؟"

"پراپرٹی کی شکل میں...... کیونکہ پراپرٹی ہمیشہ بڑھتی ہے، کبھی کم نہیں ہوتی۔"

80 "شادی میں کن رسموں کے خلاف ہیں؟"

"جوتا چھپائی کی رسم کے خلاف ہوں۔ مجھے اس کی کوئی لاجک سمجھ میں نہیں آتی۔"

81 "کون سا کھانا زہر مار کر کے کھاتی ہیں؟"

"کڑی چاول مجھے بالکل بھی پسند نہیں اور مجھے یاد بھی نہیں کہ آخری بار میں نے کب کھائے تھے۔"

82 "آپ کے موبائل پر صبح وسویرے پہلا SMS میسج کس کا آتا ہے؟"

"اسسٹنٹ ڈائریکٹر کا آتا ہے کہ اٹھ جائیں گاڑی آنے والی ہے آدھے گھنٹے میں۔ شوٹ کے لیے تیار ہو جائیں۔ ہاہاہا۔"

83 "صبح اٹھتے ہی کیا بات لبوں سے نکلتی ہے؟"

"کہ پھر اٹھنے میں دیر ہو گئی۔ رات کو جلدی سو جاتی تو اچھا تھا۔"

84 "فیملی میں کون مزاج کا گرم ہے؟"

"میرے بابا تھے...... مگر ان کے جانے کے بعد کوئی بھی ایسا نہیں ہے کہ جو مزاج کا گرم ہو۔"

85 "آپ کی کس بات سے آپ کی مما ناراض ہو جاتی ہیں؟"

"جب میں پانی نہیں پیتی...... پانی پینے کی چور ہوں۔ پانی پینا بھول جاتی ہوں۔ اس پر مما کو غصہ آتا ہے۔"

86 "بچپن کا کون سا خواب پورا نہیں ہوا؟"

"میں ہمیشہ سے لائر (وکیل) بننا چاہتی تھی۔ بس یہی خواب پورا نہیں ہوا۔"

87 "پسندیدہ تہوار؟"

"یہی عید وغیرہ۔ 14 اگست۔"

88 "جانوروں میں پسندیدہ جانور؟"

"میرا پسندیدہ جانور کتا ہے جو کہ بہت وفادار ہوتا ہے۔"

89 "کن باتوں سے موڈ خراب ہو جاتا ہے؟"

"اگر کوئی جھوٹ بولے اور بے ایمانی کرے تو میرا موڈ خراب ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہ دونوں برائیاں الحمد للہ مجھ میں نہیں ہیں۔"

90 "کیا چیز نشے کی حد تک پسند ہے؟"

"بلیک کافی، اس کے بغیر میرا دن نہیں گزرتا بلکہ شروع ہی نہیں ہوتا۔"

91 "مہینے میں کتنی بار گھر سے باہر کھانا کھاتی ہیں؟"

"تقریباً روز ہی باہر کھاتی ہوں۔ کیونکہ شوٹ پر ہوتی ہوں۔ ویسے گھر کے کھانے کی تو کیا ہی بات ہے۔"

92 "بجلی کی بچت کس طرح کرنی چاہیے؟"

"فضول قسم لائٹیں بند رکھنی چاہئیں۔"

93 "کھانا کھانا کہاں پسند ہے؟ ڈائننگ ٹیبل بیڈ یا چٹائی پر؟"

"بیڈ پر کھانا کھانا بہت برا لگتا ہے۔ چٹائی پر زیادہ دیر بیٹھا نہیں جاتا تو سب سے بہترین جگہ ڈائننگ ٹیبل ہی ہے۔"

94 "کس کے لیے اپنا شیڈول بدل سکتی ہیں؟"

"اپنے لیے اور اپنی امی کے لیے۔"

95 "اچھی بری خبر سب سے پہلے کس کو سناتی ہیں؟"

"اپنی امی کو...... گھر والوں کو اور دوستوں کو۔"

96 "آپ کی شہرت کو اگر زوال آ جائے تو؟"

"تو کچھ نہیں ہوگا، جو نصیب میں لکھا ہے وہی ہونا ہے۔ شاید اسی میں اللہ کی کوئی بہتری ہوگی۔"

☆☆

pklibrary.com

آپ کی پسندیدہ مصنفہ

نایاب جیلانی سے ملاقات

شاہین رشید

گزشتہ سے پیوستہ

"میرے شوہر مجھ پر فخر کرتے تھے۔"

"میں یہی تو پوچھنا چاہ رہی ہوں کہ پہلی شادی کیوں ناکام ہوئی جبکہ شوہر تم پر فخر بھی کرتے تھے۔"

"یہاں میں یہ بات بتانا چاہوں گی کہ جب تک میری شادی نہیں ہوئی تھی، میری پھوپھو (ساس) مجھ سے بہت محبت کرتی تھیں۔ سب بھتیجیوں میں' میں ہی ان کی لاڈلی بھی تھی۔ میرے لیے گفٹ لانا' میرا خیال رکھنا سب کچھ مجھے پر نچھاور کرتی تھیں۔ بچپن میں جب میں ان کے گھر جاتی تھی تو پندرہ پندرہ دن ان کے گھر رہ کر آتی تھی۔ پھوپھو کی ایک ہی بیٹی تھی جو کہ شادی شدہ تھی مگر زیادہ تر وہ ادھر یعنی میکے میں ہی رہتی تھی۔ اس کے بچے بھی میکے میں ہی پیدا ہوئے۔ اس کا میاں کہیں دور جاب کرتا تھا اور ویک اینڈ پر ہی آتا تھا۔

بس جب میں بیاہ کر پھوپھو کے گھر آئی تو میری نند کو جیسے یہ بات اچھی نہیں لگی۔ وہ چاہتی تھی کہ پھوپھو یعنی میری امی مجھ سے ہی پیار کریں اور میرے بچوں پر (نواسے نواسیوں) ہی توجہ دیں۔

پھوپھو پر اپنی بیٹی کا ہولڈ تھا اور میرے شوہر پر بھی اپنی بہن کا بہت زیادہ ہولڈ تھا۔ وہ مجھے سسرال میں رہنے ہی نہیں دیتی تھی میں زیادہ تر اپنے والد کے ساتھ ہی رہتی تھی۔ میں نے گھر بسانے کے لیے بہت قربانیاں دیں۔ مگر پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ مجھے لگا کہ اب میرا گزارا نہیں ہے سسرال میں۔

ہم سید لوگ ہیں آسانی سے طلاق نہیں ہوتی۔ برا سمجھا جاتا ہے۔ اگر سمجھوتہ نہ ہو رہا ہو تو بھی آسانی سے طلاق نہیں ہوتی لیکن دو سال میں نے بہت ضد لگائی کہ مجھے نہیں رہنا۔

ابو بھی ناراض تھے۔ کہتے تھے کہ اس کے نام پر بیٹھی رہو۔ مگر...... بس پھر...... ہوگئی طلاق...... اور جہاں تک دوسری شادی کی بات ہے تو وہ بھی بس اچانک ہی ہوگئی۔ بغیر کسی وجہ کے۔ دوسری شادی امی کی مرضی سے ہوئی۔ میری بھی پسند شامل تھی۔ یہ جلد بازی کا فیصلہ تھا اور اب میں سوچتی ہوں کہ اتنی جلد بازی میں مجھے یہ فیصلہ نہیں کرنا چاہیے تھا اور پھر یہ شادی بھی ناکام ہوگئی۔

ابو پر افسوس کرتی تھی کہ انہوں نے میرے حق میں صحیح فیصلہ نہیں کیا۔ تو مجھے اپنے پر بھی افسوس ہوتا ہے کہ میں نے ٹھیک فیصلہ نہیں کیا۔ میں نے نادانی کی اور نقصان بہت اٹھایا۔ جبکہ پہلی شادی میں مجھے کوئی نقصان نہیں ہوا۔

بس تقدیر میں جو لکھا ہو اسے ماننا پڑتا ہے، فیصلہ غلط صحیح کچھ نہیں ہوتا سب کچھ تقدیر کا لکھا پورا ہوتا ہے۔ اللہ نے مجھے بڑے مضبوط اعصاب دیے ہیں میں گھبرائی نہیں کبھی بھی مشکلات سے اللہ نے میرا ساتھ دیا اور مجھے میرے قدموں پر کھڑا کیا۔

"پہلی شادی ٹوٹنے کا پچھتاوا ہے؟"

"حالات ایسے ہوگئے تھے کہ میرے نہ چاہنے کے باوجود طلاق تو ہونی تھی۔ میں نے بہت قربانیاں دیں اور کب تک دیتی' شوہر تو بہت اچھے تھے۔ بہت زیادہ اچھے تھے بہت کوآپریٹو تھے۔ بہت بے ضرر انسان تھے۔ میں چونکہ لاڈلی تھی۔ کام کی عادت نہیں تھی اور گھر میں نوکر رکھنے کا رواج نہیں تھا تو جب

pklibrary.com

میری نند اور پھوپھو کہیں باہر جاتی تھیں تو ثاقب (شوہر) سارے کام کردیتے تھے۔ کھانا بھی پکا دیتے تھے۔ روٹیاں بھی لگوا دیتے تھے۔ مگر ان میں قوت فیصلہ کی بہت کمی تھی وہ اپنی ماں اور بہن کے آگے اسٹینڈ نہیں لے سکتے تھے۔

شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ دو ڈھائی سال کی عمر میں یتیم ہوگئے تھے۔ تو ان کی ماں نے ہی ان کی پرورش کی تھی تو ایسے بچے اپنی ماں کے کنٹرول میں ہوتے ہیں اور میری پھوپھو کا ایکسٹرا کنٹرول تھا اور بہن کا بھی۔ بس ان ہی وجوہات کی بنا پر یہ شادی ختم ہوگئی۔

اچھے انسان تھے۔ مجھے ابھی بھی یاد ہے کہ میں ڈائجسٹ کی اور ناولز کی بہت شوقین تھی تو میرے شوق کو دیکھتے ہوئے انہوں نے لالہ موسیٰ کی ایک لائبریری کا ممبرشپ کارڈ لا کر دے دیا تھا اور ایک ہفتے کے لیے تین چار ناولز لا کر دے دیتے تھے اور میں دو تین دن میں ناولز ختم کرلیا کرتی تھی۔

دن ہو یا رات وہ میرے کسی کام سے انکار نہیں کرتے تھے۔ میں جب بھی کہتی کہ میرے ناولز ختم ہوگئے ہیں تو وہ مزید آٹھ دس ناول لا کر مجھے دے دیا کرتے تھے۔ انتہائی فرماں بردار انسان تھے۔ وہ مجھ سے بارہ سال بڑے ہیں اور میرے فرسٹ کزن ہیں۔ جب عدالت میں ہمارا کیس چل رہا تھا تو عدالت کے جج نے میری بہت منت کی کہ صلح صفائی کرلیں مگر حالات کچھ ایسے تھے کہ سٹیل منٹ ہی نہیں ہوسکتی تھی کیونکہ پھوپھو مجھے بسانا ہی نہیں چاہتی تھیں۔

خیر...... جو ہوا سو ہوا...... نصیب میں جو کچھ لکھا ہوتا ہے وہ ہی ہوتا ہے۔ بس یہ دکھ ہمیشہ رہے گا کہ میری ساس اور نند نے میرا گھر توڑا۔ مجھے، ثاقب سے کوئی شکایت کبھی نہیں ہوئی۔“

”بچے تمہارے پاس ہی رہے؟“

”ثاقب میرے شوہر ہی نہیں میرے فرسٹ کزن بھی ہیں۔ میاں بیوی کا رشتہ ختم ہوا تھا کزن کا رشتہ تو ختم نہیں ہوا۔ لیکن انہوں نے سارے رشتے ناتے توڑ دیے۔ حتیٰ کہ اپنے بچوں کو بھی بھول گئے۔ نہ ان سے ملتے ہیں نہ ان کو کال کرتے ہیں۔ میری بیٹی بہت مس کرتی ہے ان کو ان سے بات کرنا چاہتی ہے مگر مجھے افسوس ہے کہ وہ بالکل ہی لاتعلق ہوگئے ہیں۔ کبھی کبھار تو بات کر ہی لینی چاہیے۔

2016 میں ہماری علیحدگی ہوگئی تھی بلکہ 2014 میں علیحدگی اور 2016 میں طلاق ہوگئی تھی۔ اس تمام عرصے میں انہوں نے کبھی بھی میری مخالفت میں، میری برائی میں کوئی بات نہیں کی۔ انہوں نے اپنی امی کو بھی منع کردیا کہ نایاب کے خلاف کوئی بات نہیں کرنی۔ کوئی الزام نہیں لگانا۔ کیونکہ وہ ایسی ہے ہی نہیں۔ وہ نہیں رہنا چاہتی تو میں زبردستی نہیں کرسکتا۔ میں تو چھوڑنا نہیں چاہتا۔ بس ہمارے نصیب نہیں ملتے تھے۔ ہمارے ستارے نہیں ملتے تھے۔ ہماری بیٹی ضحیٰ کا بہت دل چاہتا ہے اپنے والد سے ملنے کو اور اس نے کوشش بھی کی لیکن ثاقب نے منع کردیا کہ میرے دل کو کچھ ہوگا اسے دیکھ کر اور میں زیادہ اداس ہو جاؤں گا۔“ ضحیٰ نے کہا ”مجھے پتا ہے وہ ہم سے نہیں ملیں گے بس مجھے کوئی ان کا نمبر دے دے۔ میں ان سے بس یہ کہنا چاہتی ہوں کہ ہمیں کچھ مت دیں۔ ملیں بھی نہیں۔ بس ایک بار فون پر بات کرلیں میں ان سے اس لیے بات کروں گی تاکہ زندگی میں کبھی بھی وہ یہ نہ کہہ سکیں میں تو تم لوگوں سے ملنا چاہتا تھا مگر تمہاری ماں کے ڈر سے نہیں ملا، میں اتمام حجت کے لیے ملنا چاہتی ہوں۔ کوئی بہانا کوئی جواز، کوئی دلیل نہ رہے۔

اور میں ضحیٰ کی دلیل سے قائل ہوگئی تھی۔

سنگل پیرنٹ کے طور پر میں کبھی بھی بچوں کی پرورش کا کریڈٹ نہیں لے سکتی۔ اللہ کی کروڑوں رحمتیں نازل ہوں میرے والد صاحب کی قبر پر...... انہوں نے اپنی زندگی میں اور بعد از وفات ہمیں اللہ کے سوا کسی کا محتاج نہیں چھوڑا۔

pklibrary.com

"(بچوں کے والد) یعنی تمہارے میاں نے دوسری شادی کر لی؟"

"نہیں انہوں نے دوسری شادی نہیں کی۔"

"باپ کے بغیر بچوں کی پرورش تمہارے والد صاحب نے کی۔ پھر بھی بچوں کو کمی کا احساس تو ہوتا ہوگا۔"

"ہاں...... میری بیٹی کو ہوتا ہے اور اس کا دل چاہتا ہے اپنے والد سے ملنے کو۔ جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا بھی۔ لیکن مجھے لگتا ہے کہ میں نے اپنے بچوں کی زندگی میں کوئی تشنگی نہیں رہنے دی۔ جن کے باپ ہوتے ہیں وہ بچے بھی ان جگہوں پر نہیں جا سکتے جہاں میں اپنے بچوں کو لے کر جاتی ہوں۔ اچھی ڈریسنگ، اچھا کھانا، اچھی آؤٹنگ، پیار اتنا کہ کوئی کمی نہیں رکھی۔ میرا پورا ننھیال، سارا ددھیال میرے بچوں سے محبت کرتا ہے۔ میرے والد نے میرے بچوں کو ایک شفیق ماں کی طرح پالا ہے۔ جب میں نے چند ایک تنظیمیں جوائن کر لیں تو مجھے مختلف شہروں میں سفر کرنا پڑتا تھا۔ مجھے سیمینار میں بھیج کر میرے والد میرے بیٹے کی خود دیکھ بھال کیا کرتے تھے۔ امی، بھابھی اور میڈ کے ہوتے ہوئے اس کا ڈائپر خود بدلتے تھے تو میں اکثر کہتی کہ کوئی تھوک پھینک دے تو آپ کا دل خراب ہو جاتا ہے کیا صائم کے ڈائپر سے دل خراب نہیں ہوتا تو وہ پیار سے جواب دیتے۔

"تیرا پتر اے نا، کیوں دل خراب ہونا اے۔"

"چلو، اب واپس پریکٹیکل لائف میں آ جاؤ، سیاست سے لگاؤ ہے؟ کھیل اور دیگر مشاغل؟"

"میں بہت ہی جنونی قسم کا سیاست سے لگاؤ رکھتی ہوں۔ کھیلوں سے بھی مجھے بہت زیادہ لگاؤ ہے اور اپنے اس شوق کو پورا کرنے کے لیے ایک میچ دیکھنے میں دبئی چلی گئی تھی۔ مجھے کرکٹ بہت پسند ہے۔ مجھے کوکنگ سے بالکل بھی لگاؤ نہیں ہے۔ کچن میں جانا میرے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہوتا ہے۔ مجھے کچن کا کام کرنا پسند ہی نہیں ہے۔ ویسے آپ مجھ سے کپڑے دھلوا لیں۔ صفائی ستھرائی کروا لیں۔ استری کروا لیں، واش روم مجھے نیٹ اینڈ کلین چاہیے ہوتا ہے۔ اگر میڈ واش روم کی صفائی دو بار کرتی ہے تو تیسری بار میں خود کر لیتی ہوں۔ میں صفائی کے معاملے میں اتنی کریزی اور جنونی ہوں کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔

مجھے تو بیڈ پر بچھی ہوئی بیڈشیٹ پر شکن — بھی پسند نہیں ہے۔ صفائی کے معاملے میں مجھے لگتا ہے کہ مجھے کوئی سائیکو پرابلم ہے۔ اگر میں سفر کروں تو واش روم استعمال نہیں کر سکتی چاہے وہ کتنا ہی صاف ستھرا کیوں نہ ہو۔ میں اس خوف سے کسی سفر پر نہیں جاتی کہ مجھے کسی کے گھر کا واش روم نہ استعمال کرنا پڑ جائے۔ اور میں گھر آ کر اپنا ہی واش روم استعمال کروں۔"

"ڈرامے دیکھتی ہیں؟ فیشن سے لگاؤ ہے؟"

"فیشن سے لگاؤ ہے مجھے اور میں ہر طرح کا فیشن کر لیتی ہوں، ڈرامہ دیکھنا مجھے بالکل بھی پسند نہیں ہے۔ لیکن کبھی سال چھ ماہ میں جوش آ جائے ڈرامہ دیکھنے کا تو صائمہ اکرم چوہدری آپی کا ڈرامہ ضرور دیکھتی ہوں۔ مصباح نوشین میری دوست ہیں، ان کا ڈرامہ ضرور دیکھتی ہوں۔ میں بہت حساس طبیعت کی ہوں۔ گلا جلدی خراب ہو جاتا ہے۔ ٹھنڈا گرم زیادہ برداشت نہیں کر سکتی۔ آؤٹنگ اور ٹریولنگ کا شوق ہے۔ انٹرنیشنل ٹریولنگ کا زیادہ شوق ہے، دوبار میں دبئی جا چکی ہوں اور ساری ریاستیں میں نے دیکھی ہیں دبئی کی، بہت جلد ان شاءاللہ ایران اور عراق بھی جاؤں گی۔"

"کھانے پینے کی شوقین ہو؟"

"ہاں شوق تو ہے مگر کھانا میں صرف زندہ رہنے کے لیے کھاتی ہوں۔ ہاں میری بیٹی کھانے پینے کی بہت شوقین ہے۔ چکن سے بنی ہر ڈش اسے پسند ہے۔ بس سالن پسند نہیں ہے (شوربہ) ہوٹلنگ کا بھی شوق ہے۔ فاسٹ فوڈ اچھا لگتا ہے مگر کبھی

pklibrary.com

کبھار۔ اور بہت ہی سادہ مزاج ہوں۔ اچار ہو، چٹنی ہو دودھ ہو یا کچھ بھی ہو میں ہر چیز کے ساتھ روٹی کھالیتی ہوں۔

آپ کو بتاؤں کہ میں مستقل مزاج بھی نہیں ہوں۔ بہت جلد میرا دل بھر جاتا ہے۔ ابو کی زندگی میں ایک اسکول بنایا تھا۔ میں نے اور بہت اچھے طریقے سے اسے چلایا بھی۔ چونکہ یکسانیت سے گھبراجاتی ہوں تو پھر اسے مستقل مزاجی سے نہیں چلاسکی۔"

"اپنے آپ پر فخر ہوتا ہے؟"

"ہاں جی...... بہت اور مجھے زیادہ فخر "گوگل" میں اپنا نام دیکھ کر ہوتا ہے۔ اور جب کسی سے کوئی ایسی ویسی بات ہورہی ہوتی ہے تو میں کہتی ہوں کہ "گوگل" آپ کو تو سرچ نہیں کرتا، گوگل مجھے سرچ کرتا ہے تو الحمدللہ مجھے اپنے آپ پر بہت فخر ہوتا ہے۔ اور گوگل پر میری بہت ساری تحریریں اور میرے بارے میں تفصیلات میری کتابوں کے بارے میں سب معلومات آپ کو مل جائیں گی۔ اللہ نے جو مجھے نام دیا ہے اس کے لیے بہت شکر گزار ہوں اگر ایک طرف گھریلو لائف میں ناکامی سے دوچار ہوئی ہوں تو اپنی تحریروں کے ذریعے سے میں نے بہت سی کامیابیاں بھی حاصل کی ہیں۔ اللہ نے مجھے بہت پیاری اور ذہین بیٹی سے بھی نوازا ہوا ہے۔ میں اسے دیکھ دیکھ کے اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں۔ میں نے ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کیا ہے۔"

"کوئی بات جس پر افسوس ہوتا ہے؟"

"زندگی میں بڑوں سے بھی اور چھوٹوں سے بھی غلط فیصلے ہو جاتے ہیں۔ مجھے اپنے ابو سے ہمیشہ یہی شکایت تھی کہ انہوں نے میری زندگی کا فیصلہ صحیح نہیں کیا اور میں نے ہر وقت ان کو یہ احساس دلایا کہ آپ نے میری زندگی کا غلط فیصلہ کیا تھا۔ اب مجھے افسوس ہوتا ہے ان کے جانے کے بعد کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ کیونکہ ثاقب (شوہر) تو میرے حق میں بہت اچھے تھے۔

جب ہماری بیٹی ہوئی تو میرے لیے بلڈ کی ضرورت تھی میری ساس نے کہا کہ میرا بیٹا تو اپنا بلڈ نہیں دے گا کیونکہ وہ ہارٹ پیشنٹ ہے۔ میرے ابو سے ثاقب نے کہا کہ میرا بلڈ گروپ میچ کررہا ہے اور مجھے گوارا نہیں کہ میری بیوی کو کسی اور کا خون لگے میں اندر خون دے آیا ہوں۔ بس آپ میری امی کو نہیں بتایئے گا۔ اس حد تک وہ اچھے تھے۔

مجھے اللہ تعالیٰ نے بہت مضبوط اعصاب دیے ہیں۔ مجھے ابو پر افسوس رہا مگر اس غلط فیصلے سے میں نے سیکھا زندگی کو آگے لے کر چلی اللہ نے کامیابیوں سے ہمکنار کیا۔

آپ پوچھ رہی ہیں کہ فخر کا کوئی لمحہ تو میں اپنی بیٹی کا ذکر ضرور کروں گی کہ جس نے 25 جولائی 2022 کو پورے سال اور پانچ ماہ کی قلیل مدت میں اپنی پوری کلاس میں اور ان تمام بچیوں میں جو اس سے آگے تھیں سب سے پہلے "قرآن پاک" حفظ کیا۔ الحمدللہ، الحمدللہ یہ بڑے نصیب کے ہیں فیصلے یہ بڑے نصیب کی بات ہے۔ جب کلاس میں حافظ

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے خوب صورت ناولز

زرد موسم	راحت جبیں	1000/-
حساب دل رہنے دو	نبیلہ عزیز	400/-
محبت من محرم	نمیرا احمید	400/-
ایک تھی مثال	رخسانہ نگار عدنان	500/-

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار، کراچی

pklibrary.com

ضحیٰ سید کی گونج ہوتی تو میری روح ہواؤں میں پرواز کرتی تھی۔

"اور چلتے چلتے کچھ کہنا چاہو گی؟"

"جی...... میں آپ کو ایک دلچسپ واقعہ سنانا چاہوں گی۔ بہت زیادہ ٹائم نہیں ہوا۔ میں اپنے بھتیجے اور بھتیجی کے اسکول میں انہیں لنچ دینے گئی تو وہاں پرنسپل کی ایک بہن بیٹھی ہوئی تھیں۔ اور پرنسپل میری دوست تھیں تو میں اس دن عبایا پہن کر گئی تھی۔ جب میں وہاں گئی تو پرنسپل نے اپنی بہن سے کہا کہ یہ لکھتی ہیں۔ بس انہوں نے اتنا ہی کہا۔ تو وہ کہنے لگیں کہ "ہاں جی یہاں ایک بشریٰ گوندل بھی ہوتی ہیں۔ وہ ہماری رشتے دار ہیں وہ بھی رائٹر ہیں اور یہاں ایک اور رائٹر بھی ہیں۔ "نایاب جیلانی" وہ یہاں آس پاس کے دیہات میں ہوتی ہیں۔

وہ "ایجوکیٹر اسکول" میں پڑھاتی تھیں اور یہ 2018 یا شاید 2019 کی بات ہے۔ میں بچے کے طفلے بہانے گئی کہ نایاب جیلانی کو دیکھ سکوں کہ وہ لکھتی بہت اچھا ہیں اور بہت میچور لکھتی ہیں تو میں وہاں گئی تو میں نے دیکھا کہ وہ بہ حیثیت ایڈمنسٹریٹر کے کام کر رہی تھیں۔ میں نے جب کہا کہ مجھے نایاب جیلانی سے ملنا ہے تو وہ آ گئیں اور میں ان کو دیکھ کر شاکڈ ہو گئی۔ کیونکہ میرے ذہن میں تو کچھ اور ہی امیج تھا۔ میں نے تو سوچا ہوا تھا کہ کوئی 50، 60 سال کی خاتون ہوں گی۔ آنکھوں پر گلاسز ہوں گے مگر وہاں تو بھورے کٹے ہوئے بالوں والی لڑکی تھی۔ جس نے جینز پہنی ہوئی تھی اور چھوٹا سا کرتا پہنا ہوا تھا وہ تو ایک لاابالی سی لڑکی تھی۔ اسے دیکھ کر تو میرا امیج ہی خراب ہو گیا۔ بہت مایوسی ہوئی تھی مجھے "نایاب جیلانی" کو دیکھ کر۔

لکھتی تو یہ اتنا اچھا ہے مگر ہمارے دیہات کے ماحول میں تو بالکل میں ان فٹ ہے۔ یہ بھلا بچوں کو کیا پڑھاتی ہوگی۔ کیا اخلاقیات سکھاتی ہوگی کہ اس کی تو اپنی ڈریسنگ اتنی خراب ہے۔

جب میں نے ان کی باتیں سنیں تو میں سوچ میں پڑ گئی کہ ان کو کیا بتاؤں کہ میں وہی ہوں جو انہوں نے ایجوکیٹر میں دیکھی تھی۔ اچھا مزے کی بات کہ ان کی بہن ان کو اشارے کر رہی تھی کہ یہ تم کیا بولے جا رہی ہو تو وہ ان کی طرف دیکھ ہی نہیں رہی تھی۔ ان کی بہن کو مجبوراً ان کی بات کاٹ کر بتانا پڑا کہ "یہ نایاب جیلانی" ہیں۔ وہ ایک دم اچھل کر کھڑی ہو گئی کہ اسے بہت بڑا جھٹکا سا لگا تھا۔ اور بولی۔

"آپ نایاب ہیں؟"

میں نے کہا جی۔

وہ اتنی شرمندہ ہوئی کہ بتا نہیں سکتی۔ بولی۔

"آپ کو بہت برا لگا ہوگا" میں نے کہا کہ مجھے بالکل بھی برا نہیں لگا آپ نے جو کچھ کہا اپنی سادگی میں کہا اور مجھے بہت اچھا لگا ہے۔ آپ کی رائے سے میں بالکل بھی اختلاف نہیں کروں گی کیونکہ میں ان دنوں میں شاید ایسی ہی تھی اور میں اب بھی ویسی ہی ہوں کیونکہ میں نے عبایا پہنا ہوا ہے لیکن اندر میں نے جینز ہی پہنی ہوئی ہے۔ میں نے انہیں کہا کہ میں ماحول کے مطابق ڈریسنگ کرتی ہوں اور یہ مت سوچیں کہ بندہ دیہات میں تو جینز نہیں پہن سکتا۔ انسان ہر طرح کی ڈریسنگ کر سکتا ہے۔ اور اسے پتا ہوتا ہے کہ اسے کہاں کیسی ڈریسنگ کرنی ہے۔

تو مجھے بڑا اچھا لگتا ہے کہ جب میں کہیں جاتی ہوں تو خواتین، لڑکیاں میرے ساتھ سیلفی بنواتی ہیں۔ مجھے اپنے آپ پر بہت فخر ہوتا ہے اور میں اپنے رب کا بہت شکر ادا کرتی ہوں۔

اس کے ساتھ ہی ہم نے "نایاب جیلانی" صاحبہ سے اجازت چاہی اور شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے انٹرویو دیا۔

☆☆

pklibrary.com

خط بھجوانے کے لیے پتا۔
خواتین ڈائجسٹ۔ 37۔اردو بازار کراچی۔
Email:Info@khawateendigest.com

نخوت حق......ٹنڈو آدم

آپی! اس ماہ رسالہ 15 ستمبر کو ہم تک پہنچا شاید بارشوں اور سیلاب کے پانی کی وجہ سے تھوڑا لیٹ ہوا۔ سیلاب کے پانی کی وجہ سے ہائی وے کا روڈ ابھی بھی بلاک ہے، ریلوے لائن بھی بلاک ہے۔ اس صورت حال کو دیکھ کر ہم نے یہ سمجھ لیا تھا اس ماہ رسالوں کی چھٹی ہے۔ پرچہ اگلے ماہ ہی ملے گا لیکن یہ محبت کا رشتہ ہے جناب یہاں چھٹی نہیں ہوئی ہاہاہا۔

پچھلے ماہ ہمارا خط مختصر تھا اس کی وجہ تھی۔ کثرت بارش، سیلابی پانی کی وجہ سے ہمارے شہر کے آس پاس گاؤں کی حالت تباہ کن تھی۔ وہاں ہمارے کچھ رشتے دار بھی رہتے تھے۔ جواب ہمارے پاس مہمان ہیں تو ہمارا سارا وقت اُن کی خدمت اور دل جوئی میں گزرا، ان کے لیے تکلیف دہ وقت تھا ان کے گھر ٹوٹ گئے جو گارے مٹی کے بنے تھے اور جن کے پکے گھر ہیں۔ ان میں ابھی بھی کچھ پانی کھڑا ہے، خیر اب کچھ لوگ رینٹ پر گھر لے کر وہاں شفٹ ہو گئے۔

اب اس ماہ کے رسالے کی کچھ بات کرلیں سب سے پہلے اس ماہ کی ماڈل کا نیچرل میک اپ اور سوٹ کا کلر بہت پیارا لگا۔ کرن کرن روشنی سے دل کو پرنور کیا اور گھر میں باقی لوگوں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیا۔ ہمارے نام میں گوشی بہن کو پڑھ کر اچھا لگتا ہے۔ بہن آپ ہمت اور حوصلے سے لگی رہیں۔ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

نایاب جیلانی صاحبہ سے ملاقات اچھی رہی جہاں سنیعہ عمیر صاحبہ کا ''وبال یادیں'' پڑھ کر مزہ آیا وہیں تھوڑی اداسی بھی ہوئی۔ شازیہ الطاف ہاشمی صاحبہ کی کہانی فرق بہترین کہانی تھی اور حمیرا عروش صاحبہ ''خلش'' پڑھا کر بہت کچھ یاد دلا دیا۔ اس ماہ ''مشک بام'' کو نہ پا کر بالکل اچھا نہیں لگا۔ باقی سلسلے ابھی نہیں پڑھے لیکن امید ہے ہمیشہ کی طرح سب ایک سے بڑھ کر ایک ہوں گے قابل تعریف ہمارے ان رسالوں میں لکھنے والی تحریروں کا معیار ہی تو ہے جو ہم آج بھی ان سے جڑے ہوئے ہیں۔

ج۔ پیاری نخوت! سیلاب سے جو تباہی ہوئی ہے۔ اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ مہنگائی پہلے ہی کم نہ تھی سیلاب نے رہی سہی کسر بھی پوری کردی۔ یہ قدرتی آفت ہے لیکن اس تباہی میں ہماری کوتاہیوں اور غلطیوں کا بھی دخل ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم پر رحم فرمائے۔ آمین۔

یہ جان کر بہت اچھا لگا کہ مصیبت کی اس گھڑی میں آپ نے اپنے لوگوں کا ساتھ دیا، ان کا درد بانٹا۔ وقت تو اچھا یا برا گزر ہی جاتا ہے لیکن یہ اچھائیاں یاد رہ جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم کو آئندہ ایسی آزمائشوں سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

صائمہ احمد............لاہور

ہر ماہ سوچتی تھی کہ خط لکھوں اور آپ کو اپنی محبت اور لگاؤ جو اس رسالہ سے ہے، وہ بتاؤں لیکن ہر بار سستی چھا جاتی تھی۔ لیکن اس بار ہمت کر کے قلم اٹھا ہی لیا۔

خواتین ڈائجسٹ سے رشتہ تو کافی پرانا ہے پہلا رسالہ 1988ء میں اپنی خالہ کے گھر پڑھا تھا۔ وہ خود خواتین ڈائجسٹ اور دیگر رسالے بہت شوق سے پڑھتی تھیں۔ اس

کے بعد سے لے کر اب تک اس پرچہ سے ناتا نہیں ٹوٹا۔ شادی ہوگئی۔ امریکہ چلی گئی۔ وہاں بھی ایک انڈین اسٹور تھا وہاں سے رسالہ خریدتی تھی۔ میرے شوق کو دیکھتے ہوئے شوہر نامدار نے بھی کبھی منع نہیں کیا۔ سترہ سال امریکہ رہنے کے بعد پاکستان واپس آگئی تو رسالوں کا سارا اسٹاک دوستوں میں بانٹ آئی۔ بہرحال بہت لمبی کہانی ہے میرے اور خواتین ڈائجسٹ کے تعلق کی۔

اپنی مصروفیات کی بنا پر سارا تو نہیں پڑھتی لیکن آج کل مالا اور دانہ پانی کی وجہ سے ہر ماہ شدت سے انتظار رہتا ہے۔ ناول مالا کی کیا تعریف کروں۔ اللہ آپ کو جزائے خیر دے، نمرہ احمد کو یہ ناول پڑھ کر اب میں صبح و شام کی مسنون دعاؤں اور اذکار میں باقاعدگی کرتی ہوں پہلے بھول چوک ہوجاتی تھی۔ بے شک مسنون اذکار ہمارے لیے ایک زرہ کا کام کرتے ہیں۔

عمیرہ احمد کا ناول دانہ پانی اچھا جارہا ہے۔ مگر مجھے اس میں عمیرہ احمد کی وہ جھلک نہیں نظر آرہی جو پہلے ناولوں میں آتی تھی۔ شاید میں ہی ایسا محسوس کررہی ہوں۔ بہرحال ان تیس پینتیس سالوں میں کچھ لکھاری ایسے دل کے قریب ہیں کہ ان سے علیحدہ ہونا ناممکن اور ان کو پڑھنا دل کا سکون۔

آپ سے درخواست ہے کہ اپنے ڈائجسٹ میں ایک کالم معاشرتی، مسائل اور ان کے حل پر بھی ہونا چاہیے۔ آپ کے قاری پورے پاکستان میں ہیں تو شاید اس طرح کچھ مدد ہوجائے۔ میں آپ کی توجہ پرائیویٹ اسکولوں میں بڑھتے ہوئے رجحان پر ڈالنا چاہتی ہوں۔ خدارا اس پر کچھ لکھیں، بچیوں میں آگاہی آئے اور ہمارا معاشرہ اس عمل سے بچ جائے۔ آمین۔

ج۔ پیاری صائمہ! آپ نے بہت اچھا کیا کہ خط لکھا اور اپنے لگاؤ اور محبت سے ہمیں آگاہ کیا۔ پرچے کی پسندیدگی جان کر ہماری ہمت اور حوصلہ میں اضافہ ہوجاتا ہے ہم اس کو مزید بہتر بنانے کی کوشش کرتے۔ تہہ دل سے شکریہ۔

آپ نے جس مسئلہ کی طرف توجہ دلائی وہ بہت اہم ہے۔ ہم آپ کی تجویز پر غور کریں گے۔ دراصل ہمارا پرچا کم عمر بچیاں بھی پڑھتی ہیں۔ اس لیے بہت کھل کر اس بارے میں نہیں لکھا جاسکتا۔ براہ راست تبلیغ کے بجائے ہم جو تحریریں شائع کرتے ہیں، ان میں مذہب اور معاشرتی اقدار پر عمل کی ترغیب ہوتی ہے۔ جو زیادہ موثر ہوتی ہے۔

گوشی جمال.........منڈری یزمان

19 ستمبر بروز سوموار آج شمارہ موصول ہوا۔ صورت حال سیلاب کی وجہ سے خاصی گمبھیر لگ رہی ہے شعاع کی آمد بھی تاخیر سے ہوئی۔ اخبار فروش امداد بھائی کی پیلی پان زدہ بتیسی کے متعدد بار درشن کیے۔ بھائی نے کئی بار پتا کیا۔ زیادہ کہنے پر زچ آجاتا ہے۔ اس لیے خود ہی خوار ہونا پڑا۔ تیسری بار دکان کا سودا سلف لینے کے بعد خواتین کا پتا کیا تو آگے سے اتنے دھڑلے سے اس نے میرا نمبر مانگ لیا کہ آپ کو اطلاع بذریعہ فون دوں گا۔ مجبوراً دکان والا آفیشل نمبر دے ڈالا اور ساتھ بول دیا۔ ہن پورے شہر نوں نہ نمبر دے دیویں۔ نہ مسڈ کالاں ماردا رہویں۔

آج 19 ستمبر کو فون کھڑکا اور خوشی کی نوید سنادی۔ خواتین آگیا۔ میں نے دکان پہ بیٹھے ہرا کا نعرہ لگادیا۔ شہر سے بسکٹ والے سیل مین نے آج آرڈر لینے آنا تھا۔ میں نے اسے فون کھڑکا دیا کہ میرا کام تو کرتے آنا اور دکان کا ایڈریس بھیج دیا۔ ایک گھنٹہ میں پنک ٹائٹل پر عالیہ خان دلفریب مسکان سجائے میرے ہاتھوں میں اور ساری کوفت جو صبح سے طاری تھی۔ اڑن چھو ہوگئی۔ بہت ساری بہنوں کو میرے خط کا انتظار ہوتا ہے، سراہتی ہیں ان سب کا تہہ دل سے شکریہ، مہک فاطمہ آپ کا سلام سرآنکھوں پہ۔ صفیہ مہر، ناہید اسماعیل اور صدف ناصر آپ کی محبتوں کا شکریہ۔ شگفتہ یاسمین سے کھڑے کھڑے باتیں کیں ایک بات بہت دل کو لگی۔ "بچپن میں پیار نہیں اٹریکشن ہوتی ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ ختم ہوجاتی ہے لیکن، شگفتہ صاحبہ کبھی کبھی معاملہ پتھر پہ لکیر والا بھی بن جاتا ہے۔

چلو بھئی بڑھتے ہیں شمارے میں آگے۔ نایاب جیلانی کیوٹ اور گریٹ پرسنالٹی۔ حالانکہ تصویر ندارد ہے۔ لیکن ہمارا آئیڈیا ہے ان کی باتوں اور تحاریر سے۔ "دانہ پانی" اسی کے کارن تو ہم بے چین تھے "متاع زیست تھے جو خواب" نام سے لگ رہا بہت اچھا ناولٹ ہوگا فرصت میں پڑھیں گے، کوئی جلدی نہیں ہے۔

pklibrary.com

عدنان بھائی سے ایک مشورہ کرنا ہے لیکن ابھی ٹائم نہیں بن پا رہا۔ بڑی گمبھیر تا بچویشن ہے۔ خیر پھر سہی۔ اے کم تو ریا جاندا۔

ج۔ پیاری گوشی...... آپ نے دکان داری کے دوران جس طرح پرچا پڑھا۔ اس کی داد دیتے ہیں، داد تو آپ کی ہمت کی بھی دیتے ہیں۔ دکان چلانا آسان کام تو نہیں ہے۔

گوشی اللہ تعالیٰ آپ کو کامیابی دے۔ آمین۔ امی کو سلام کہیے گا۔ اب ان کی طبیعت کیسی ہے؟ اس بار خط میں آپاؤں کا ذکر نہیں۔ ان کی کمی محسوس ہوئی۔

مناہل بٹ............ گوجرانوالہ کھیالی بائی پاس

پورے تین ماہ بعد خط لکھ رہی ہوں مگر آپ کو کہاں محسوس ہوتی ہے اپنی قاری بہنوں کی کمی۔ ''نمرہ احمد'' وہ خاص نام جن کے ناول ''مالا'' نے پورے خواتین کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ مگر گلہ پرچے کے صفحات بہت کم کر دیے گئے ہیں اور اس ماہ تو ٹائٹل والا صفحہ بھی کسی کام کا نہ تھا اور ٹائٹل پسند بھی نہ آیا مجھے تو۔

''ساری کہانی خوب صورت'' اصل نے ثمینہ عظمت علی سے ملوایا اور نیر فہم خان سے نیر۔ آپ نے شمارے کی جو تعریف کی، ہم دل سے اس کے قائل ہیں اور آپ کی طرح میں بھی اپنی بیٹی کو یہ رسالے وراثت میں تحفے کے طور پر دوں گی۔ اگر کہیں تربیت میں کوئی کمی رہے گی تو وہ یہ رسالے پوری کر دیں گے اس کی۔ ''نایاب جیلانی'' کا انٹرویو دل کو بہت بھایا۔ ان کے شوہر اتنے کیئرنگ تھے مگر یہ ان کو سمجھ نہ پائیں ایک بات میر ے اندر بھی ہے میرے شوہر بھی بالکل ان کے شوہر کی طرح کیئرنگ ہیں دوسروں کے سامنے میری تعریفوں کے انبار لگا دینا میری خوبیاں گن گن کے بتانا۔ مگر پتا نہیں کبھی کبھی یہ سب مجھے بھی چڑ چڑا کر دیتا ہے، میں بھی چڑ جاتی ہوں ان کی زیادہ کیئرنگ والی عادت سے۔ عدنان بھائی کے مفید مشورے پڑھ کر اچھا لگا۔ فرحین ناصر آپ کا کوئی حال نہیں ہے، غیر مرد کو فوراً گھر سے نکال دیں۔

موسم کے پکوان میں برگر کا طریقہ اچھا لگا۔ ٹرائی کروں گی۔ خط ہمارے میں صدف ناصر نے سلام بھیجا۔

عمیرہ احمد کا دانہ پانی کہانی عجیب موڑ پر آ گئی ہے مجھے تو لگتا ہے مراد سب بھول کر گھوڑا وہیں روک دے۔ گا اور موتیا سے شادی کر کے لے جائے گا۔

افسانے کچھ کچھ پڑھے ہیں، جن میں ''من مست مگن''، ''رشتے کی ڈور'' وبال یاد ہیں بس تینوں نارمل ہی لگے۔ اصل سے ایک خاص بات کرنی ہے میں نے اکثر رائٹر کے انٹرویو میں دیکھا اور پڑھا کہ ہم نے افسانہ لکھا فوراً چھپ گیا۔ میرے ساتھ ناانصافی کیوں کی جا رہی ہے۔ میرے بار بار کہنے پر بھی یہ ناانصافیاں کیوں میرے ساتھ ہو رہی ہیں جبکہ میری زندگی میں لکھنا اور پڑھنا ہی ایک بڑی خوشی ہے۔

ج۔ پیاری مناہل! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کے پچھلے تین خط شامل نہ ہو سکے۔ ایسا نہیں ہے کہ ہم آپ کو بھول گئے یا آپ کو نظر انداز کیا۔ صرف ایک ہی مسئلہ ہے۔ محدود صفحات جس کی بنا پر بہت سے خط شامل نہیں ہو پاتے۔ پچھلے ماہ بھی آپ کا خط منتخب کیا تھا جو طوالت کی بنا پر شامل نہ ہو سکا۔ اصل آپ کی کہانیاں جلد پڑھ کر بتائیں گی کہ قابل اشاعت ہیں یا نہیں۔

ناہید اسماعیل............ کراچی

ستمبر کا شمارہ خوب صورت ٹائٹل کے ساتھ ہمارے سامنے ہے۔ حسب معمول کہنی سنی پہلی ترجیح بنی، سیلاب کی وجہ سے ملک کے جو حالات ہیں ان پر بہت دکھ ہے دل چاہتا ہے پلک جھپکتے مسائل حل ہو جائیں۔ کرن کرن روشنی بے شک تاریک رستوں کو روشن کر دینے والا سلسلہ ہے۔

''دانہ پانی'' کی پچھلی قسط کافی سنسنی خیز موڑ پر ختم ہوئی تھی سو اس بار آغاز اسی سے کیا، آخر کار تاجور اپنے مقصد میں کامیاب ہو ہی گئی اور بتول کو کیا کہیں، اب جو بارات چل نکلی ہے وہ موتیا کے در پر ٹھہرتی ہے یا......؟ کیونکہ وہاں بھی گھوڑے کی باگیں مراد کے اختیار میں نہیں۔ کہیں عمیرہ احمد اس ناول کا انجام المیہ تو نہیں کرنے لگیں۔ بھئی ایسا نہ کیجیے گا۔

ویسے تو وقت کو پر لگے ہوئے ہیں لیکن ''مالا'' کے انتظار میں تو لگتا ہے مہینہ گزارے نہیں گزرتا۔ ''مشک بام'' اس ماہ شامل نہیں۔ سمیرا احمید تو ان رائٹرز میں سے ہیں جو

pklibrary.com

قسط کا ناغہ کبھی نہیں کرتیں۔ وہ خیریت سے تو ہیں ناں؟ فرزانہ کھرل نے بھی کافی لمبا گیپ دے دیا۔

ناولٹ کی لسٹ میں ایک ہی نام تھا اور جناب وہ نام دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ ہماری بہن صاحبہ تو خوشی سے اتنی نہال تھیں کہ شام کو ہماری گھر واپسی پر پہلی بات ہی یہ کی کہ بشریٰ احمد کا ناول آیا ہے۔ پچھلے ماہ شازیہ جمال طارق کی تحریر کے بارے میں ہم نے لکھا تھا کہ متاثر کن ہونے کے باوجود بے سکون سا کر گئی اور اس بار ان کے مکمل ناول کے اختتام نے خاصی تسکین کا سامان کر ڈالا۔ نعیمہ ناز کا ناول بہترین رہا۔ لاکھوں مسلمانوں کے خون سے لکھی گئی پاک وطن کی تاریخ، ہجر اور ہجرت کا دکھ جو نعیمہ ناز کے زیر قلم آیا تو بے اختیار آنکھیں نم کر گیا۔

آسیہ رئیس کا افسانہ بہت اچھا لگا۔ "وبال یادیں" افسردہ کر گئیں۔ جویریہ اور عباد کہانی سے زیادہ امی کی بیماری نے دکھی کیا، یہ اچھا ہوا کہ جویریہ نے عقل مندانہ فیصلہ کر کے غلطی سدھار لی۔ سنیعہ عمیر پلیز اتنا گیپ نہ دیا کریں ہم آپ کی تحریروں کا انتظار کرتے ہیں۔

"فرق" مختصر اور اچھی تحریر تھی، شازیہ الطاف کی تحریریں حقیقی ہوتی ہیں اور حقیقت اکثر مایوس اور اداس کرتی ہے۔ ان سے درخواست ہے کہ خوش گوار اختتام کے ساتھ طویل کہانی لکھیں۔

زرقا سکندر آپ بہت اچھا لکھتی ہیں، پلیز آپ بھی اب مختصر سے طویل پر آ جائیں۔ من مست مگن میں حیا کے ساتھ تو اچھا ہی ہو گیا۔ حمیرا عروش کا افسانہ اچھا پر دکھی کر گیا۔ ایک ذرا سا احساس جیسی تحریریں پڑھ کر سکون ملتا ہے ٹھیک ہی تو ہے کہ محبت اور احساس دو طرفہ ہو تو دل اور گھر دونوں سکون کا گہوارہ بن جاتے ہیں۔

"ساری کہانی خوب صورت ہے۔" میں دونوں رائٹرز کے جوابات اچھے لگے ہماری اتنی اچھی اچھی رائٹرز نے لکھنا چھوڑ کر قارئین کے ساتھ زیادتی کی ہے چلیں کوئی بات نہیں۔ نیر فہیم خان بھی کبھار کسی سروے میں نظر آتی ہیں، ایک بات بتاؤں وہ جب اپنی نانی کے گھر کا ذکر کرتی ہیں تو ہمیں وہ ماحول کھینچنے لگتا ہے، ہمیں بھی بچپن کے سنہرے دن اور نانی کا پھل دار درختوں سے گھرا آنگن یاد آتا ہے۔

شگفتہ یاسمین کی باتیں ٹھیک اور نایاب جیلانی سے ملاقات بہت اچھی لگی، ان کی زندگی کے کرائسس بھی دل دکھانے والے ہیں۔ نگہت فرمان نے سیلابی صورت حال پر لکھا، حقیقت میں اس تباہی نے خون کے آنسو رلا دیا ہے۔

بہنوں کی محفل میں انعم وجاہت، فرحت بنت اکرم، صفیہ مہر کے خطوط اور تبصرے اچھے لگے۔ صدف ناصر تو جناب لاجواب تبصرہ کرتی ہیں اور صدف شکریہ کی کیا بات ہے، ہر اچھی شے بے اختیار تعریف کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ موسم کے پکوان میں کھجور اور کھویا حلوہ لذیذ لگا۔ باورچی خانہ میں ام ربانی خود کو اناڑی کہہ گئیں لیکن ہمیں تو وہ اچھی سگھڑ لگیں۔ ڈائری طوبیٰ رضا کی پسند آئی۔ ہمارا انتخاب شامل کرنے کا بہت شکریہ۔ رنگا رنگ پھول تمام کا تمام ہی اچھا ہوتا ہے۔ عمیر عجمی کی غزل بھی زبردست تھی۔ تیسرا اور چوتھا شعر تو دل میں اتر گیا۔ نفسیاتی الجھنیں میں فرحین ناصر کے خط لکھنے پر اندازہ ہوا کہ وہ باقاعدگی سے ڈائجسٹ کا مطالعہ کرتی ہیں اور جیسے ان کے حالات ہیں، بے شمار کہانیاں اس موضوع پر لکھی جا چکی ہیں حیرت ہے انہوں نے ان سے کوئی سبق نہیں لیا جو وہ ایسی نادانی کر رہی ہیں حتیٰ کہ گناہ ثواب کا بھی نہیں سوچ رہیں۔

ج۔ پیاری ناہید! اپنے طور پر تو ہم کوشش کرتے ہی ہیں کہ پرچے کو خوب سے خوب تر بنا کر پیش کریں، لیکن آپ جیسی قارئین جب ہمیں پسندیدگی کی سند سے نوازتی ہیں تو بہت اطمینان محسوس ہوتا ہے۔ آپ کی رائے ہمارے لیے بہت قیمتی ہے۔ تفصیلی اور جامع تبصرے کے لیے بہت شکریہ۔

صدف عمر............نامعلوم شہر

لفظوں سے شناسائی کا سفر بتدریج شروع ہوا، خوش رنگ تتلیوں کے پیچھے بھاگتے بھاگتے کب کتابوں سے دوستی مضبوط ہوتی چلی گئی، پتا ہی نہیں چلا۔ ادارے سے منسلک ہونے کا خواب بہت پرانا۔ آج بھی یہ میری اولین چاہت ہے۔ میری محبت کا عالم یہ تھا کہ جن رسالوں کے سرورق پھٹے ہوتے یا سرے سے نہ ہوتے تو انہیں میں کور چڑھا کر رکھتی تا کہ خراب نہ ہوں۔ میری دیوانگی پر لطیفے بنائے گئے، فرمایا جاتا۔

''اس کے مرنے پر ایصال ثواب کے لیے ایک ایک شمارہ پڑھ لیا کریں گے۔''
نہیں بھئی۔ سلسلے وار ناول ٹھیک رہے گا۔''
''قسطیں، ڈھیر ساری قسطیں کون پڑھ پائے گا۔''
''خیر خیر۔ مرحومہ کے لیے اتنا تردد تو کرلیں گے۔''
''فاتحہ کے بعد شمارے بانٹے جائیں گے کہ پڑھیے اور مرحومہ کے لیے دعائے مغفرت کیجیے۔''
مگر ہم بھی اسی محبت و استقلال سے سب سنتے نظر انداز کیے اپنے عشق میں مصروف رہے۔ جس شمارے نے مجھے جینے کا ڈھنگ سکھایا۔ میرا دوست بنا، اسے کیسے میں لوگوں کی باتوں میں آ کر چھوڑ دیتی...... خیر ''اس محبت'' میں بہت صدمے بھی اٹھائے، والد صاحب کو رات گئے تک جاگنا پسند نہیں تھا۔ سوگرمیوں میں ان کے سونے کے بعد باہر برآمدے میں چھپ کر پڑھتی اور سردیوں میں رضائی کے اندر ٹارچ کی روشنی میں یہ فریضہ سرانجام دیا جاتا۔ وہ وقت بھی کیا حسین تھا۔
کئی بار دل چاہا، لکھوں مگر سستی کبھی یار بیکشن کارڈ، ہر بار رک جاتی۔ اب ایک ناول بھیجا ہے۔ آپ کی رائے کی منتظر ہوں۔
ج۔ پیاری صدف! چھ فل اسکیپ صفحات پر مشتمل آپ کا خط پڑھ کر بہت لطف آیا۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ اس پر افسانہ لکھ لیتیں کیونکہ اتنا طویل خط شائع کرنا مشکل ہوتا ہے۔
آپ کا ناول مل گیا ہے۔ ان شاء اللہ نومبر کے شمارے میں شامل ہوگا۔
ہمیں یاد نہیں کہ اس سے پہلے آپ کی کوئی تحریر ہمیں ملی ہو۔
شب نور مغل، نوشی مغل...... نامعلوم شہر
میرا خواتین میں یہ پہلا خط ہے مجھے چھ ماہ ہو گئے خواتین کو پڑھتے ہوئے۔ آج بھی نہ لکھتی شاید جو اگر عمیرہ احمد آپی کے ناول نے مجھے مجبور نہ کیا ہوتا۔ عمیرہ آپی آپ سے ایک ریکویسٹ ہے (پوری کرنا)۔ موتیا اور مراد کے درمیان غلط فہمی، شک کی دیوار نہ کھڑی کرنا اور بتول اس کا تو وہ حشر کرنا کہ اسے مجھ سے آ کر معافی مانگنی پڑے (ہاہاہا) اگر میری کوئی دوست ایسے کرتی تو میں نے اس سے سزا کے طور پر گھر کے پورے برتن منجھوانے اور کپڑے دھلوانے تھے (سچی)۔ اب بات ہو جائے ٹوئیٹی سوئیٹی سلسلے ''ہمارے نام'' کی ہیلو شہزادیوں، آپیوں، آنٹیوں، شیک ہینڈ کرو گی مجھ سے۔ دو بھائیوں کی اکلوتی اور معصوم بہن، اپنے لیے دوست کم بہن زیادہ کی تلاش میں آئی ہے۔ گوشی جمال تو اڈا تبصرہ پڑھ کے میرا دل گوڈے گوڈے پپی ہو جاندا۔ (صدف، مقدس، طوبیٰ) انصاری بہنوں آپ کا خط تو موسم بہار سے بھی زیادہ اچھا لگتا ہے۔ اگر کسی نے دوستی کو قبول کیا تو اگلے ماہ تفصیلی اور بھرپور تبصرے کے ساتھ آؤں گی۔ (ابھی کوئی کسر ہے؟) آ ہم م م۔ ویسے دوستوں ایک خوش خبری بتاؤں۔ اللہ تعالیٰ نے میرے دونوں بھائیوں کے گھر رحمت (بیٹی) بھیجی۔ مطلب کہ میں پھپھو بن گئی۔ دونوں بھتیجیوں میں ماشاء اللہ پانچ دن کا گیپ ہے۔ بڑی کا نام میں نے انفال اور چھوٹی کا ارحہ رکھا۔
ج۔ آپ کا نام سمجھ میں نہیں آیا۔ خط کی ابتدا میں شب نور مغل ہے اور خط کے اختتام پر آپ نے نوشی مغل نام لکھا ہے۔ پھپھو بننے پر مبارک باد۔ ننھی انفال اور ارحہ کے لیے دعائیں۔
ثریا یاسمین ...... موگلہ تحصیل تلہ گنگ
شعاع اور خواتین سے تعلق کب سے ہے کچھ یاد نہیں۔ مگر اک عمر گزری ہے اس دشت کی سیاحی میں۔ کلاس پنجم سے لے کر آج تک کسی نہ کسی طرح یہ تعلق قائم رکھا۔ پہلے پہل اک کزن ردی میں رسالے لا کر دیتی اور میں اور باجی تسنیم چھپ چھپ کر پڑھتے۔ دسویں کے پیپرز کے بعد اخبار والے سے چوری چوری منگوا لیتی۔ مگر بل دیتے وقت ابا جی ضرور ڈانٹتے۔ ہم نے یہ رسالہ اس وقت سے لینا شروع کیا جب اس کی قیمت 35 روپے تھی۔ شعاع اور خواتین وہ ساتھی ہیں جنہوں نے زندگی کے وہ سبق سکھائے۔ جو کوئی نہ سکھا پایا۔ آج سروس کرتے گیارہ سال ہو گئے۔ خود دو بچوں کی ماں بن گئی مگر یہ تعلق مضبوط سے مضبوط ہوتا جا رہا ہے۔
شادی کے بعد شوہر نے پابندی لگانا چاہی کہ رسالہ ہاتھ میں آتے ہی دنیا بھول جاتی ہو تو ایک سال یہ کارنامہ سرانجام دیا کہ دو تین گھنٹوں میں رسالہ پورا ختم کر لیا۔ جب شوہر صاحب نے دیکھا کہ یہ تو نہیں چھوڑنے والی۔

pklibrary.com

تو خود لا کے دینے لگے۔
گرمیوں کی چھٹیوں میں تلہ گنگ کے چھ چھ چکر بھی ہم نے رسالے کے لیے لگوا دیے تو خوشی سے لگا آئے۔ الحمد اللہ جو کہانی ہمیں پسند آئی جس پہ ہم ہنسے ان کو بھی ہنسایا اور جس پہ خود روتے ان کو بھی رلا دیا۔ ابھی تک ستمبر کا رسالہ ملا نہیں۔ اس لیے اس پر تبصرہ ادھار رہا۔ مگر اپنی پسندیدہ تحریروں کا ذکر ضرور کرنا چاہوں گی۔
''حساب ابھی باقی ہے'' مصنفہ کا نام یاد نہیں مگر اس کہانی نے ہمیں معاف کرنے کا ہنر سکھایا۔ سائرہ رضا کے ''خالی آسمان'' نے ماں کی عظمت اور یقین کا وہ جہاں دکھایا کہ الفاظ نہیں ام طیفور کے ''پیا ملن کی رت'' جہاں قہقہے لگائے وہیں آنسوؤں سے منہ بھی دھویا۔
''جنت کے پتے۔ نمل۔ آب حیات۔ امر بیل۔ حالم۔ یارم۔ رقص بسمل۔ سیاہ حاشیے'' اور آج ''دانہ پانی۔ مالا'' ہر ایک سے کچھ نہ کچھ ضرور سیکھا۔ سب سے بڑھ کر سمیرا حمید کے ''راہ نورد'' کو نہ صرف خود بار بار پڑھا بلکہ پی ڈی ایف میں تمام دوستوں کو زبردستی پڑھوایا ''راہ نورد شوق۔ طواف عشق'' غرض کس کی بات کروں اور کس کی نہ کروں، ہر ماہ ان رسالوں کے نئے چاند ضیا دیتے ہیں۔
میں تو وہ بندی ہوں جو ٹائٹل سے لے کر آخر تک ایک صفحہ دو دو بار پڑھتی ہوں۔ ''کرن کرن روشنی'' ہو یا ''رنگا رنگ پھول'' خطوط ہوں یا ٹوٹکے از بر ہوتے ہیں۔
آخر میں ثمینہ اکرم صاحبہ اور ڈاکٹر فریال کافی دنوں سے غائب ہیں۔
ج: پیاری ثریا! آپ نے خط لکھ کر اپنی طویل خاموشی توڑی بہت اچھا کیا۔ آپ جیسی قارئین بلاشبہ ہمارے لیے بہت قیمتی ہیں۔ آپ کی محبت اور خلوص ہمارا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ اور باعث اطمینان بھی کہ اتنی طویل رفاقت اسی صورت قائم رہ سکتی ہے جب پرچے کا معیار برقرار رہے۔
آپ کی محبتوں اور طویل رفاقت کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

سحر طاہر......ملتان

رسالہ بہت لیٹ ملا، پہلے تو میں اپنے ہاکر کا ویٹ کرتی رہی پھر اپنے ہی کو بھیجا شاپ پر...... پورے شہر میں کہیں نہیں۔ یہ کیا ہوا ویسے تو 4 یا 5 تاریخ تک آ جاتا ہے لیکن اس بار سیلاب کی وجہ سے شاید لیٹ ہو گیا خیر جیسے ہی ملا سب سے پہلے ''ہمارے نام'' پڑھا جس دن رسالہ ملا میں امی کے گھر جا رہی تھی۔ ایک ایک فرد کو اپنا خط دکھایا اور ابو نے تو میرا خط پڑھا بھی، بھائی کہتے کسی اور سحر کا ہوگا خط، ڈاکٹر فریال بہت افسوس ہوا والد کا اللہ جوار رحمت میں جگہ دے۔ میں تمام خطوط پڑھتی ہوں قارئین کے نام تو یاد نہیں، گوشی جمال، سلمی مسرت، ناہید اسمعیل اور ملتان کی تمام قارئین کو میرا اسلام پھر ''مالا'' کھولا اور (ہم بھول گئے کہ بچوں کی اسکول سے واپسی کا ٹائم ہو گیا ہے) ''زبردست'' سوچا بھی نہیں تھا کہ نگینہ بیگم سرکار ہوں گی ہاں البتہ ''زیاد'' تھوڑا مشکوک لگا تھا پر نگینہ...... اگلی قسط کا بے صبری سے انتظار ہے۔ باقی رسالہ پینڈنگ پر ہے کیونکہ لیٹ ملا۔
ج: پیاری سحر! اس بار پرچا لیٹ پہنچا۔ اس کے باوجود آپ نے ہماری محفل میں شرکت کی۔ اس کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

سماء گل......نامعلوم

اس سال خواتین ڈائجسٹ میں بڑے بڑے ناموں کی واپسی ہوئی لیکن فرحت اشتیاق کی کمی محسوس ہو رہی ہے۔ نجانے وہ کیوں نہیں لکھ رہی ہیں؟ چند روز قبل یوٹیوب پر عمیرہ احمد کے ناول امر بیل پر بنے ڈرامے کے چند کلپس دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ دیکھ کر بہت صدمہ پہنچا۔ پہلے تو یقین بھی نہیں آیا کہ یہ امر بیل ہے۔ آپ کے ادارے کے توسط سے میں ان سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ کیا ایسا ممکن نہیں ہے کہ وہ یہ ڈرامہ دوبارہ لکھیں یا اس کی نئے سرے سے پروڈکشن ہو؟ کیونکہ صرف مجھے ہی نہیں جس جس نے بھی یہ ناول پڑھا ہے اور پھر وہ کلپس دیکھے ہیں ان سب کو بہت مایوسی ہوئی ہے۔
جاتے ہوئے ادارے کے لیے لگے ہاتھوں ایک تجویز بھی دیتی جا رہی ہوں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ شمارے میں قابل اشاعت اور ناقابل اشاعت کہانیوں کی فہرست لگایا کریں ایک کونے میں۔ اس طرح آپ کے لیے بھی آسانی ہو جائے گی۔

pklibrary.com

ج: پیاری سما! آپ کا افسانہ ابھی پڑھا نہیں۔ آپ کی تجویز پر غور کریں گے۔

نصرت زاہد......لاہور

ملکی حالات کی وجہ سے رسالہ اس بار دیر سے ملا۔ کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں۔ "دانہ پانی" بہت زبردست جا رہی ہے۔ مراد اور موتیا کی شادی ہوگی یا نہیں۔ یہ جاننے کے لیے اگلی قسط کا ابھی سے انتظار شروع ہوگیا ہے۔ نمرہ احمد یہ کیا سرکار؟ نگینہ بیگم نکلی خیر کہانی زبردست ہے، اگست کے شمارے میں باورچی خانہ کو جگہ دینے پر دل سے آپ کا شکریہ۔ ہمت کر کے دو کہانیاں آپ کو ارسال کی ہیں۔ ان کے نام ہیں۔ "بدلتی تقدیر" اور "خزاں سے بہار تک" برائے مہربانی آپ بتادیں کہ کیا یہ قابل اشاعت ہیں۔

ج: پیاری نصرت افسانہ مل گیا ہے۔ ابھی پڑھا نہیں گیا۔

مہناز رانی بنت امین......مانانوالہ ضلع شیخوپورہ

بشریٰ احمد اور راشدہ رفعت سے مل کر اچھا لگا۔ سید افراز رسول کے بارے میں جان کر حیرانی ہوئی کہ وہ سگریٹ نوشی کرتے ہیں۔ احمد رندھاوا اور افروز کے بعد ابرار۔ کا انٹرویو بھی لے لیں (بھئی چھوڑو الا ابرار اصل نام تو ہمیں بھی نہیں پتا) گوشی جمال آپ کا تبصرہ بہت جاندار ہوتا ہے۔ آپ کی ہمت اور آپ کے بھائی کو سلام، جو آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ زندگی کی اتنی مشکلات کے باوجود بھی اتنی زندہ دل ہیں۔ ناہید اسماعیل آپ دونوں مجھ سے بہت دور ہیں ورنہ میں آپ کے ساتھ مل کر گوشی کے اسٹور کا چکر لگاتی۔ انصاری ٹولہ ماڈل کا ٹھیک سے پوسٹ مارٹم کرتا ہے۔ (ہاہاہا) ڈاکٹر ہانیہ آپ کہاں غائب ہیں۔ میں آپ کو اور ڈاکٹر فریال کو بہت مس کرتی رہی ہوں۔ آپ کی طرح مجھے بھی یہی لگتا ہے عدنان بھائی مجھ سے مخاطب ہیں اور اسی طرح میری بہت سی الجھنیں بن کہے حل ہو جاتی ہیں۔ فاطمہ زہرا آپ کو اپنی سینئر کہوں یا جونیئر میں 2016ء سے باقاعدہ قاری ہوں مگر آپ کی طرح میں پہلے پھیری والے سے تو کیا کسی دوست سے لے کر بھی رسالہ نہیں پڑھتی تھی۔ ڈاکٹر فریال آپ کے والد کا جان کر بہت دکھ ہوا۔ مریم عزیز سے ملاقات اچھی رہی (بھائیو نہ تنگ کیا کرو ہم بہنوں کو) ویسے سچ ہے گھر والے آپ کے ہنر کی قدر کہاں کرتے ہیں۔ بھئی باہر کے لوگوں سے پوچھا کریں۔ رائٹرز کی کیا قدر ہے (ہم جیسوں سے اور کن سے؟) صبا جنید انصار، شائستہ، مومن اور ان کے بعد اب شعاع میں کوئی نیا نام آیا ہے جو ابھی میری سمجھ میں نہیں آیا۔ مجھے یہ پینگو بہت اچھی لگتی ہیں۔ افسانے سب ٹھیک تھے مگر حق حق دار تک ٹاپ آف دا لسٹ رہا۔ صالحہ محبوب میرے خیال میں نئی رائٹر ہیں مگر چھا گئی ہیں جی۔ تاجور ایک سیدزادی ہو کر ایسی حرکتیں اور اتنا غرور ایک سیدزادی پر جچتا نہیں۔ بتول نے موتیا کے ساتھ بہت برا کیا، ایسے دوست سے دشمن بہتر۔ مشک بام، مالا، تن من اور سزا پر تبصرہ ادھار کیونکہ یہ ابھی پڑھے نہیں پھر بھی شمس کا رویہ عجیب اور سمجھ سے باہر ہے کبھی خود زخم کھا لیتا ہے چراغ کو بچانے کے لیے اور کبھی خود اسے تنگ کرتا ہے۔ مالا کی امی کی وفات پر کہانی نے یک دم نیا موڑ لیا ہے پھر زیاد کی امی کی بیماری۔ کیف کا ایکسیڈنٹ کہانی کافی سے زیادہ دلچسپ ہوگئی ہے ویسے مجھے "بیربل" کا کردار بہت زیادہ پسند ہے۔ کسی حال میں سیریس اور پریشان نہیں ہوتا، ہنستا اور ہنساتا زندہ دل۔ ان تینوں ناولز اور ناولٹ کو نہ پڑھنے کی وجہ یہ ہے کہ کل 12 تاریخ کو چھوٹی بہن نے اسکول سے واپسی پر بتایا کہ آپی آپ کی رول نمبر سلپ آگئی ہے جمعے کے بعد سلپ ملی تو پتہ کیا 20 کو پیپر ہے جبکہ پچھلے ہفتے جب میں نے سر کی بیگم سے پوچھا تو انہوں نے کہا۔ ستمبر کے آخری ہفتے یا اکتوبر کے پہلے ہفتے میں ہوں گے۔ فورتھ ایئر کی تیاری تو میں نے گھر میں ہی کی ہے مگر یہ سر اس اسکول کے پرنسپل ہیں جہاں میں پڑھاتی ہوں اور ان ہی کے ذریعے داخلہ بھیجا تھا۔ میں تو سوچ رہی تھی کہ ابھی ڈیڑھ ماہ ہے مگر یہ تو ایک ہفتہ نکلا۔ خیر تیاری تو الحمدللہ ہے۔

ج: پیاری مہناز! بات تو واقعی پریشانی کی ہے۔ چلیں یہ اچھی بات ہے کہ آپ نے تیاری کرلی ہے۔ آپ کی کامیابی کے لیے دعا گو ہیں خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

☆☆

pklibrary.com

عمیرہ احمد

دانہ پانی

جھوک جیون کی ہر صبح گاؤں ماشکی کے حق باہو کے کلام سے ہوتی ہے فجر کے بعد وہ گاؤں کے کنویں پر پہنچ جاتا ہے۔ گاؤں کے سارے گھر روازنہ ہی گامو کی مشک کے پانی کی مہک اور مٹھاس کا انتظار کرتے ہیں۔ گامو دس سال سے بے اولاد ہے اور اس کی بیوی اللہ وسائی توتلی ہے۔

گاموماشکی کے گھر گندم کے دانے چوہدری کرامت کی حویلی سے آتے ہیں۔ چوہدری کے بیٹے کی شادی برابر والے گاؤں کے پیر ابراہیم کی بیٹی تاجور سے ہوتی ہے۔ گامو اور اللہ وسائی اولاد کی دعا کروانے کے لیے پیر ابراہیم کے پاس جاتے ہیں۔ وہ ان کے لیے دعا کرتے ہیں۔

تاجور کا حویلی میں پرتپاک استقبال ہوتا ہے۔ چوہدری کرامت اپنے بیٹے چوہدری شجاع کو نصیحت کرتے

pklibrary.com

ہیں تاجور کو کبھی کسی چیز کو منع نہ کرنا۔ اللہ وسائی تاجور کو دیکھنے حویلی آتی ہے تو تاجور اس کے توتلے پن کا مذاق اڑاتی ہے۔

تاجور ایک بیٹے کو جبکہ اللہ وسائی ایک خوب صورت بیٹی کو جنم دیتی ہے۔ جس کی خوب صورتی کے سارے گاؤں میں چرچے ہیں۔ اللہ وسائی اپنی بیٹی کو ڈاکٹر بنانا چاہتی ہے۔ گاؤں کے اسکول میں پہلی بار مراد اور موتیا کا سامنا ہوتا ہے۔ پہلے دن ہی چوہدری مراد اپنی میز کرسی چھوڑ کر موتیا کے ساتھ دری پر بیٹھ جاتا ہے۔ موتیا خواب

میں دیکھتی ہے کہ ایک سانپ جنگل میں اس کا پیچھا کر رہا ہے اور وہ اس سے بھاگ رہی ہے۔ اچانک اسے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے رک کر دیکھتی ہے تو ایک لڑکے پر اس کی نظر پڑتی ہے۔ سانپ پلٹ کر اس لڑکے کی طرف بڑھتا ہے تو موتیا گھبرا جاتی ہے۔

اللہ وسائی موتیا کو کبھی حویلی لے کر نہیں جاتی۔ جس پر تاجور برا مانتی ہے۔ تاجور ڈاکٹر بن رہی ہے اور شہر میں رہتی ہے۔ چھٹیوں میں گاؤں آتی ہے۔ گاؤں کی ڈسپنسری میں بلا اجازت بیٹھتی ہے۔ گاؤں کے لوگوں کا علاج یہ بتا کر کرتی ہے۔ کہ وہ ابھی ڈاکٹر نہیں اندازے سے دوا دے رہی ہے۔

مراد بیرسٹر بن کر واپس اپنے ملک لوٹ آیا ہے۔ تاجور حویلی میں اس کے استقبال کی تیاریاں کرتی ہے۔

موتیا اپنی سہیلی کی بارات دیکھنے اسٹیشن جاتی ہے۔ اسی ٹرین سے مراد بھی واپس آتا ہے۔ وہاں اس کی نظر موتیا پر پڑتی ہے۔ موتیا اسے دیکھ کر ساکت رہ جاتی ہے۔ یہ وہی خواب والا لڑکا تھا۔
بتول اور موتیا تانگے میں بیٹھ جاتی ہیں۔ گاموچوہدری مراد کو اپنے ساتھ آنے کا کہتا ہے کہ اسے اب تک کوئی لینے نہیں آیا۔ بارش کی وجہ سے سفر کے دوران مراد بھیگ جاتا ہے رات تک بخار میں جلنے لگتا ہے تاجور کو بالآخر موتیا کو بلانا ہی پڑتا ہے۔ تاجور اس دن پہلی بار موتیا کو دیکھ کر جل جاتی ہے۔ موتیا انجکشن اور دوا دے کر گھر آجاتی ہے۔
مراد اپنی ماں کے ساتھ نانا سے ملنے جاتا ہے جبکہ موتیا اپنے والدین کے ساتھ پیر ابراہیم کے ڈیرے پر جاتی ہے۔ امرود کے باغ میں پہنچ کر موتیا امرود توڑ کر کھانے لگتی ہے کہ اس کی نظر مراد پر پڑتی ہے جو اس کی طرف آرہا ہوتا ہے موتیا کو اس لمحے سانپ والا خواب یاد آتا ہے۔ وہ گھبرا کر زمین پر گھاس کو دیکھتی ہے۔ سانپ مراد کے قدموں کے قریب ہی رینگ رہا تھا۔ موتیا چیختی ہے اور گاموا پنی لاٹھی سے سانپ کو مار دیتا ہے۔
مراد پیر ابراہیم اور چوہدری شجاعت گاموا اور اس کے خاندان کے بہت شکر گزار ہیں کہ ان کی وجہ سے مراد کی جان بچ گئی۔ مراد گاموکے گھر پھولوں کے ٹوکرے بھجواتا ہے۔
موتیا اپنی سہیلی بتول کو اپنے خواب کے بارے میں بتاتی ہے کہ وہ یہ سب خواب میں دیکھ چکی ہے لیکن وہ حیران ہے کہ سانپ نے کیوں نہیں کاٹا۔ بتول یہ باتیں شکوراں کو بتاتی ہے یہاں تک کہ مراد کے سینے پر دل کے مقام پر داغ کے بارے میں بھی، تاجور یہ سن کر حیران رہ جاتی ہے اور اسے موتیا کا کالا جادو قرار دیتی ہے۔ مراد ان دونوں کی باتیں سن کر دنگ رہ جاتا ہے اور بتول کے ذریعے موتیا کو ملنے کا پیغام بھجواتا ہے۔ مراد موتیا سے دن دہاڑے ملتا ہے اور کھل کر اپنی محبت کا اقرار اور شادی کرنے کا عہد کر لیتا ہے۔ بتول ان دونوں کے عشق سے حسد کرنے لگتی ہے۔
تاجور، موتیا کو حویلی دانے صاف کروانے بلاتی ہے اللہ وسائی حجت کرتی ہے لیکن موتیا راضی ہو جاتی ہے۔ دانے صاف کرتے اس کی انگلی زخمی ہو جاتی ہے اور مراد اس پر اپنا رومال لپیٹتا ہے، تاجور یہ دیکھ کر جل جاتی ہے تب شکوراں ان دونوں کی ملاقات، محبت اور شادی کے بارے میں بتاتی ہے۔ تاجور فوری فیصلہ کرتی ہے اور ماہ نور سے رشتہ طے کرنے پر پیر ابراہیم کے پاس جاتی ہے جہاں اس پر انکشاف ہوتا ہے کہ مراد پہلے ہی اپنے نانا سے موتیا کے رشتے کی بات کر چکا ہے اور انہیں کوئی اعتراض نہیں تاجور ایک ناگن کی مانند تلملا اٹھتی ہے۔

ساتویں قسط

کپڑا اچھے تے لگے تروپا
دل پھٹے کی سینا
سجناں باج محمد بخشا
کیہہ کرنا کیہہ جینا

''چل موتیا! بس دیکھ لی ہے تُو نے بارات، اب نیچے اتر۔ یہ نہ ہو کسی کی نظر لگ جائے۔''
اللہ وسائی نے ڈھول تاشوں کے شور میں اُسے بازو سے پکڑ کر منڈیر سے پیچھے ہٹایا تھا۔ موتیا نے ایک لمحہ کے لیے پلٹ کر مراد کو دیکھنا چاہا پر وہ دیکھ نہیں سکی۔ اللہ وسائی کے ہاتھ کی گرفت ایسی ہی سخت تھی۔ سکّوں کی برسات میں وہ کھلکھلاتی ہوئی اللہ وسائی کے ساتھ لکڑی کی سیڑھی سے نیچے اُترنے لگی تھی اور اُس نے اُترتے

ہوئے اپنے صحن کو دیکھا تھا جس میں ہر طرف سکّے بکھرے ہوئے تھے۔ کچھ گھومتے، ناچتے گر رہے تھے...... کچھ گر چکے تھے۔ وہ واقعی بارش کی بوندوں کی طرح برس رہے تھے۔
موتیا نے ایسا منظر پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور ایسا منظر تو اُس گاؤں نے بھی پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا کہ بوریوں کی بوریاں سکّوں کی یوں لٹائی جارہی تھیں اور سکّے گلی کے ساتھ ساتھ دائیں بائیں لوگوں کے گھروں میں بھی اچھالے جارہے تھے۔ مگر ایک گھر میں وہ خاص طور پر اُچھالے جارہے تھے۔
وہ گھر گامو کا تھا، اور گامو گلی میں بارات کا یہ طمطراق دیکھ رہا تھا۔ اُچھالے ہوئے سکّے پکڑنے کی چھینا جھپٹی نے بارات کو جیسے ایک ہی جگہ کھڑا کر دیا تھا۔ بارات آگے جا ہی نہیں پارہی تھی۔ اور تب ہی گامو کو خیال آیا کہ اُسے خود چوہدری شجاع کو سلام کرنا چاہیے۔ اُسے بگھی سے اُتارنا چاہیے۔ وہ آگے گیا تھا اور اُس نے کھلی بگھی میں بیٹھے چوہدری شجاع اور تاجور کو دیکھا پھر عاجزی کے ساتھ اُس نے چوہدری شجاع کی طرف کا دروازہ کھول کر اُنہیں سلام کیا۔ چوہدری شجاع نے سلام کا جواب دیا۔
”ملنی یہیں کرلیں چوہدری جی یا بارات کو آگے جانے دیں۔“ اُس نے اپنے کندھے پر پڑی چادر سیدھی کرتے ہوئے شور شرابے میں آواز بلند کرتے ہوئے چوہدری شجاع سے کہا۔ وہ اُلجھا۔
”کیسی ملنی گامو؟“ گامو نے اُس کا چہرہ دیکھا پھر نہ سمجھنے والے انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔
”ہماری طرف بڑا میں ہی ہوں چوہدری جی! اور آپ کی طرف آپ۔“
چوہدری شجاع کو کرنٹ لگا تھا۔ اُس نے بے اختیار برابر میں بیٹھی تاجور کو دیکھا جس نے بڑے اطمینان سے گامو سے کہا۔
”تمہارے گھر بھی دانوں کی بوری اور کپڑے آئیں گے گامو! گاؤں کے ہر گھر میں چوہدریوں کی طرف سے جائے گا یہ تحفہ۔ یہ میرے بیٹے کی جان کا صدقہ ہے۔ اُس کی شادی کا تحفہ۔ آگے سے رستہ صاف کرواؤ۔ بارات نے آگے گزر کر جانا ہے۔ ہمیں دیر ہورہی ہے، اگلے گاؤں میں پہنچتے پہنچتے اور بھی دیر ہوجائے گی۔“
تاجور نے بے حد تنفر سے بڑے تحکمانہ انداز میں اُس سے کہا تھا اور گامو کو یوں لگا جیسے اُس کے کانوں میں کسی نے پگھلا ہوا سیسہ اُنڈیلا ہو۔
”چوہدرائن جی نے کیا کہا تھا، بارات کس گاؤں جارہی تھی اور کیوں جارہی تھی؟ اُس کا گھر تو یہیں تھا۔“
اُس نے عجیب سکتے کی سی کیفیت میں سوچا تھا۔ چوہدریوں کے ایک ملازم نے بگھی کے لیے راستہ صاف کروالیا تھا اور اب بگھی گامو کو پیچھے چھوڑ کر آگے سرک گئی تھی۔ چوہدری شجاع نے بُت بنے کھڑے گامو کے پاس سے بگھی پر بیٹھے گزرتے ہوئے تاجور سے پوچھا۔
”تم نے گامو کو بتایا نہیں تھا کہ بارات اُس کے گھر نہیں آرہی؟“ اُنہوں نے جیسے اپنے کسی خدشے کی تصدیق کرنا چاہی تھی۔ تاجور نے عجیب سے انداز میں مسکراتے ہوئے شوہر سے کہا۔
”نہیں...... اُس نے سوچ کیسے لیا کہ چوہدری کی بارات کمی کمینوں کے گھر آئے گی۔“
چوہدری شجاع نے جواباً اُسے جن نظروں سے دیکھا تھا، تاجور اُن سے نظریں چراگئی۔ اُس نے اطمینان سے منہ موڑ لیا تھا۔
”تُو نے ظلم کیا تاجور!“ اُس نے شوہر کو ملامت بھری آواز میں بڑبڑاتے سُنا تھا مگر اُس نے پھر بھی شوہر کو دیکھا نہیں تھا۔ وہ صرف چوہدری تھا اور تاجور کو یقین تھا کہ وہ سیّد بھی تھی اِس لیے اُسے سب معاف تھا...... سات خون بھی...... یہ تو بس گامو کی عزت تھی اور موتیا کا دل...... یہ بھلا کس کھاتے میں آتا تھا۔
بگھی گامو کے پاس سے گزر گئی تھی اور گامو کے ہاتھ سے ملنی کی وہ سفید چادر گر گئی تھی جو اُس نے قرض

pklibrary.com

لیے ہوئے پیسوں کے ساتھ لی تھی۔ موتیا کی شادی کے لیے اُس نے بہت سارے لوگوں سے پیسے پکڑے تھے۔ جتنے بھی ہو سکتے تھے۔ وہ چوہدریوں کی حیثیت کے مطابق شادی نہیں کر سکتا تھا، مگر وہ اپنی حیثیت سے بڑھ کر تو شادی کر سکتا تھا اور اب وہ سفید کھدر کی چادر گاؤں کی ڈھول مٹی میں اٹی پڑی تھی اور گامو کو لگ رہا تھا اُس کے اردگرد سکتے پکڑتے گاؤں کے لوگ سکتے نہیں اُس کی عزت کی دھجیاں سمیٹ رہے تھے۔

وہ ساری سرگوشیاں جنہیں وہ اتنی دیر سے کانوں سے دماغ تک جانے ہی نہیں دے رہا تھا، اب ایک بار پھر اُس کے کانوں میں سرسرانے لگی تھیں۔

''چوہدری شجاع نے اپنے سالے کی بیٹی کے ساتھ کیا ہے رشتہ......''

''بارات وہیں جارہی ہے اور چوہدری مراد کی مرضی سے ہوا ہے یہ سب کچھ......''

''تجھے کسی نے بتایا نہیں گامو؟''

وہ سرگوشیاں ڈھول تاشوں پر حاوی ہو گئی تھیں۔ وہ چوہدری مراد کی بارات نہیں تھی، وہ گامو کی عزت کا جنازہ تھا جو چوہدریوں نے نکالا تھا۔ گامو کو کبھی زندگی میں غصہ نہیں آیا تھا۔ وہ حق باہو کا کلام پڑھ پڑھ کر ڈرنے اور رونے والا انسان تھا۔ پر اُس کی زندگی میں غصہ کا پہلا لمحہ وہاں آیا تھا اور غصہ بھی نہیں، وہ طیش تھا۔

وہ جیسے اس وقت وہاں سب کو مار دینا چاہتا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار ہوتا تو وہ یہی کرتا۔

پر اُس کے ہاتھ تو کیا گھر تک میں کوئی ہتھیار نہیں تھا...... کچھ بھی نہیں جس سے گامو اپنے غصے کا اظہار کرتا۔ چوہدریوں کی تذلیل کرتا...... حساب برابر کرنے کی کوشش کرتا۔ اللہ نے اُسے چیونٹی بنایا تھا اور چوہدریوں کو ہاتھی......اور یہ احساس گامو کو زندگی میں پہلی بار ہوا تھا۔

اُس کی موتیا کا دل ٹوٹنے والا تھا اور گامو کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کر گزرے۔

بارات اسی طرح آہستہ آہستہ چل رہی تھی لوگ اسی طرح اچھالے ہوئے سکوں کو لوٹنے میں مگن تھے۔ وہاں کسی کو اس وقت گامو سے ہمدردی کرنے اور افسوس کرنے کے لیے بھی وقت نہیں مل رہا تھا۔ دانوں پر پلنے والے لوگ سکے دیکھ کر آپے سے باہر ہو رہے تھے۔ گامو بھاگتا ہوا اپنے گھر کا دروازہ کھول کر اندر آ گیا تھا۔ صحن میں صرف اللہ وسائی تھی جو اُسے دیکھ کر ہنستے ہوئے زمین پر پڑے سکے دکھاتے ہوئے کہنے لگی۔

''دیکھ گامو! سکوں کی بارش کردی ہے چوہدریوں نے...... میں تو یہ سارے وار کر پھینکوں گی موتیا پر سے۔''

''چوہدری مراد کی بارات ہمارے گھر نہیں آئی۔ وہ پیر صاحب کے گھر جارہی ہے دوسرے گاؤں۔'' گامو نے اُس کی بات سُنے بغیر غضب ناک انداز میں کہا تھا۔

''دے میرا کلہاڑا اللہ وسائی۔ میں نے کسی کو نہیں چھوڑنا آج۔ میں چوہدری مراد کے ہی ٹوٹے کردوں گا آج پھر دیکھوں گا، کس کی بارات لے کر جاتے ہیں پیر صاحب کے گھر۔'' وہ صحن میں اپنا کلہاڑا ڈھونڈتے ہوئے چلّایا تھا، اور اندر کمرے میں موتیا نے باپ کا ہر جملہ سُنا تھا اور ہر جملے نے اُس کے دل کو کاٹا تھا۔

''تجھے غلط فہمی ہو رہی ہے گامو! ایسا ہو ہی نہیں سکتا! میں آپ جا کے پوچھتی ہوں باہر، بارات تو گلی میں ہے۔'' حواس باختہ اللہ وسائی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ گامو کو روکے کہ بارات کو۔

''کوئی فائدہ نہیں اللہ وسائی! انہوں نے مذاق اُڑایا ہے ہمارا...... میری دھی کی عزت رول دی میں بھی اُن کی نسل ختم کردوں گا آج۔''

گامو کو کلہاڑی مل گئی تھی۔ وہ لکڑیوں کے اُس ڈھیر پر تھی جو گھر کا ایندھن تھا۔ کلہاڑی کو برق رفتاری سے ٹھوکتے ہوئے وہ پلٹا تھا جب موتیا کمرے سے نکل کر باپ کے رستے میں آ گئی تھی۔ گامو نے بیٹی کو دلہن کے روپ میں دیکھا اور اُس کے وجود کی آگ جیسے بھانبڑ بن گئی تھی۔

pklibrary.com

''نہ ابا نہ...... مراد کو نہ مارنا۔'' وہ سامنے آئی تھی اور اُس نے باپ کے ہاتھ سے کلہاڑی پکڑ کر کھینچ لی تھی اور گامو مزاحمت کر ہی نہیں سکا تھا۔

''وہ بارات لے کر چوہدرائن کی بھتیجی بیاہنے جا رہا ہے موتیا۔'' گامو نے جیسے موتیا کو خبر دی تھی۔

''جانے دے ابا۔ ہم اُنہیں نہیں روک سکتے۔'' گامو نے بیٹی کا چہرہ دیکھا۔

وہ حُسن سات گاؤں میں نہیں تھا اور اُس حُسن پر وہ روپ گامو کو تو پوری دُنیا میں نظر نہیں آیا تھا۔ اُس نے بڑوں سے سُنا تھا روپ روتا ہے ---- آج اُس نے دیکھ لیا تھا۔

''چل موتیا! پھر اُس کو مارتے نہیں، اُس پر تھوک کر آتے ہیں۔'' گامو نے بیٹی کا ہاتھ پکڑا تھا۔

''اُن کو دکھاتے ہیں کہ تجھے کوئی فرق نہیں پڑا تیرے لیے مراد بڑے......'' کلہاڑی موتیا کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔ گامو اُس کا ہاتھ کھینچتا ہوا اُسے لکڑی کی سیڑھی کی طرف لے گیا اور وہ میکانکی انداز میں سیڑھی چڑھتی گئی۔

''تُو نے رونا نہیں موتیا...... ایک آنسو نہ آئے تیری آنکھ میں...... تُو نے بارات پر تھوکنا ہے۔''

گامو اُس کا ہاتھ پکڑے اُسے منڈیر کی طرف لے جاتا کہتا گیا۔ وہ خالی آنکھوں کے ساتھ باپ کے حکم کی تعمیل میں منڈیر پر جا کر کھڑی دُلہن بنی اپنے محبوب کی بارات دیکھنے لگی تھی جو اُس کے بجائے کسی دوسرے کے گھر جا رہی تھی۔

سکّے ہوا میں اب بھی اُچھل رہے تھے اور اُن کے گھر کی چھت اور صحن میں گر رہے تھے۔ ڈھول، تاشوں کی آوازیں بھی اسی طرح آ رہی تھیں۔ نیچے صحن میں اللہ وسائی دھاڑیں مار مار کر روتے ہوئے چوہدریوں کو بددعائیں دے رہی تھی، اوپر چھت پر گامو پاگلوں کی طرح بارات پر منہ بھر بھر کے تھوک رہا تھا۔ اور اس سب کے بیچوں بیچ ایک موتیا تھی جو اب بغیر دوپٹے کے چھت پر کھڑی تھی۔ ماتھے پر ٹیکا لگائے، مراد کی پشت دیکھ رہی تھی جو گھوڑے پر بیٹھا تھا اور اُس کے دروازے کے سامنے سے گزر چکا تھا۔

وہ اُسے دیکھتی ہی رہ گئی تھی۔ گامو کی آواز اس کے کانوں میں آ رہی تھی جو اُسے اُس پر تھوکنے کا کہہ رہا تھا۔ وہ اُس پر کیسے تھوک سکتی تھی؟ وہ اُس کا مراد نہیں تھا، اُس کی مراد تھا۔

تاجور نے گامو اور موتیا دونوں کو چھت پر کھڑے دیکھا تھا، اُس نے گامو کو بارات پر تھوکتے بھی دیکھا تھا۔ اُس کی بگھی اُس وقت اُس کے دروازے کے سامنے سے گزر رہی تھی۔

''یہ کمی کمین میرے بیٹے کی بارات پر تھوکے گا؟ اس کی اتنی جرأت۔''

تاجور تڑپی تھی اور اُس نے چوہدری شجاع سے کہا تھا جس نے سر اُٹھا کر گامو کو دیکھا تھا پھر اُس کے برابر کھڑی موتیا کو۔ ننگے سر والی اُس دُلہن کو دیکھ کر چوہدری شجاع کا سر جھک گیا تھا۔

''ہم اسی قابل ہیں تاجور...... تھوکنے دے۔ شاید اُس کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے اور وہ بددعا نہ دے۔'' چوہدری شجاع نے بیوی سے کہا تھا اور تاجور کو مشتعل کر دیا تھا۔

''ہم کوئی بیٹیوں والے ہیں کہ اُس کی بددعاؤں سے ڈریں گے، ہم بیٹے والے ہیں۔''

اُس نے تن کے شوہر سے کہا تھا اور پھر موتیا کو دیکھا تھا جو اُسے نہیں دیکھ رہی تھی، وہ اب بھی اُس کے بیٹے کو دیکھ رہی تھی جو دور جا رہا تھا۔ تاجور کو اُس کی نظر، اُس کے انداز سے خوف آیا۔ اُس نے آج واپسی پر بھی بیٹے کا صدقہ اُتارنا تھا۔ گیارہ بکرے ذبح کرنے تھے۔ اب بائیس کاٹے کر لیا تھا اُس نے۔

بارات موتیا کی گلی سے گزر گئی تھی۔ گلی کے سارے لوگ بارات کے ساتھ ہی آگے چلے گئے تھے۔ اُنہیں آج وہاں تک سکّے پکڑنے تھے جہاں تک بارات سکّے لٹاتی۔ ڈھول تاشوں کی آوازیں اب دور ہو گئی

pklibrary.com

تھیں۔
گامو نے جیسے ہار کر خالی گلی کو دیکھا تھا پھر موتیا کو جو اب بھی کھڑی گلی میں اُس طرف دیکھ رہی تھی، جہاں سے بارات گئی تھی۔
گامو کو پہلی بار اُس کے ننگے سر کا خیال آیا۔
اُس نے اُس دوپٹے کو ڈھونڈا تھا جو چھت کے ساتھ لگی سیڑھی پر اٹکا ہوا تھا۔ اُس نے دوپٹہ لا کر موتیا کے سر پر ڈالا تھا۔ پھر بیٹی کا چہرہ دیکھا تھا۔ وہ اب بھی روئی نہیں تھی۔ بس گلی کے بجائے باپ کو دیکھنے لگی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں پانی نہیں تھا، مگر اُس کی آنکھوں میں اب اور کچھ بھی نہیں تھا۔ غم، درد، شکوہ، کچھ بھی نہیں...... اُس کی آنکھیں خالی آنکھیں تھیں۔
گامو اُس کا ہاتھ پکڑے اُسے نیچے لے آیا۔ وہاں صحن میں اللہ وسائی نڈھال بیٹھی تھی۔ وہ شادی کا گھر نہیں میت والا گھر لگ رہا تھا۔
''دیکھ اللہ وسائی! تیری بیٹی کتنی دلیر ہے، ایک آنسو نہیں بہایا اِس نے۔''
گامو نے صحن میں آتے ہی اپنی بیوی سے کہا تھا۔ اُسے اب جیسے گھر کی ان دونوں عورتوں کو تسلی دینے کے لیے مرد بننا تھا۔ ہمت اور حوصلے والا مرد۔
اللہ وسائی نے موتیا کا چہرہ دیکھا تھا اور وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ ماں تھی، ایک نظر میں اُس کے دل تک پہنچ گئی تھی۔ موتیا کے سامنے کھڑے ہو کر اُس نے بیٹی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تھا۔ وہ آنکھیں جیسے کنویں کی آنکھیں تھیں۔ سوکھے کنویں کی آنکھیں۔ اللہ وسائی نے سینے پر ہاتھ مارا تھا پھر موتیا سے کہا۔
''تو نے رونا ہے نا موتیا! تُو رو لے...... میری دھی دلیر نہ بن...... غم نہ پی...... سب کچھ اُگل دے...... سب کچھ بہا دے۔''
وہ اُسے کندھوں سے پکڑے جھنجھوڑتی رہی۔ موتیا گم صم اسی طرح کھڑی اُسے دیکھتی رہی۔ نہ وہ روئی تھی، نہ اُس نے کوئی آواز نکالی تھی۔ گامو اور اللہ وسائی اپنے گھر کے صحن کا دروازہ بند کیے بکھرے سکوں کے بیچوں بیچ موتیا کی زبان کھلوانے کی کوشش کرتے رہے، پتا نہیں اُسے کیا کیا سُناتے اور بتاتے رہے کبھی اُسے سینے سے لگاتے، کبھی اُس کے ہاتھ پاؤں رگڑتے۔ موتیا نے نہیں بولنا تھا وہ نہیں بولی۔ اُس نے نہیں رونا تھا، وہ نہیں روئی۔ اُس کے ماں باپ روتے رہے اور وہ بت بنی انہیں دیکھتی رہی۔
غم کچھ لوگوں کو سمندر کر دیتا ہے، کچھ کو بنجر اور کچھ کو غم، ہوش و خرد سے پرے لے جا کر بٹھا دیتا ہے۔
موتیا نے زندگی میں محبت کر کے بس ایک نافرمانی کی تھی اپنی مرضی کی محبت کر کے اور وہ نافرمانی اُس کے ساتھ ساتھ اُس کے ماں باپ کو بھی لے ڈوبی تھی۔
وہ اب اُس نافرمانی کو لے کر رب کے سامنے کھڑی ہو گئی تھی۔ رب کے سامنے کوئی بھی کبھی بھی جا کر کھڑا ہو سکتا ہے۔ رب ماں کی طرح مرہم رکھتا ہے، بندے کے کرچی کرچی وجود کو اس طرح جوڑ دیتا ہے کہ لکیر بھی ڈھونڈنے سے نہیں ملتی اور رب بعض دفعہ کرچی کرچی وجود کی وجہ بننے والوں کو بھی اسی طرح کرچیوں میں توڑ دیتا ہے۔
چوہدری شجاع نے ٹھیک کہا تھا۔ تاجور نے ظلم کیا تھا...... غلط دل کو توڑ بیٹھی تھی...... وہ گامو اور اللہ وسائی کی موتیا کا دل تھا...... اُس تحفے اور نعمت کا دل تھا جو رب نے اُن دونوں کی نیکیوں کے عوض انہیں عطا کیا تھا۔
☆☆☆
چوہدری شجاع نے مراد کی بارات کے پورے راستے دوبارہ تاجور سے بات نہیں کی تھی اور تاجور نے اُسے

pklibrary.com

مخاطب کرنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ اُسے یقین تھا، چوہدری شجاع کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا جیسے ہمیشہ ہو جاتا تھا۔

چُپ صرف چوہدری شجاع کو نہیں لگی تھی، مراد کو بھی لگ گئی تھی۔ تاجور نے شوہر کو نظر انداز کر دیا تھا پر بیٹے کا بُجھا ہوا چہرہ اور خاموشی اُس سے برداشت نہیں ہو پا رہی تھی۔ وہ ساری رسموں میں خاموش رہا تھا۔ جو وہ کہتی رہی وہ کرتا رہا۔

تاجور کو لمحہ بھر کے لیے موتیا کی گلی میں یہ خدشہ ہوا تھا کہ وہ آخری لمحہ میں اُس سے بغاوت نہ کر بیٹھے مگر مراد نے ایسا کچھ بھی نہ کر کے جیسے اُس کی گردن کی اکڑ کو اور بڑھا دیا تھا۔ کس کا بیٹا تھا جو یوں پردیس سے آ کر بھی ماں باپ کے کہنے پر وہاں شادی کرے جہاں وہ چاہتے تھے۔ تاجور نے یہ جملہ وہاں کئی لوگوں سے سُنا اور ساتھ اپنے لیے تعریفی جملے بھی۔

ماہ نور کو وہ بڑی شان و شوکت سے بیاہ کر لے آئی تھی اور اُسے یقین تھا، ماہ نور کا حسین چہرہ دیکھتے ہی مراد موتیا کو بھول جائے گا۔ وہ موتیا جیسی حسین نہ سہی، مگر بہر حال حسین تھی اور سولہ سنگھار کے ساتھ وہ کم از کم اُس رات موتیا سے کم بھی نہیں لگ رہی تھی۔

وہ رات گئے اپنے کمرے کی کھڑکی بند کرنے کے لیے اُٹھی تھی، جب اُس نے رات کے پچھلے پہر مراد کو صحن میں لگے ہوئے موتیا کے پودوں کے درمیان چکر کاٹتے دیکھا۔ تاجور کو لگا کسی نے اُس کا دل لمحہ بھر کے لیے پکڑ کر کھینچا تھا۔ وہ یہاں کیسے تھا، اُسے تو ماہ نور کے پاس ہونا چاہیے تھا۔ تاجور جیسے لپکتے ہوئے باہر آئی تھی۔

"مراد! خیریت تو ہے نا؟" اُس کی آواز پر مراد چکر کاٹتے کاٹتے رکا تھا اور اُس نے ماں کو دیکھا۔

"جی!"

"تو یہاں کیا کر رہے ہو؟ اندر دُلہن کے پاس جاؤ۔ وہ تمہارا انتظار کر رہی ہوگی۔" تاجور نے اُس کی پشت کو تھپکا۔

وہ ماں کو دیکھتا رہا، پوچھنا چاہتا تھا، وہ اُس کی بارات کو موتیا کے دروازے کے سامنے سے کیوں لے کر گئی تھی؟ یہ بھی پوچھنا چاہتا تھا کہ موتیا دُلہن بنی چھت پر کیوں کھڑی تھی؟ کیا وہ اُس کے انتظار میں تھی؟ کیا کسی نے اُسے مراد کی ماہ نور سے شادی کے بارے میں نہیں بتایا تھا؟ وہ پتا نہیں ماں سے وہاں کھڑے کیا کیا پوچھنا چاہتا تھا پر کچھ بھی پوچھنے کی چاہ ہی نہیں رہی تھی اُسے۔ کسی سوال کا صحیح جواب موتیا کو اُس کا نہیں کر سکتا تھا۔ کسی سوال کا غلط جواب ماہ نور کو اُس کی زندگی سے نہیں نکال سکتا تھا۔ وہ ماں کا چہرہ دیکھتا رہا اور پھر اندر چلا گیا۔ تاجور کا دل جیسے ہلکا ہوا۔

"کچھ دنوں میں ٹھیک ہو جائے گا، چند دنوں میں بھول جاتے ہیں سب محبت کو بھی اور محبوب کو بھی...... جو نظر نہیں آتا، وہ یاد بھی نہیں رہتا۔"

تاجور کو یہ فلسفہ پتا نہیں کس نے سمجھایا تھا۔

☆☆☆

مراد اپنے کمرے میں گیا تھا جو موتیا اور گلابوں سے بھرا ہوا اور سجا ہوا تھا۔ اُس وسیع و عریض کمرے کی فضا اُن ہی دونوں پھولوں کی خوشبو سے مہک رہی تھی اور مراد صرف موتیا کی خوشبو ہی محسوس کر رہا تھا۔ وہ اُس کے دل و دماغ پر نہیں حواس پر سوار تھی۔ وہ موتیا کو دیکھتا یا موتیا کے پھول کو، اُس کی آنکھوں کے سامنے بس ایک ہی چہرہ آتا تھا جو اب اُس وقت بھی آ گیا تھا جب وہ اپنے حجلۂ عروسی میں داخل ہوا تھا، اور اُس نے سُرخ لباس میں ملبوس ماہ نور کو اپنے بستر پر براجمان دیکھا تھا۔

کسی چھت پر کھڑی سُرخ دوپٹہ اوڑھے موتیا کا ٹیکے سے سجا چہرہ اُس کی آنکھوں کے سامنے جھلملایا تھا اور بس جھلملاتا ہی گیا تھا۔

پتا نہیں کہاں کہاں سے درد اُٹھا تھا اور کہاں سے ہوک۔ مراد کا دل چاہا تھا وہ اُلٹے قدموں اُس کمرے سے بھاگ جائے۔ وہ جو کر بیٹھا تھا اُس کا بھیانک پن اُس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

اُس نے آنکھیں بند کر کے اُس کے چہرے کو جھٹکا تھا۔ سانس روک کر جیسے اپنے آپ کو اُس کے تصور سے آزاد کیا تھا۔ پھر دوبارہ بستر پر بیٹھی اُس دُلہن کو دیکھا تھا جس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ اچھا یا بُرا جو بھی فیصلہ تھا، مراد کا تھا۔ اُس کا اپنا۔ پھر اب ماتم کرنے کا کیا فائدہ۔ اُس نے جیسے خود کو خود ہی پھٹکارا تھا۔

"وہ بے وفا تھی، وہ بدکردار تھی، وہ تیرے لائق نہیں تھی مراد! تو کیوں پچھتاووں میں پڑ رہا ہے۔"

اُس نے جیسے خود کو سب کچھ یاد دلایا۔ کنویں پر اُس رات کا وہ منظر، موتیا کے ساتھ کھڑا اسعید۔ وہ بکھری چوڑیاں، وہ اُڑتا دوپٹہ۔ دل ایک لمحہ کے لیے گونگا ہوا تھا۔ دماغ نے ایک بار پھر مراد کی پیٹھ تھپکی تھی۔

"اچھا کیا جو بھی کیا...... اچھا کیا جو بھی کیا۔"

وہ تکرار اُس کے کانوں میں ہونے لگی تھی۔ موتیا کا چہرہ اُس تکرار میں غائب ہو گیا تھا۔ مراد نے کمرے میں رکھے جگ سے پانی گلاس میں ڈال کر پیا، اپنی قمیض کی جیب سے وہ کنگن نکالے جو اُس کی ماں نے ماہ نور کے لیے دیے تھے اور وہ ماہ نور کے پاس آ کر بستر پر بیٹھ گیا تھا جو گھونگھٹ کاڑھے دھڑکتے دل کے ساتھ اپنے جیون ساتھی سے اپنی پہلی مدح سرائی کی منتظر تھی۔ اُسے بھی یقین تھا، اُس کا حسن اس طرح سج دھج کر مراد کے سامنے آئے گا تو اُس کی نظروں کو تو باندھ ہی لے گا۔ دل کا کیا ہے، وہ تو آہستہ آہستہ بدل ہی جاتا ہے۔

اُس نے موتیا کے بارے میں سُنا تھا۔ اُس نے یہ بھی سُنا تھا کہ مراد نے اپنی مرضی سے اُسے چھوڑا تھا۔ ماہ نور کو مراد پسند تھا۔ اُسے کسی موتیا، چمپا، چنبیلی میں دلچسپی تھی نہ پروا۔ وہ تو پورے خاندان کی مرضی سے اُس مرد کے "نکاح" میں آئی تھی جس کو اُس نے چاہا تھا۔ پھر اس سے کیا فرق پڑتا تھا کہ اُس کی زندگی میں پہلے کوئی موتیا تھی یا نہیں۔ وہ اب تو صرف اُس کا ہوا تھا اور اپنی مرضی سے ہوا تھا۔ ماہ نور کے لیے اتنا کافی تھا۔

مراد نے اُس کا گھونگھٹ اُٹھائے بغیر اُس کی کلائیوں میں وہ کنگن ڈالے تھے اور کوئی لفظ ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی جن کی مدد سے وہ اُس سے بات شروع کرتا۔ وہ موتیا ہوتی تو اُسے لفظ ڈھونڈنے نہیں پڑتے۔ وہ ماہ نور تھی اور ماہ نور سے مراد کیا بات کرتا۔ وہ چپ اُس کے سامنے بیٹھا رہا اور ماہ نور گھونگھٹ میں منہ چھپائے سر جھکائے اُس کے بولنے کا انتظار کرتی رہی۔

بہت دیر کے بعد مراد نے بالآخر اُس کا گھونگھٹ اُٹھایا تھا اور اُس کے چہرے پر پہلی نظر ڈالتے ہی اُس کے منہ سے بے اختیار "موتیا!" نکلا تھا۔ سرخ دوپٹے والا وہ چہرہ ایک بار پھر وہاں آ گیا تھا اور اس بار وہ ماہ نور اور اُس کے بیچ آ گیا تھا۔ مراد مبہوت اُس چہرے کو دیکھتا رہا اور ماہ نور نے پلکیں اُٹھا کر بھی مراد کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ موتیا کے لفظ نے اُسے بُت بنا دیا تھا۔ مراد اب اپنی انگلیوں سے اُس کا چہرہ چھو رہا تھا جیسے کوئی بت تراش اپنے سب سے دل پسند شاہکار کو چھوتا ہے۔ وہ اُس کے ماتھے کے ٹیکے کے چاند کو اپنی انگلی سے ہلکورے دے رہا تھا۔ اُس کے ناک کی بالی کے سُرخ موتی کو اُس کے سرخ ہونٹوں سے چھونے سے ہٹا رہا تھا۔ اس کے کانوں کے جھمکوں کو جھلا رہا تھا اور ماہ نور نے تب پہلی بار مراد کا چہرہ دیکھا تھا اور اس کی آنکھوں میں اُسے موتیا نظر آئی تھی اپنا وجود نہیں۔ مراد کی آنکھوں کا والہانہ پن اس کے لیے نہیں تھا۔ وہ ایک بار پھر اس کے کانوں میں سرگوشی کر رہا تھا۔ موتیا۔ اور وہ لمحہ تھا جب ماہ نور نے چاہا تھا کاش وہ موتیا ہی ہوتی یا وہ مراد نہ ہوتا۔

☆☆☆

pklibrary.com

"چوہدرائن جی نے اچھا نہیں کیا، میرے دل کو تو بڑا صدمہ ہوا ہے اس طرح موتیا کی بے عزتی کا۔ بیٹیاں تو سب کی سانجھی ہوتی ہیں۔ نہیں شادی کرنی تھی نہ کرتیں پر اس طرح کسی کو آس دلا کر ذلیل کرنا...... توبہ...... توبہ! مجھے پتا ہوتا نا کہ ابھی تک گاموا اور اللہ وسائی کو پتا ہی نہیں ہے کہ چوہدری اپنا بیٹا کہیں اور بیاہ رہا ہے تو میں خود جا کر اطلاع کر دیتی اُن کو۔ پر میں بھی بس تیرے ہی کاموں میں لگی رہی۔ اب صبح خیر سے بارات ہے تیری۔ اللہ خیر سے وقت نبٹائے۔"

شکوراں رات گئے بتول کو لیے بیٹھی داج کے جوڑے بکسے میں رکھ رہی تھی اور ساتھ چوہدری مراد کی بارات کے بارے میں باتیں کر رہی تھی اور اپنے افسوس کا اظہار کر رہی تھی۔

مایوں کے کپڑوں میں ملبوس بتول کو یک دم پیاس لگی تھی۔

باہر صحن میں گھڑے سے پانی کا پیالہ بھر کر پیتے ہوئے اس کے کانوں میں ماں کی آواز گونجنے لگی تھی۔ اُس کا دل عجیب سے انداز میں گھبرایا تھا۔ شکوراں نے ٹھیک کہا تھا۔ چوہدرائن کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ بتول بھی ماں سے متفق تھی اور احساس جرم کا شکار بھی اور اُسے رہ رہ کر موتیا کا خیال آ رہا تھا۔ پتا نہیں اس پر کیا گزر رہی تھی۔ اگر اس طرح سعید کی بارات اس کے دروازے کے سامنے سے گزر کر چلی جاتی تو؟ وہ جیسے ہول کر رہ گئی اور اس نے آگے کچھ سوچنا بھی نہیں چاہا تھا۔ اندر بیٹھی شکوراں کچھ عجیب سی سوچ میں پڑی تھی۔ اُس کی بیٹی پچھلے کچھ دنوں سے کچھ عجیب سی ہو گئی تھی۔ اس نے موتیا کے ساتھ ہونے والے ظلم پر ایک لفظ نہیں کہا تھا نہ ہی وہ سن کر موتیا کے گھر کی طرف بھاگی تھی۔

"تیری اور موتیا کی تو صلح ہے نا؟" بتول کے پانی پی کر اندر آنے پر اُس کی ماں نے بغیر اس کا چہرہ دیکھے ہوئے پوچھا تھا اور بتول ماں کی نظروں کے سوال اور انداز پر گڑبڑائی تھی۔

"ہاں اماں! میرے اور اس کے بیچ کیوں کوئی جھگڑا ہو گا؟ میرا تو دل دُکھ سے پھٹ رہا ہے۔ میں مایوں نہ بیٹھی ہوتی تو موتیا کے پاس جاتی۔ اُس کا غم بانٹتی۔ پر اب اپنے مایوں کے جوڑے میں اُس کے سامنے جاؤں گی تو اس کا دل اور دُکھے گا۔"

بتول کو ماں کے کچھ کہے بغیر بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ ماں کیوں اس سے یہ سوال جواب کرنے بیٹھی تھی۔

"ہاں ٹھیک کہتی ہے تو۔ ابھی تو جانا بھی مت اس کے پاس۔ اللہ خیر سے تجھے کل اپنے گھر کا کرے پھر آ کر مل لینا موتیا سے۔"

شکوراں نے فوراً کہا۔ اُسے بتول کی باتوں پر فوراً ہی بدشگونی کا خیال آنے لگا تھا۔ بتول کپڑوں کے اُس ڈھیر کو دیکھنے لگی۔ جو چوہدرائن نے اُسے دیے تھے پورے اکیاون جوڑے اور ایک سے بڑھ کر ایک۔

"تیرا داج ایسا ہو گا کہ تیرا سسرال سالوں باتیں کرے گا اس کی۔" چوہدرائن نے اس سے کہا تھا۔ بتول کمرے میں پڑی چیزیں دیکھنے لگی۔ سامان کا ڈھیر سعید کے گھر چلا بھی گیا تھا۔ تاجور نے پھر بھی اور بہت کچھ بھیج دیا تھا۔ پتا نہیں سامان کے اس ڈھیر کو دیکھ کر بتول کو خوشی کیوں نہیں ہو رہی تھی۔

کچھ تھا جو اُسے پریشان کر رہا تھا، تنگ کر رہا تھا۔ اس کی ماں رات گئے لالٹین کی روشنی میں جوڑے ٹانکتے ہوئے ایک ٹپہ گانے لگی تھی اور بتول کی آنکھوں کے سامنے صرف موتیا کا چہرہ آ رہا تھا۔ پتا نہیں وہ کس حال میں تھی اور اگر کبھی اُسے یہ پتا چل گیا کہ یہ سب کچھ میں نے کیا ہے تو وہ کیا کرے گی؟ اُس نے جیسے موتیا کے ممکنہ ردعمل کے بارے میں سوچنے کی کوشش کی تھی۔

اُس کے ذہن میں کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ وہ جانتی تھی موتیا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ بے بس تھی۔ بتول پھر بھی بیٹھی سوچے جا رہی تھی۔ اس نے سعید کو پانے کے لیے بہت بڑی قیمت ادا کی تھی۔ اس نے موتیا نہیں کھوئی

pklibrary.com

تھی۔ اپنے ایمان کا بھی سودا کیا تھا۔ بتول نے سوچا تھا وہ سعید سے شادی کے بعد فوراً حج یا عمرے پر جائے گی اور اللہ سے توبہ کرے گی۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔

بستر پر لیٹتے ہوئے اس نے جیسے اپنے آپ کو تسلی دی۔ اس کے کانوں میں اب بھی شکوراں کے ٹپے کی آواز گونج رہی تھی۔

مکھڑے دا تل ماہیا
اساں تیرے نال جانا
چاہے ویچاں دل ماہیا

☆☆☆

تاجور پانی کا ایک گھونٹ بھی نہیں لے سکی تھی۔

''یہ کہاں کا پانی لا کر رکھ دیا ہے؟'' اس نے ناراض ہو کر اس ملازمہ سے کہا تھا جو ناشتے کا سامان لا لا کر میز پر رکھ رہی تھی۔

''آج گامو پانی دے کر نہیں گیا تو گھر کے کنویں کا پانی ہی لا کر رکھا ہے۔'' ملازمہ نے ڈرتے ڈرتے اُسے بتایا۔

ایک لمحہ کے لیے تاجور خاموش رہی تھی پھر اُس نے تحکمانہ انداز میں ملازمہ سے کہا۔

''اسلم سے کہو، گاؤں کے کنویں سے لے کر آیا کرے ہر روز پانی۔ اب بھی لے کر آئے۔'' ملازمہ اُس کے حکم پر بھاگی ہوئی چلی گئی تھی۔

''اور یہ گھر کے کنویں کی بھی صفائی ہونے والی ہے۔ اتنا بدذائقہ پانی تو کبھی بھی نہیں رہا اس کا۔''

اس نے دوسری ملازمہ کو گھر کے کنویں کی صفائی کی ہدایات دی تھیں۔ وہ بھی گھر کے مرد ملازموں کو یہ ہدایات پہنچانے چلی گئی تھی۔ اور تب ہی ماہ نور بجی سنوری ہوئی سلام کر کے کمرے میں داخل ہوئی۔ تاجور جیسے فدا ہونے والے انداز میں اس کے لیے اُٹھی اور اُسے سینے سے لگا کر پیار کرتے ہوئے اس نے ناشتے کی میز پر بٹھایا تھا۔ وہ ولیمے کی صبح تھی اور تاجور نے گہری نظروں سے ماہ نور کو دیکھا تھا۔ یوں جیسے یہ کھوجنا چاہتی تھی کہ ماہ نور کے چہرے پر دلہناپے کی خوشی اور چمک تو تھی۔ وہ سیدھا سیدھا ماہ نور سے یہ سوال نہیں کر سکتی تھی کہ مراد کو موتیا یاد تو نہیں آئی تھی نا۔ ماہ نور کا چہرہ اُسے کسی گہری سوچ میں لگا۔

وہ سر سے پیر تک زیورات میں لدی پھندی تھی پر پھر بھی تاجور کو لگا جیسے وہ ذہنی طور پر کہیں اور تھی۔ تاجور نے اپنی رائے کو جیسے خود ہی جھٹلاتے ہوئے اس سے کہا تھا۔

''بیٹا! مراد کہاں ہے؟ وہ تیار نہیں ہوا ابھی تک؟''

ماہ نور نے جواباً ساس کو دیکھتے ہوئے مدھم آواز میں کہا تھا۔

''وہ تو صبح سویرے ہی کہیں چلے گئے تھے۔ اس کے بعد کمرے میں نہیں آئے۔ میں سمجھ رہی تھی وہ آپ کے پاس ہیں۔'' تاجور ایک لمحہ ٹھٹکنے کے بعد بولی۔

''ہاں آیا تھا صبح میرے پاس لیکن میں نے سوچا پھر تمہارے پاس چلا گیا ہے۔ شاید حویلی میں چہل قدمی کر رہا ہوگا۔ گوروں کی طرح اُسے عادت ہو گئی ہے ہر صبح سویرے اٹھ کر سیر کرنے کی۔'' تاجور نے ہنستے ہوئے جیسے بیٹے پر پردہ ڈالا تھا۔ تب ہی ملازمہ کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

''چھوٹے چوہدری کو دیکھو، حویلی میں کہاں ہیں؟'' تاجور نے اسے ہدایت دی تھی۔

''وہ تو جی صبح ہی گھوڑے پر بیٹھ کر کہیں چلے گئے تھے۔ میں جب حویلی آ رہی تھی تو میں نے اُنہیں جاتا دیکھا

pklibrary.com

تھا۔" ملازمہ نے اطلاع دی اور پراٹھوں کی چنگیر رکھ کر چلی گئی۔
"ہاں وہ گیا ہوگا، صبح صبح نہر کنارے جایا کرتا ہے اکثر۔" تاجور نے اس بار بہو سے نظریں چراتے ہوئے کہا تھا اور موضوع بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے اس کے سامنے پلیٹ رکھتے ہوئے اس سے کہا۔
"بیٹا! تم تو ناشتہ کرو...... آجائے گا وہ تھوڑی دیر میں۔" ماہ نور نے مراد کا انتظار کرنے کا اصرار نہیں کیا تھا، اُسے پتا تھا اس کی پھوپھی پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہی تھی اور اس نے پھوپھی کا ساتھ دیا تھا۔
"ارے یہ تو پوچھا ہی نہیں میں نے کہ اس نے تمہیں منہ دکھائی میں کیا دیا۔" تاجور نے اس کی کلائیوں میں کنگن دیکھنے کے باوجود بے نیاز نظر آنے کی اداکاری کرتے ہوئے پوچھا۔ پراٹھا اپنی پلیٹ میں رکھتے ہوئے ماہ نور نے تاجور کو دیکھا اور پھر کہا۔
"انہوں نے مجھے منہ دکھائی میں موتیا کا نام دیا تھا۔ میرا نام وہ بھول گئے تھے...... کہہ رہے تھے کسی نے انہیں بتایا ہی نہیں۔" اس نے اتنے سادہ لہجے میں یہ بات کہی تھی، تاجور پھر بھی کٹ کر رہ گئی تھی۔
وہ ماہ نور سے کچھ بھی کہنے اور پوچھنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ ماہ نور ایک بار پھر اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ ہوگئی تھی اور تاجور کی بھوک اُڑ گئی تھی۔ دونوں کے درمیان ایک لمبی خاموشی آئی تھی پھر تاجور نے اس سے کہا۔
"تمہارا نام اس کے نکاح نامے میں لکھا ہے، تین بار قبول کیا ہے اُس نے تمہیں۔ بھول بھی جائے تو بھی تم یاد رہوگی اُسے۔ ہم مردوں کے ان چھوٹے چھوٹے معاشقوں کو دل پر نہیں لیتے۔" تاجور نے بظاہر بڑے بے فکر اور بے پروا انداز میں اُسے تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔
ماہ نور چاہنے کے باوجود اس سے یہ نہیں کہہ سکی کہ موتیا کا نام مراد کے دل پر لکھا ہے اور اس دل کو نکاح نامے کا کوئی پاس ہی نہیں تھا۔ پر وہ اس گھر میں دوسرے ہی دن تاجور سے بحث کیا کرتی۔ وہ فرماں برداری کی صفت پر چنی گئی تھی اور اُسے یہاں فرماں برداری ہی دکھانی تھی۔
ملازمہ پانی کا ایک نیا جگ لے کر آ گئی تھی۔ اُس نے گلاس میں پانی ڈال کر تاجور کو اطلاع دیتے ہوئے پانی کا نیا گلاس پیش کیا۔ تاجور نے وہ گلاس ماہ نور کی طرف بڑھاتے ہوئے اپنے لیے ایک نئے گلاس میں پانی ڈالا اور پانی کا پہلا گھونٹ لیتے ہی وہ بلبلائی تھی۔
"کہاں سے آیا ہے یہ پانی؟ یہ بھی کڑوا ہے۔" اس نے ملازمہ پر چڑھائی کرتے ہوئے کہا تھا۔
"جی۔ یہ تو گاؤں کے کنویں سے آیا ہے۔" ملازمہ نے ڈر کر کہا تھا۔
"گاؤں کے کنویں کا پانی تو ہمیشہ میٹھا ہوتا تھا کڑوا کیسے ہوگیا؟" تاجور کو یقین نہیں آیا تھا کہ وہ گاؤں کے کنویں کا پانی تھا۔ تب ہی ماہ نور نے بھی گلاس اُٹھا کر پانی کا ایک گھونٹ پیا اور اُس نے جیسے حیران ہو کر تاجور کو دیکھا تھا۔
"تجھے بھی کڑوا لگا ہے نا؟ دیکھا، میں کہہ رہی تھی، جھوٹ بول رہے ہیں یہ نوکر یہیں کہیں سے لے آئے ہیں پانی۔" تاجور نے اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اندازہ لگایا تھا اور بولنا شروع کر دیا تھا۔
"پھوپھو! پانی میٹھا ہے۔" ماہ نور کے جملے پر تاجور ٹھٹکی تھی۔ اس نے حیران ہو کر اس کی شکل دیکھی پھر ملازمہ کی، جس نے ماہ نور کے جملے پر جیسے ہمت باندھتے ہوئے کہا تھا۔
"جی چوہدرائن جی! پانی میٹھا ہے، میں بھی پی کر آئی ہوں ابھی۔"
تاجور نے عجیب سے انداز میں گلاس اُٹھا کر ایک گھونٹ اور لیا۔ پانی کی کڑواہٹ ویسی ہی تھی۔
"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا چوہدرائن جی! کہیں چھوٹے چوہدری کی بارات کی تھکن کی وجہ سے طبیعت نہ خراب ہوگئی ہو۔ زبان کا ذائقہ اسی لیے خراب نہ ہوگیا ہو۔" ملازمہ نے تشویش سے کہا تھا۔ تاجور نے کچھ بھی

جواب نہیں دیا۔ وہ پانی کے گھونٹ اسی طرح لینے لگی۔ پانی کڑوا تھا۔ وہ قسم اٹھا کے کہہ سکتی تھی پر اب سب کو میٹھا لگ رہا تھا تو وہ یہ کیسے کہتی رہتی۔

''ہاں۔ شاید تھکن ہی کی وجہ سے ہے۔ کام بھی تو اتنا کیا ہے۔ اتنی جلدی شادی کی تیاری کرنا کوئی آسان کام تھوڑی تھا۔'' تاجور نے ملازمہ کی بات پر یقین کرلیا تھا۔ پر کچھ تھا جو اُس کے ذہن میں کہیں اٹکا تھا۔

اس کا باپ ہمیشہ اس سے کہا کرتا تھا۔ ''کسی پر کیا جانے والا ظلم جب اللہ کو بہت ناپسند آئے تو وہ کوئی نہ کوئی نعمت واپس لے لیتا ہے۔''

پتا نہیں اُسے اپنے باپ کی یہ بات اس وقت کیوں یاد آئی تھی۔ تاجور نے جیسے خود کو ہی ڈانٹا۔ نہ وہ ظالم تھی نہ اُس سے کوئی نعمت چھینی گئی تھی۔ ایک کنویں کا پانی کڑوا ہو گیا تو ہزار کنویں کھودے جاسکتے تھے۔ پانی میں گڑ ملا کر میٹھا کیا جاسکتا تھا۔ اس نے جیسے خود کو تسلی دی تھی۔ اور اس پانی سے اپنا دھیان ہٹانے کی کوشش کی تھی جواب بھی آدھے گلاس میں اس کے سامنے پڑا تھا۔

☆☆☆

پورے گاؤں نے اگلے کئی دن گامو اور اللہ وسائی کو گھر سے باہر نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی ان کے گھر کا دروازہ کھلا تھا۔ آس پڑوس والے ہمدردی اور حال احوال پوچھنے کے لیے دروازہ بجاتے رہتے پر وہ دونوں اندر سے ہی نہ ملنے کا کہہ دیتے تھے۔ ان گاؤں والوں سے وہ کیا ملتے جو اس بارات میں لٹائے جانے والے سکے لوٹتے رہے تھے جس میں ان کی عزت کا جنازہ نکلا تھا۔

گامو اور اللہ وسائی نے ساری زندگی ان لوگوں کی خدمت کی تھی۔ ان کی غمی خوشی میں آگے بڑھ چڑھ کر حصہ ڈالا تھا پر ان میں سے کوئی اس وقت ان کی مدد کے لیے نہیں آیا تھا۔ ان میں سے بہتوں کو اندر خانے پتا تھا کہ وہ بارات گامو کے گھر نہیں آنی تھی۔ پھر بھی انہوں نے گامو کو پہلے کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ گامو اور اللہ وسائی کا غصہ بجا تھا پر انہیں یہ پتا نہیں تھا کہ وہ گاؤں والے نہیں تھے۔ ''دنیا'' تھی اور ''دنیا'' تماشا دیکھتی ہے تماشا روکتی نہیں۔

گامو نے اپنے گھر اور صحن میں گرنے والا ایک ایک سکہ اُٹھا کر کسی نجس چیز کی طرح باہر گلی میں اُچھالا تھا۔ وہ چوہدریوں کے گھر سے آنے والی چیز تھی اور گامو کو اب چوہدریوں کے گھر کا دانہ تک نہیں چاہیے تھا۔ سکہ تو الگ چیز تھی۔

گھر کے اندر دونوں میاں بیوی موتیا کے پاس بیٹھے رہتے جو اُسی حالت میں اب بھی تھی جس حالت میں اس بارات کے جانے کے بعد وہ گئی تھی۔ ماں باپ روتے، اُس کے منہ میں لقمے ڈالتے۔ پانی پلاتے۔ وہ چند لقمے لیتی، پانی پیتی پھر لیٹ جاتی پر چپ کا روزہ اس نے اب بھی نہیں توڑا تھا اور گامو اور اللہ وسائی تڑپ رہے تھے۔ وہ اُسے پکارتے اس سے باتیں کرتے رہتے۔ وہ چپ بیٹھی اُنہیں روتا بلکتا دیکھتی رہتی یوں جیسے وہ اس کے ماں باپ نہیں تھے یوں جیسے ان کے رونے سے اس کو غرض ہی نہیں تھی۔

''میں نے پیر صاحب کے پاس لے کر جانا ہے موتیا کو! میں نے اُنہیں دکھانا ہے کہ ان کے خاندان نے میری بیٹی کا کیا حال کیا ہے۔'' گامو نے ایک رات اللہ وسائی سے کہا تھا اور اس نے جواباً گامو سے کہا۔

''کوئی فائدہ نہیں گامو! کچھ نہیں ہوگا۔ انہوں نے اپنی پوتی بیاہ دی ہے چوہدریوں کے گھر۔ اُنہیں کیا پتا نہیں تھا کہ وہ میری موتیا کا نصیب تھا؟ اپنی موتیا کا نصیب چھیننے والوں سے میں موتیا کے حال کے لیے کیا دُعا کرواؤں۔'' اللہ وسائی غصے میں بولتے بولتے رونے لگی تھی۔

''دُعا نہیں کروانی اب میں نے اُن سے۔ کبھی کسی چیز کے لیے دُعا نہیں کروانی۔ پر شکایت تو کر کے آنی

pklibrary.com

ہے میں نے اللہ وسائی! اپنی بیٹی کی حالت تو دکھائی ہے میں نے اُنہیں۔" گاموا پنی بات پر مصر رہا تھا اور اللہ وسائی کو اس کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے تھے۔

اگلے دن گاؤں والوں نے بڑے دنوں کے بعد گامو کے گھر کا دروازہ کھلتے اور اُن تینوں کو گھر سے نکلتے دیکھا۔ گاموا اور اللہ وسائی کے درمیان اُن کا ہاتھ پکڑے چلتی موتیا کو کسی نے پہچانا ہی نہیں تھا۔ وہ دنوں میں جیسے سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی۔ گاؤں والوں نے راستہ روک کر گاموا اور اللہ وسائی سے افسوس کا اظہار کرنے کی کوشش کی تھی پر اُن دونوں میں سے کسی نے اُن کا "پرسہ" نہیں لیا تھا۔ تماش بینوں کی کیا ہمدردی اور کیا افسوس۔

گامو نے پیر ابراہیم کے ڈیرے پر جا کر صرف شکایت کا سوچا تھا۔ پر اُسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہاں جا کر وہ رو پڑے گا۔ پیر ابراہیم موتیا کی حالت دیکھ کر چپ کے چپ ہی رہ گئے تھے۔

"کمی کمین ہیں ہم پر انسان تو ہیں پیر صاحب! آپ کی بیٹی اور نواسے نے یہ حال کیا ہے میری بیٹی کا۔" گامو نے روتے ہوئے اُن سے سارا قصہ کھول کے رکھ دیا تھا۔

پیر ابراہیم کا دل لرز کر رہ گیا تھا۔ آج تک ان کے ڈیرے پر کوئی اُن سے اُن کے خاندان کے کسی فرد کی شکایت لے کر نہیں آیا تھا۔ اور اب آیا بھی تھا تو ان کی اکلوتی بیٹی تاجور کی شکایت کرنے۔ اس کے بیٹے کے خلاف مقدمہ لے کر اور ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ جواب میں کیا کہیں۔ تاجور نے ان سے غلط بیانی کی تھی۔ لیکن اس غلط بیانی کے ساتھ اس نے جو کچھ گامو کے ساتھ کیا تھا۔ وہ انہیں ہولا رہا تھا۔ یہ ایسا بدلہ، ایسا انتقام ایسا غصہ کہاں سے لے لیا تھا اس سیدزادی کی بیٹی نے جس کی ماں سے بڑا نرم دل کوئی تھا ہی نہیں۔

"آپ دعا کریں ہمارے لیے کہ جنہوں نے ہم پر ظلم کیا، وہ تباہ و برباد ہوں...... اُن کی اگلی نسلیں ختم ہو جائیں۔ ہم بدلہ نہیں لے سکتے اُن سے۔ اللہ بدلہ لے!"

اللہ وسائی نے پیر ابراہیم سے کہا تھا اور پیر ابراہیم ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکے تھے۔ وہ ظالموں کو پہچانتے تھے۔ وہ اُن کا خون تھے، اُن کی نسل تھے۔ اپنی نسل کو خود ختم ہو جانے کی بددعا وہ کیسے دیتے؟ گامو جانتا تھا پھر بھی اصرار کر رہا تھا۔ وہ جیسے اُن کی ولایت کو چیلنج کر رہا تھا۔ اُن کے ڈیرے پر بیٹھے لوگوں کے سامنے اُس نے پیر ابراہیم کو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا تھا۔ اُنہیں کٹہرے میں کھڑا ہو کر انصاف کرنا تھا۔

ایک لمبی خاموشی کے بعد پیر ابراہیم اپنی جگہ سے اُٹھے تھے اور وہ موتیا کے سامنے گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گئے تھے۔ اپنے ہاتھ جوڑتے ہوئے انہوں نے موتیا سے کہا۔

"میری بیٹی اور اُس کے خاندان کو بددعا نہ دینا موتیا۔" وہ موتیا کے سامنے گڑگڑائے تھے۔

وہاں بیٹھے اُن کے مرید ساکت تھے۔ پیر ابراہیم کو اس حالت میں انہوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سر جھکائے بیٹھی موتیا نے سر اُٹھا کر پیر ابراہیم کو دیکھا تھا اور دیکھتی ہی رہی تھی۔

پیر ابراہیم کے پاس ولایت، عبادت اور ریاضت سے آئی تھی۔ سامنے بیٹھی ہوئی موتیا کے پاس وہ نہیں تھی۔ پیر ابراہیم پھر بھی اُس سے خوف زدہ تھے۔ وہ ٹوٹا ہوا دل تھا جسے سنبھالنے رب آ گیا تھا اور پیر ابراہیم مظلوم کی آہ سے کیسے نہ ڈرتے۔

لوگ اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے سے ڈرتے تھے۔ اور پیر ابراہیم کے لیے اس وقت موتیا کی آنکھوں میں دیکھنا مشکل ہو گیا تھا۔

گاموا اور اللہ وسائی پیر ابراہیم کے بندھے ہوئے ہاتھ اور جھکا ہوا سر دیکھتے رہے اور پھر بے حد شکست خوردہ انداز میں وہ موتیا کا ہاتھ پکڑ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ اُن کے پاس مزید کہنے کو کچھ بھی نہیں تھا یہ بھی نہیں کہ انہوں نے چوہدریوں کو معاف کیا، یہ بھی نہیں کہ اُنہیں پیر ابراہیم سے اب کوئی گلہ نہیں۔

pklibrary.com

پیر ابراہیم کے ڈیرے کے باہر اُس دن پہلی بار ماہ نور نے موتیا کو دیکھا تھا۔ وہ نئی دُلہن کی طرح بجی سنوری ملازمہ کے ساتھ ڈیرے کے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ اور موتیا اپنے ماں باپ کے ہاتھ پکڑے سیڑھیاں اُتر رہی تھی۔ سیڑھیاں اُترتے ہوئے اُس نے سر اُٹھا کر ماہ نور کو دیکھا تھا اور جیسے اُس کی نظریں ماہ نور پر جم ہی گئی تھیں پر ماہ نور کی نظریں بھی اُس سے اُلجھی تھیں۔ گاموا اور اللہ وسائی نے ماہ نور کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ بس اپنی بیٹی کے ہاتھ تھامے احتیاط سے اُسے سیڑھیاں اُتارتے رہے۔ ماہ نور نے سیڑھیاں چڑھنے سے پہلے ایک نظر پلٹ کر دور جاتی موتیا کو دیکھا تھا اور پھر ملازمہ سے پوچھا۔

''یہ کون تھی؟''

''موتیا تھی باجی...... گاموا اور اللہ وسائی کے ساتھ...... لوگ کہتے ہیں، یہ شیدائن ہوگئی ہے۔''

اُس کے ساتھ حویلی سے آئی ملازمہ نے بڑے افسوس والے انداز میں اُسے بتایا تھا اور ماہ نور جیسے سکتے میں آگئی تھی۔ اُس نے بے یقینی کے عالم میں پلٹ کر دور جاتی ہوئی اپنی اُس رقیب کو دیکھا تھا۔ جس کے پاس اُس کے سر کے تاج کا دل تھا۔

''اُسے کیا ہوا ہے؟'' اُس نے ملازمہ سے پوچھا۔ ملازمہ کی آنکھوں اور چہرے پر عجیب سا تاثر آیا پھر اُس نے نظریں چرا کر کہا۔

''مجھے نہیں پتا باجی جی۔'' ماہ نور نے وہاں کھڑے آتے جاتے لوگوں کے درمیان اُس سے مزید کچھ نہیں پوچھا۔

اُس نے آج وہ موتیا دیکھ لی تھی جس کے حسن کے قصے اُس نے کئیوں سے سنے تھے اور عشق کی داستانیں اُس نے مراد کی شکل میں دیکھ لی تھیں۔ اُسے اس لٹی پٹی موتیا سے حسد نہیں ہوا تھا لیکن اُسے اس پر ترس بھی نہیں آیا تھا۔ ملازمہ کے گونگا ہو جانے پر بھی اُسے اندازہ تھا موتیا کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ اُس سے مراد چھن گیا تھا اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوگئی تھی اور وہ...... اُسے مراد مل گیا تھا اور وہ تب بھی ویسی ہی کنگال تھی۔

☆☆☆

''ابا جی! مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں آپ؟'' تاجور نے باپ سے بالآخر پوچھا تھا، جس نے پہلی بار اُس کے آنے پر اُٹھ کر اُس کا استقبال کیا تھا نہ اُس کا سر ماتھا چوما تھا۔

انہوں نے صرف بیٹھے بیٹھے اُس کے سلام کا جواب دیا تھا اور پھر تسبیح کے دانے گراتے ہوئے بس اُسے دیکھنے لگے تھے اور اُس کے دیکھنے کے انداز نے تاجور کو پریشان کر دیا تھا۔ وہ بیٹے اور بہو کے ساتھ اُن سے ملنے آئی تھی مگر مراد اُنہیں چھوڑ کر واپس چلا گیا تھا اور تاجور کے اصرار پر بھی رُکا نہیں تھا اور اب تاجور اکیلے کمرے میں بیٹھی اپنے باپ کی کاٹ دار نظروں کا سامنا کر رہی تھی۔

''تو نے تاجور! آج میرا سر اُن کے سامنے نیچا کر دیا جو ہمارے پاس دُعائیں کروانے آتے ہیں۔ تو نے آج مجھے اُن کے سامنے ہاتھ جوڑنے پر مجبور کر دیا۔'' پیر ابراہیم بالآخر لمبی خاموشی کے بعد بولے تھے۔

تاجور کا ماتھا ٹھنک گیا تھا۔ نام نہ لینے کے باوجود جیسے اُسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کس کی بات کر رہے تھے وہ اور بے چین ہوئی تھی، اُس کے باپ نے آخر ان کے سامنے کیوں ہاتھ باندھے تھے کس لیے۔ اُس کا خون کھولنے لگا تھا۔ اُن کی جرأت کیسے ہوئی کہ وہ اُس کے باپ کے پاس اُس کی شکایت لے کر پہنچے تھے۔

''آپ کس کی بات کر رہے ہیں بابا جان؟'' اُس نے بظاہر انجان بننے کی کوشش کی تھی۔

''میں موتیا کی بات کر رہا ہوں۔ اُس کے ماں باپ لائے تھے اُسے میرے پاس اور جو کچھ تم نے کیا ہے، وہ دہرایا تھا انہوں نے میرے سامنے۔ یہ اتنا سخت دل تو نے کہاں سے لے لیا تاجور؟'' پیر ابراہیم نے دل گرفتگی

سے کہا۔
"اُن کی جرأت کیسے ہوئی کہ وہ آپ کے پاس آ کر میری شکایت کریں!" تاجور غضب ناک ہوئی تھی اور پیر ابراہیم نے کہا تھا۔
"یہ گھمنڈ، تکبر تجھے تباہ کر دے گا تاجور! تیرے خاندان کو تباہ کر دے گا۔"
"بابا جان! آپ اُن لوگوں کی حمایت نہ کریں! آپ ہمیشہ میرے خلاف اُن کی حمایت کرتے ہیں۔" اُس نے اُسی بدتمیزی سے کہا تھا۔
"تیرے خلاف نہیں کھڑا...... ظالم کے خلاف کھڑا ہوں۔" تاجور ایک لمحہ کے لیے بول نہیں سکی پھر جیسے شعلہ جوالہ بن کر بولی۔
"بابا جان میں ظالم ہوں؟ ظلم اُس کی بیٹی نے کیا میرے بیٹے کو ورغلایا، باغی بنایا، مجھ سے چھیننے کی کوشش کی! اور ظالم میں ہوں؟"
"تم تو کیوں بارات لے کر اُن کو ذلیل کرنے اُن کی گلی سے گزری تھی؟ مجھے اگر اُس دن پتا چل جاتا کہ تو بارات اُن کے گھر کے سامنے سے گزار کر لائی ہے تو میں ماہ نور کے بجائے موتیا کا نکاح ہی پڑھاتا مراد کے ساتھ۔"
تاجور یک دم اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔
"آپ کیا چاہتے ہیں مجھ سے اب؟"
"تو جا کر موتیا کے سامنے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ۔ میرے جڑے ہوئے ہاتھوں پر انہوں نے مجھے معاف نہیں کیا۔" تاجور کا دماغ گھوم گیا۔
"بابا جان! میں اور کمی کمینوں کے سامنے جا کر ہاتھ جوڑوں، یہ کبھی نہیں ہوسکتا۔"
"تیرا غرور میرے خاندان کی گدی لے جائے گا تاجور!" تاجور نے باپ کا چہرہ بے یقینی سے دیکھا۔ وہ بہت بڑا جملہ بول رہے تھے۔
"گدی ہمارے خاندان سے نکلے گی تو کہاں جائے گی ولایت؟ اُس ماشکی کی بیٹی کے پاس؟" تاجور نے باپ کا مذاق اُڑایا تھا۔
"آپ کا مطلب ہے آپ کے بجائے لوگ اُس کے آستانے پر آ کر دُعائیں مانگیں گے؟ ایسا نہیں ہوسکتا بابا جان آپ ولی ہوتے ہوئے بھی ایسی بات کررہے ہیں۔ آپ سے زیادہ تو میں جانتی ہوں روحانیت کو۔" تاجور نے کہا تھا۔
"تو روحانیت کو جانتی ہے، رب کو نہیں جانتی۔ تیرا غرور تاجور! تیرے خاندان کو کھا گیا۔" وہ کہتے ہوئے وہاں سے بے حد ناراضی کے عالم میں نکل گئے تھے اور وہ صدمے کی حالت میں وہاں کھڑی رہ گئی تھی۔
اُس کا باپ اس سے کیا کہہ کر گیا تھا اور اتنی بڑی بات...... تاجور کا دل کسی نے مٹھی میں مسلا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے اُسے ہیبت آئی تھی مگر پھر اُس کی ضد اور غرور نے اُسے آکٹوپس کی طرح اپنے شکنجے میں لے لیا۔
"کسی کمی کمین کے سامنے تاجور نہیں جھکے گی بابا جان۔" اُس نے جیسے دل میں فیصلہ کرلیا تھا۔

☆☆☆

"آج میں نے موتیا کو دیکھا۔" اپنے کمرے میں جوتے اُتارتے مراد کو جیسے کرنٹ لگا تھا۔
اُس نے برق رفتاری سے پلٹ کر ماہ نور کو دیکھا جو سنگھار میز کے سامنے بیٹھی ہوئی اپنے زیورات اتارتے ہوئے آئینے میں مراد کو دیکھ رہی تھی۔ اُس کا خیال تھا مراد اب اُس سے پوچھے گا کہ کہاں یا ناراض ہو کر کہے گا کہ

pklibrary.com

کیوں۔ مراد نے دونوں میں سے کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ اُس نے لحظہ بھر کے لیے ماہ نور کو دیکھ کر دوبارہ اپنے جوتے اتارنے شروع کردیے تھے۔

"وہ بیمار لگ رہی تھی۔ داداجان کے پاس دُعا کروانے آئی تھی۔" ماہ نور پھر بھی کہے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

مراد پھر ٹھٹکا تھا پر اس بار اس نے ماہ نور کو پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ ماہ نور کو حیرت ہوئی۔ محبوبہ کا ذکر ہوا اور عاشق اتنا بے نیاز۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا وہ مزید کیا کہے، اس کی مشکل مراد نے آسان کردی تھی۔

"آج پہلی اور آخری بار موتیا کا نام تمہاری زبان پر آیا ہے۔ دوبارہ کبھی میرے سامنے موتیا کا نام بھی مت لینا۔"

جوتے اُتارنے کے بعد وہ اُٹھ کر کھڑا ہوا تھا اور سرد مہری کے ساتھ اس سے کہتے ہوئے کمرے کے ساتھ ملحقہ باتھ روم میں چلا گیا تھا۔

"میں نام نہ لوں اور تم نام کا کلمہ پڑھتے رہو" ماہ نور مدھم آواز میں بڑبڑائی تھی۔

اُسے لگا تھا۔ مراد نے کسی مکھی کی طرح اُسے اپنے اور موتیا کے بیچ سے نکال دیا تھا۔ پر وہ کیڑا مکوڑا نہیں تھی۔ وہ انسان تھی جلنے بجھنے والا، غم کرنے والا، یاد رکھنے والا، کھوجنے والا...... کیا ہوا تھا مراد اور موتیا کے بیچ کہ مراد نے اُسے اپنی زندگی سے نکال پھینکا تھا اور صرف نکالا نہیں تھا کسی اور کو اُس کی جگہ بھی دے دی تھی۔ ماہ نور کو اب یہ کھوجنا تھا اور ہر قیمت پر کھوجنا تھا۔

☆☆☆

مراد چند دنوں بعد واپس انگلینڈ چلا گیا تھا اُسے اپنی ڈگری مکمل کرنی تھی۔ واپسی کے سفر میں تانگے میں بیٹھے اُسے اپنے آنے کا سفر یاد آیا تھا جو اُس نے برستی بارش میں تانگے پر "کسی" کے ساتھ کیا تھا کسی سے بے خبر بیٹھے...... اُسے موتیا کے بارے میں کچھ خبر نہیں تھی، وہ کیسی تھی، کیسی نہیں۔ کیا کر رہی تھی کیا نہیں۔ اُس کا خیال تھا وہ واپس شہر چلی گئی ہوگی، اپنی میڈیکل کی تعلیم پوری کرنے۔

پر موتیا واپس شہر ڈگری کے لیے نہیں جا سکی تھی۔ گاموا ور اللہ وسائی اُسے علاج کے لئے شہر، گاؤں، ہر جگہ لے کر پھرتے رہے۔ کہیں سے شفا مل جاتی کہیں سے اُس کی زبان کا تالا کھل جاتا۔ وہ پہلے کی طرح ہنستی۔ اُن کی زندگی میں رونق واپس آجاتی۔

کسی ڈاکٹر، حکیم، پیر کو موتیا کی بیماری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ کوئی موتیا کو شفایاب نہیں کرسکا تھا۔ وہ طوفان گاموا ور اللہ وسائی کی پوری زندگی تباہ و برباد کر کے چلا گیا تھا۔

گاموا اب نہ گاؤں والوں کو پانی پلاتا تھا نہ چوہدریوں سے دانے لیتا تھا۔ وہ ریلوے اسٹیشن پر قلی کا کام کرنے لگا تھا۔ بوجھ اُٹھانا، کسی کے رزق کا احسان اٹھانے سے بہتر تھا۔ جو کچھ وہ کما کر لاتا۔ وہ موتیا کے علاج پر خرچ ہو جاتا۔ گاموا اب حق باہو کا کلام بھی نہیں پڑھتا تھا۔ وہ جب پڑھنے لگتا تو اُس کے گلے کو پھندا لگ جاتا تھا۔ وہ زار زار روتا۔

"یا اللہ اولاد نہ دیتا، خالی گود رکھتا یا اس بڑھاپے میں اولاد کا غم نہ دیتا۔"

اُس نے اب اپنے گناہوں کی معافی مانگنا بھی چھوڑ دی تھی۔ توبہ کرنی بھی چھوڑ دی تھی۔ اُسے لگتا تھا، وہ اب اتنا گناہ گار ہو چکا ہے کہ کچھ بھی کر لیتا اُس کی بخشش نہیں ہونی تھی۔ اُس کو اللہ اگر بخشش اور موتیا کی صحت میں سے کوئی ایک چیز چننے کے لئے کہتا تو گاموا آنکھیں بند کر کے موتیا کی صحت چن لیتا۔ پر اُس کو اللہ نے زندگی میں کوئی انتخاب کا حق دیا ہی نہیں تھا یا کم سے کم گاموا کو یہی لگتا تھا۔

چوہدریوں کے گھر نئے مہمان کی خوش خبری تھی اور یہ خبر پورے گاؤں کے ساتھ گاموا ور اللہ وسائی کے گھر

pklibrary.com

بھی پہنچی تھی اور اس خبر نے گامو اور اللہ وسائی کو اور غمگین کر دیا تھا۔

چوہدریوں نے ظلم کیا تھا پھر بھی وہاں سب کچھ ٹھیک تھا اور وہ موتیا کا علاج کراتے کراتے بھی تھک گئے تھے۔ وہ دونوں میاں بیوی اب ایک دوسرے سے بھی بات نہیں کرتے تھے بس وہاں بیٹھے موتیا کو دیکھتے رہتے جہاں وہ بیٹھی رہتی۔

اُن کے گھر اب خاموشی اور سناٹا گونجتا تھا۔ نہ اللہ وسائی گھر سجاتی تھی، نہ فرش لیپتی تھی نہ چادریں کاڑھتی تھی۔ اُس گھر میں صرف موتیا گونگی نہیں ہوئی تھی اُس کے ماں باپ بھی ہو گئے تھے جن کی سانسیں موتیا کے دم سے چلتی تھیں۔ اور اُس گھر میں جو کچھ ہو رہا تھا۔ اس کی خبریں حویلی بھی پہنچتی تھیں۔

گاؤں کی عورتیں تاجور کو موتیا کی حالت کے بارے میں بتایا کرتی تھیں اور تاجور انہیں توبہ کرنے کے لیے کہا کرتی تھی۔ وہ بہانگ دہل کہا کرتی کہ یہ سب کے لیے عبرت کا مقام ہے۔ اپنی اوقات سے اونچے خواب دیکھنے کا نتیجہ۔

عورتیں اس کی ہاں میں ہاں ملاتی تھیں پھر بعد میں اس کی بُرائی بھی کرتیں۔ تاجور کے علاوہ اس گاؤں میں کوئی ایسا نہیں تھا، جو موتیا کے ساتھ یہ سب ہونے پر خوش ہوتا۔ گاؤں کے مرد چوہدری شجاع کو بھی گامو کے حالات سے آگاہ کرتے رہتے۔

چوہدری شجاع نے چند بار گامو کو حویلی بلانے کی کوشش کی۔ وہ اُس کی مدد کرنا چاہتا تھا تا کہ موتیا کا علاج ہو سکے مگر گامو اس کے لاکھ بلاووں پر بھی حویلی نہیں آیا۔ وہ رستے میں بھی کہیں چوہدری کو دیکھ لیتا تو راستہ بدل لیتا آمنا سامنا ہی نہ ہوتا۔

چوہدری شجاع کو گامو اور موتیا کے حوالے سے رنج تھا مگر وہ اب اس کی تلافی کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ چند بار اُس نے حویلی سے گامو کے لئے اناج بھیجا۔ وہ اناج گامو نے اُسی طرح واپس بھیج دیا۔

چوہدری شجاع بھی پیر ابراہیم کی طرح تاجور کو سمجھانے سے قاصر تھا۔ جو آج بھی موتیا سے شدید نفرت کرتی تھی کیونکہ اس کا خیال تھا کہ موتیا کی وجہ سے اُس کے گھر میں دراڑیں پڑ گئی تھیں۔ زندگی میں پہلی بار اُس کا باپ اور شوہر اس سے ناراض ہوئے تھے اور انہوں نے اسے بُرا کہا تھا۔

چوہدری مراد کے گھر آنے والے نئے مہمان کی خوشخبری نے یک دم حویلی میں ہر ایک کی توجہ ہٹا دی تھی۔ موتیا کے حوالے سے ہونے والی وہ بحث جو اکثر اوقات چوہدری شجاع اور تاجور کے درمیان رہتی تھی، وہ یک دم بند ہو گئی تھی۔ چوہدری شجاع حویلی کی نئے سرے سے تزئین و آرائش کروانے لگا تھا کیونکہ یہ چوہدریوں کی اگلی نسل کا استقبال کرنے کی تیاری تھی۔

مراد کو بھی تاجور نے اسی خوشی اور جوش وخروش سے اس خوش خبری کے بارے میں بتایا تھا۔ اور پھر فون ماہ نور کو دے دیا تھا۔ مراد نے ماہ نور کو مبارک باد دی تھی اور اپنا خیال رکھنے کا کہا تھا۔

ماہ نور نے ہمیشہ کی طرح جی کہا تھا اور مراد کو اُس کے بعد اس سے کچھ کہنے کے لیے لفظ نہیں مل رہے تھے۔ اُس کے اور ماہ نور کے درمیان یہ ہمیشہ ہی ہوتا تھا۔ وہ چند دنوں بعد ماں باپ کی خیر خیریت پوچھنے کے لیے فون کرتا اور جب تاجور فون ماہ نور کو تھماتی تو اُسے دوسرے سے تیسرا جملہ نہ آتا۔ ماہ نور اس سے کچھ بھی سننے کے لئے ترس گئی تھی۔

وہ اتنے فاصلے پر تھا کہ وہ اس سے شکایت بھی نہیں کر سکتی تھی کیونکہ وہ بہت مختصر وقت کے لیے فون کرتا تھا۔ پر ماہ نور وہ ساری شکایتیں تاجور سے کرتی تھی جو ہر وقت اس سے یہی کہتی کہ اولاد ہوتے ہی سب ٹھیک ہو جائے گا اور اب اولاد کی خوش خبری بھی ملی مراد کی چپ اب بھی نہیں ٹوٹی تھی۔

pklibrary.com

ماہ نور بددل ہوئی تھی۔ کچھ دور بیٹھی اُسے خاموشی سے فون کان سے لگائے دیکھتے ہوئے تاجور نے خوشی خوشی شوہر سے کہا تھا۔

"دیکھا اولاد کی خوش خبری سنتے ہی کتنی لمبی باتیں کرنے لگا ہے اُس سے کب سے فون کان سے لگائے بیٹھی ہے۔"

چوہدری شجاع نے مسکراتے ہوئے ایک نظر دور بیٹھی ماہ نور کو دیکھا تھا جو فون کان سے لگائے دوسری طرف کی طویل خاموشی میں کسی لفظ کی آہٹ کھوجنے کی جستجو کر رہی تھی، پر مراد چپ تھا۔

اپنے کمرے کی کھڑکی کے باہر ہوتی بارش کو دیکھتے ہوئے اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک بار پھر موتیا کی پرچھائیں لہرانے لگی تھی۔ اور یہ دن اور رات میں کئی بار ہوتا تھا۔ وہ یہاں آکر اُسے زیادہ یاد آنے لگی تھی جہاں اُس کے آس پاس نہ اس کے ماں باپ تھے نہ ماہ نور پردہ ہوتی تھی۔

مراد کو کئی بار لگتا تھا وہ بے غیرت تھا ورنہ کوئی کسی بے وفا کے لیے تو یوں نہ تڑپتا۔ وہ بار بار اپنے سامنے وہ رات لاکر کھڑی کر لیتا جب اس نے موتیا کے ساتھ سعید کو دیکھا تھا۔ اور ہر بار غصے سے پاگل ہو جانے کے بعد اُسے یقین ہوتا کہ "وہ" اب تو کبھی یاد آئے گی ہی نہیں پر وہ پھر آکر سامنے کھڑی ہو جاتی۔ پانی پیتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیتی۔ کھانا کھاتے ہوئے اس کے منہ میں لقمے ڈالنے لگتی۔ وہ کوئی پھول دیکھتا تو اُسے موتیا یاد آتی، وہ کوئی خوشبو لگاتا تو وہ خوشبو موتیا کی خوشبو میں بدل جاتی۔

"کچھ وقت گزرے گا پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ بار بار خود کو تسلی دیتا۔

جو پوری دُنیا کے ساتھ ہوتا تھا، اُسے یقین تھا کہ اُس کے ساتھ بھی وہی ہوگا۔ وقت سب کچھ بھلا دے گا بس کچھ وقت لگے گا۔ اور دل اس کی ساری تاویلیں اور بہانے سنتے ہوئے بس ایک ہی بات پوچھتا رہتا۔

"کتنا وقت؟...... چند ہفتے، مہینے، سال۔"

مراد دل کی بات کا کیا جواب دیتا جو ایک طرف اس کو بھول جانے کی مدت پوچھتا تھا دوسری طرف اس سے جدائی کی ساعتیں گنتا رہتا تھا۔

☆☆☆

"بتول تو اب آئی ہے تو کسی دن میرے ساتھ چل موتیا سے ملنے چلتے ہیں۔" شکوراں نے بتول سے کہا تھا جو اُس کے پاس کئی مہینوں بعد رہنے کے لیے آئی تھی۔

"میں ایک آدھ بار گئی ہوں ان کی طرف پر مجھ سے تو ملتی ہی نہیں اللہ وسائی۔ مجھے پھر بھی بڑا ترس آتا ہے ان پر...... جوان بیٹی پاگل ہو جائے تو اس کا غم بہت بھاری ہوتا ہے اور بیٹی بھی موتیا جیسی۔" بتول شکوراں کی باتیں سن رہی تھی پھر پاگل کے لفظ پر جیسے چونکی تھی۔

"کس نے کہا کہ پاگل ہوگئی؟"

"ڈاکٹروں نے...... گاموشہر لے کر گیا تھا اُسے پر شہر کے ڈاکٹروں کو سمجھ ہی نہیں آئی اس کی بیماری۔ انہوں نے کہا کہ پاگل ہوگئی ہے، اسے اب کچھ یاد نہیں...... یادداشت ختم ہوگئی ہے اس کی۔" شکوراں نے گاؤں میں سنی سنائی باتیں بیٹی کو بھی سنا دی تھیں اور وہ اب بے قراری کے عالم میں اپنی انگلیاں چٹخانے لگی تھی۔

"پاگل کیسے ہوسکتی ہے اماں؟ موتیا تو......" اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ماں کو اُس کے پاگل نہ ہونے کی کیا دلیل دے۔

"ہو جاتا ہے بندہ پاگل، جب کوئی دھوکا دے دے۔ پاگل ہونے کے لیے کون سی لکھت پڑھت کرنی پڑتی ہے۔" شکوراں کا سادہ سے لہجے میں کہا گیا جملہ تیر کی طرح بتول کے دل پر لگا تھا۔

"دھوکا تو اُسی نے دیا تھا اُسے پر اُسے یہ پتا تو نہیں تھا کہ موتیا اس غم کو اس طرح......" بتول سوچتی اور انگلیاں چٹخاتی رہی۔

"اور بتول! تو نے کسی ڈاکٹر کو دکھانا تھا سعید کے ساتھ اتنی بار تو شہر گئی ہے تو۔ کوئی خوش خبری آ جاتی تیری بھی۔ اتنے مہینے ہو گئے ہیں۔ اب تو گاؤں والے پوچھتے ہیں مجھ سے۔ تیرے ساتھ ہی شادی ہوئی تھی ماہ نور بی بی کی اور کتنی جلدی گود ہری ہو گئی ہے۔" شکوراں نے اچانک ہی موضوع بدلا اور بتول بُری طرح چڑی۔

"بس کر اماں! ساس اور سسرال والوں نے بھی جان کھائی ہوئی ہے میری یہی کہہ کہہ کے۔ اب نہیں ہو رہا بچہ تو میں کیا کروں۔" وہ بڑے غصے میں ماں سے کہہ کر صحن سے اُٹھ کر چلی گئی اور جیسے شکوراں کو فکر مند کر گئی۔

☆☆☆

"پھوپھو! مجھے اپنے کمرے میں رات کو موتیا کی خوشبو آتی ہے۔ مجھے بڑا ڈر لگتا ہے۔" ماہ نور کے حمل کے آخری مہینے چل رہے تھے جب ایک صبح اُس نے بڑی پریشانی سے تاجور کو بتایا تھا۔ تاجور پریشان ہو گئی۔

"مجھے کیوں نہیں بتایا تو نے پہلے، میں تیرے ساتھ سو جاتی رات کو۔"

"بس ایسے ہی پھوپھو۔ میں نے سوچا وہم ہو گا میرا، پر وہم نہیں ہے۔" ماہ نور نے اُس سے کہا۔

"بیٹا وہم ہی ہو گا۔ اس حالت میں عورتوں کو عجیب عجیب خوشبوئیں آنے لگتی ہیں پر میں آج سے تمہارے ساتھ سویا کروں گی کمرے میں اور ساتھ پڑھائی بھی کروں گی۔ تم دیکھنا۔ کچھ نہیں ہو گا وہم ہی نکلے گا تمہارا۔" تاجور نے اُسے تسلی دی تھی اور ماہ نور نے مطمئن نظر آنے کی کوشش کی تھی۔

تاجور اُس رات اُس کے ساتھ سوئی تھی اور آدھی رات کو وہ گہری نیند میں تھی جب ماہ نور نے اُس کا کندھا ہلا کر اُسے جگایا تھا۔ تاجور نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دی تھیں لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ماہ نور نے اُسے کیوں جگایا تھا۔

"پھوپھو! موتیا کی خوشبو آ رہی ہے! آپ کو آ رہی ہے؟" تاجور نے کہنے کی کوشش کی تھی کہ وہاں کوئی خوشبو نہیں تھی اور وہ ماہ نور کا وہم تھا پر یہ کہنے کے لیے منہ کھولتے ہی تاجور نے موتیا کی خوشبو محسوس کی تھی۔ ماہ نور ٹھیک کہہ رہی تھی۔ کمرے میں موتیا کی خوشبو آ رہی تھی۔ تاجور اُٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ نیند جیسے دم کسی بھوت کی طرح غائب ہو گئی تھی۔

"کہاں سے آ رہی ہے یہ خوشبو؟" تاجور نے عجیب بڑبڑانے والے انداز میں کہا تھا اور ماہ نور کو دیکھا تھا۔ جس کے چہرے پر خوف تھا۔ تاجور نے اُٹھ کر سردی میں بھی کمرے کی کھڑکیاں کھولنے کی کوشش کی تھی۔

"ابھی ہوا بھرے گی تو ٹھیک ہو جائے گا کمرہ۔" تاجور نے ماہ نور کو جیسے تسلی دینے والے انداز میں کہا تھا۔ ماہ نور نے جواباً تاجور سے کہا۔

"پھوپھو خوشبو اور بڑھ گئی ہے۔" تاجور نے ایک گہرا سانس لے کر جیسے ہوا کو سونگھنے کی کوشش کی تھی۔ موتیا کی خوشبو اب واقعی تیز ہو گئی تھی۔ تاجور نے کھڑکیوں کے باہر جھانکنے کی کوشش کی۔ اُسے لگا شاید وہاں کوئی موتیا کے پودے ہوں گے۔ وہاں کوئی پودا نہیں تھا۔

"پھوپھو! موتیا کے پھول اس موسم میں نہیں نکلتے۔" اس نے عقب میں ماہ نور کی آواز سنی تھی اور پلٹ کر اس کو دیکھا تھا۔ ہاں وہ تو یہ بھول ہی گئی تھی۔

"لوگ کہتے ہیں، موتیا پاگل ہو گئی ہے مگر مجھے پورا یقین ہے وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ بیٹھی جادو ٹونا کر رہی ہے ہم پر۔" تاجور نے طیش کے عالم میں کہا تھا۔ اُس کے ذہن میں جادو ٹونے کے علاوہ کسی چیز کا خیال

pklibrary.com

آ ہی نہیں آ سکتا تھا۔
"تو آج سے مراد کے کمرے میں نہیں سوئے گی ماہ نور...... میں تیرے لیے دوسرا کمرہ تیار کرواتی ہوں۔ اللہ ایسے حاسد اور بدفطرت لوگوں کو تباہ کرے جو میری اگلی نسل پر نظریں گاڑے بیٹھے ہیں۔" تاجور غضب کے عالم میں ماہ نور کا ہاتھ پکڑے مراد کے کمرے سے نکل گئی تھی۔ کمرہ اب بھی موتیا کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ سردیوں میں بھی وہاں موتیا کا راج تھا۔

☆☆☆

تاجور کو وہ خوشبو یاد رہی تھی اور جادو ٹونے کے حوالے سے اپنا وہم بھی۔ اُس نے مراد کا بیٹا پیدا ہونے پر گاؤں میں ڈھول والوں کے ساتھ مٹھائی کے ٹوکرے بھیج کر پورے گاؤں میں پھرنے کا اُنہیں کہا تھا اور اُنہیں خاص طور پر گامو کی گلی سے گزرنے کا کہا تھا۔
گامو کی گلی میں تقریباً ایک سال بعد وہ تماشا پھر دُہرایا گیا تھا۔ ڈھولوں کی تھاپ پر گھنگھرو باندھ کر ناچتے خواجہ سرا گاؤں والوں کو پکڑ پکڑ کر مٹھائیاں کھلاتے اور گانے گاتے رہے۔ جس میں چوہدریوں کی اگلی نسل کی زندگی اور عروج کی دُعائیں تھیں۔
گامو اللہ وسائی اور موتیا کے ساتھ اپنے گھر کے دروازے بند کر کے بیٹھا باہر سے آنے والی اُن آوازوں اور ڈھول تاشوں کو سنتا ہوا موتیا کا چہرہ دیکھتا رہا۔ وہ شور بڑی دیر تک اُن کے گھر کے باہر برپا رہا۔
"اللہ کے گھر انصاف نہیں ہے اللہ وسائی۔"
اس رات اس نے زندگی میں پہلی بار اللہ وسائی سے "کفر" کی بات کہی تھی اور اللہ وسائی اُسے جواباً یہ بھی نہیں کہہ سکی کہ گامو کفر نہ بول۔
"ہاں گامو...... یا پھر ہم ہی اتنے گناہ گار ہیں کہ اللہ کا انصاف ہمارے لیے یہی ہے۔" اُس نے جواباً گامو سے کہا تھا۔
"تو گناہ گاروں کو تو مر جانا چاہیے...... چل اللہ وسائی ہم مر جاتے ہیں۔" اللہ وسائی نے بے یقینی سے اُسے دیکھا تھا۔
"تو اور میں؟" اُس نے اب بھی شوہر سے یہ نہیں کہا تھا کہ تو کیسی باتیں کر رہا ہے۔
"نہیں موتیا بھی۔"
اللہ وسائی اور وہ ایک دوسرے کا چہرہ دیکھتے رہے پھر اللہ وسائی نے اُس سے کہا۔
"موتیا کو کون مارے گا؟" گامو اس کا چہرہ دیکھتا رہا پھر اُس نے کہا۔
"تُو!"

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

☆☆

pklibrary.com

"کومل! تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟"

عثمان نے گاڑی موڑتے ہوئے ایک نظر سنجیدہ بیٹھی بیوی پر ڈالی جو شوہر کی بات سن کر جان بوجھ کر ان سنی کر رہی تھی کیونکہ اس بات کا تعلق اس کے سسرال سے تھا اور عام خواتین کی طرح اسے بھی سسرال کانٹے کی طرح ہی چبھتا تھا۔

"آپ حکم دیں۔ مجھے کیا کرنا ہے؟ میری رائے کی بھلا کیا اہمیت ہے؟؟"

کومل نے بظاہر نرم لہجے میں مگر لفظ چبا کر ادا کیے۔ عثمان گہری سانس لے کر رہ گیا۔

کومل کے اندر ابلتا لاوا نہ جانے اور کتنے دن

اس کے کان کے اندر انڈیلا جائے گا۔عثمان آنے والے وقت کا سوچ کر پریشان ہوگیا۔
"اپنی بہن کے بارے میں سوچ رہے ہیں ناں؟" کومل نے غصے سے پوچھا تو عثمان نے نفی میں سر ہلایا۔
"تمہارے غصے کے بارے میں سوچ کر پریشان ہو رہا ہوں۔نازش کا غصہ جب تک تم مجھ پر نہیں نکالو گی، تمہارا موڈ اور گھر کا ماحول خراب ہی رہے گا۔" عثمان نے بے زاری سے کہا۔
"ہاں جی اس میں بھی سب غلطی میری ہی ہو گی۔آپ کی غریب بہن تو بہت مظلوم ہے۔" کومل حسب عادت غصے میں بڑبڑانے لگی۔
"کومل تم بات کو غلط سمت میں لے کر جا رہی ہو۔میں صرف اتنا کہہ رہا ہوں کہ تمہارے غصے کی وجہ سے ہمارے دونوں بچے ڈسٹرب ہوتے ہیں۔اگر تم نے نازش کی مدد نہیں کرنی ہے تو مت کرو مگر بات آرام سے بھی تو کی جاسکتی ہے ناں؟"
عثمان نے حسب معمول نرمی سے سمجھایا۔کومل نے سر جھٹکا۔سامنے اسکول کی شان دار عمارت تھی جہاں وہ پچھلے دس سال سے ایڈمن کے شعبے میں کام کر رہی تھی۔اس کی اچھی ساکھ تھی اور اسکول کی پرانی ساتھی ہونے کی وجہ سے اس کی بات کی بہت اہمیت تھی۔
"بہر حال! اسکول میں میری ایک پہچان اور نام ہے۔آپ نازش کو اپنے لفظوں میں سمجھا دیجیے گا۔" کومل نے منہ بنا کر کہا اور شولڈر بیگ پکڑ کر نیچے اترنے لگی۔
"نازش میری اکلوتی اور چھوٹی بہن ہے۔میں اسے منع نہیں کر سکتا۔وہ کچھ دنوں میں اسکول کا چکر لگائے گی۔تم تحمل سے بات سن لینا۔پلیز میری خاطر۔۔۔!"
عثمان نے مان سے کہا تو کومل نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
عثمان بے ساختہ مسکرایا۔کومل بھی چہرے پر ہلکی مسکراہٹ سجائے گاڑی سے نیچے اتری۔اسکول کے اندر قدم رکھتے ہی اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہوگئی اور وہ بڑبڑانے لگی۔
"کیا ہوا مس کومل! آج میاں صاحب سے لڑائی تو نہیں ہوگئی؟"
کومل کی کولیگ اور بے تکلف ساتھی روبینہ نے پاس آتے ہوئے کہا۔وہ کومل کو گاڑی سے نیچے اترتا دیکھ چکی تھی۔
"ایسا نہیں ہے۔بس سسرال کے مسئلے۔آپ سنائیں۔سب ٹھیک ہے۔"
کومل نے ہلکی مسکراہٹ چہرے پر سجا کر کہا۔
روبینہ کو اسکول جوائن کیے زیادہ وقت نہیں ہوا تھا۔وہ کوآرڈینیٹر کے طور پر کام کر رہی تھی۔اس لیے اکثر کومل سے ملاقات ہو جاتی جو دونوں کے درمیان اچھی دوستی کی وجہ بن گئی تھی۔
"مگر تم تو اکیلی رہتی ہو ناں؟ تمہارے ساس سسر تو حیات نہیں ہیں۔عثمان بھائی شاید اکیلے ہی ہیں۔" روبینہ نے جلدی سے یاد کرتے ہوئے کہا۔کومل نے شاید کبھی سرسری ساذکر کیا تھا مگر روبینہ کو یاد رہا۔کومل اس کی اچھی یادداشت سے متاثر ہوگئی۔
"عثمان سے چھوٹی ایک بہن ہے جو شادی شدہ ہے۔اسی کی وجہ سے پریشان ہوں۔زندگی مشکل کر دی ہے۔" کومل نے بے زاری سے کہا۔
"کیا بہت لڑاکا ہے؟" روبینہ نے پرتجسس انداز میں پوچھا۔
"ارے نہیں! اتنی جرات نہیں اس کی۔دراصل اس کی شادی تو میرے ساس سسر نے اپنے ہاتھوں سے کر دی تھی مگر خیر سے اس کے سسرال والوں نے رشتہ کرتے وقت کافی جھوٹ بولے۔لڑکے کی نوکری اور تنخواہ کے بارے میں غلط بیانی کی۔اب ایسا ہے کہ ان کی معمولی سی نوکری میں، اس کا تین بچوں کے ساتھ گزارا نہیں ہو رہا ہے۔" کومل نے مختصر لفظوں میں ساری کہانی سنائی تھی۔
روبینہ نے سمجھ کر سر ہلایا۔
"او اچھا! یعنی کہ وہ تم لوگوں سے مالی امداد مانگ رہی ہے۔" روبینہ نے سر ہلاتے ہوئے کہا تو

pklibrary.com

کومل نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
"ایسا نہیں ہے۔ اس نے کبھی مالی مدد نہیں مانگی۔ حالانکہ اس کے گھریلو حالات دیکھ کر ہمیں اندازہ تو ہو جاتا ہے مگر وہ اپنا بھرم قائم رکھتی ہے۔" کومل نے جلدی سے کہا۔
"پھر؟" روبینہ نے حیرانی سے پوچھا۔
"بس کیا بتاؤں۔ دراصل۔۔۔۔!" کومل نے مدھم آواز میں بتانا شروع کیا۔ روبینہ بہت غور سے سنتے ہوئے ایک دم چونکی تھی۔

☆☆☆

"بھائی! آپ نے کومل بھابھی سے بات کر لی؟" دوپہر میں نازش نے ڈرتے ڈرتے عثمان کو فون کیا۔ عثمان کے لہجے میں واضح بے زاری تھی۔
"دیکھو نازش! تم سمجھ دار ہو۔ جانتی ہو کہ گھر کے سکون کی کیا اہمیت ہے۔ کومل سے بات تو کر لی ہے مگر اس نے کافی برا منایا ہے۔ اس کے لیے یہ سب کرنا آسان نہیں ہے۔ بہر حال تم اسکول چلی جانا۔ وہ جو کر سکے کر دے گی۔" عثمان نے سخت انداز میں کہا۔
"جی میں سمجھ سکتی ہوں مگر!" نازش کے گلے میں آنسوؤں کا گولہ اٹک گیا تو بات ادھوری رہ گئی۔
"اگر تمہیں کچھ پیسوں کی ضرورت ہے تو میں دے دیتا ہوں میرے پاس زیادہ تو نہیں ہزار دو ہزار نکل ہی آئیں گے۔ دراصل مہنگائی بہت ہے اور پھر گھر کے خرچے۔۔۔!" عثمان نے جلدی سے کہا۔
"اللہ آپ کے رزق میں اضافہ کرے مگر اس کی ضرورت نہیں ہے۔"
نازش نے مدھم لہجے میں کہا تو عثمان نے جلدی سے کام کا بہانہ کر کے فون بند کر دیا۔ فون بند کر کے نازش نے رخسار پر بہتے آنسوؤں کو صاف کیا اور ایک نظر سادہ اور پرانے فرنیچر سے سجے چھوٹے سے لاونج پر ڈالی۔
یہ چھوٹا سا فلیٹ اس کے شوہر خاور کا واحد اثاثہ تھا مگر پچھلے کئی سالوں سے اس کی مرمت پر ایک پیسہ بھی خرچ نہیں ہوا۔ جس کی وجہ سے فلیٹ کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی گئی۔ جگہ جگہ اکھڑتا پلستر، لکڑی کے دروازے اپنی جگہ سے ہل چکے تھے۔ گھر میں چھوٹے چھوٹے کئی کام ہونے والے تھے مگر خاور کی معمولی تنخواہ میں تین چھوٹے بچوں کے ساتھ دو وقت کی روٹی پوری کرنا ہی مشکل تھا۔ اضافی کاموں کے لیے پیسے کہاں سے آتے؟
نازش جس نے والدین کے گھر بہت آرام اور سکون دیکھا تھا۔ شادی کے بارہ سالوں میں غربت کی چکی میں پستی، غربت کی سختی برداشت کرتے، لوگوں کے عجیب و غریب رویے دیکھتے ہوئے اسے ایسا لگتا تھا کہ زندگی میں کوئی امید، کوئی خوبصورتی نہیں ہے۔
اس نے خون کے رشتوں کی اتنی خود غرضی اور بے حسی دیکھ لی تھی کہ اسے نیکی اور اچھائی کی باتیں کسی اور دنیا کی لگتیں۔ ان دنوں وہ مایوسی کی انتہا پر کھڑی تھی۔ خاور سے لڑائی جھگڑے، بحث تکرار کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا کیونکہ وہ خود حالات کی وجہ سے مجبور تھا۔ کووڈ کے بعد کی صورتحال نے نوکری کے مسئلوں کو مزید بڑھا دیا تھا۔ خاور اپنی محدود تنخواہ میں صرف پیٹ کا ایندھن ہی بھر سکتا تھا۔
ان ہی مایوسی سے بھرے دنوں میں نازش کو اندھیرے میں امید کی چھوٹی سی کھڑکی نظر آئی جہاں سے تازہ ہوا آ رہی تھی، جو اس کی آخری سانس لیتی امید کو دوبارہ سے زندہ کر گئی۔ نازش خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی جب دس سالہ موحل نے نرمی سے ماں کا کندھا ہلایا۔ نازش نے خالی نگاہوں سے بیٹی کی طرف دیکھا۔
"امی! ارم بتا رہی ہے کہ ٹیچر نے میرا نام اسکول سے کاٹ دیا ہے۔ امی! ابو فیس کب دیں گے؟ میں اسکول کب جاؤں گی؟"
موحل نے پریشانی سے کہا۔ نازش خالی نگاہوں سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔ اس کی دس سالہ بیٹی نے اب تک کی معصوم عمر میں سوائے پریشانی، خوف اور بے عزتی کے کچھ نہیں دیکھا تھا۔ نازش بے بسی سے لب کاٹ کر رہ گئی۔
"ان شاء اللہ! بہت جلد۔ حیدر اور رائیل کہاں

pklibrary.com

ہیں؟" نازش نے آٹھ سالہ حیدر اور پانچ سالہ بیٹی کے بارے میں پوچھا تو موَمل نے مایوسی سے کمرے کی طرف اشارہ کیا اور واپس چلی گئی۔ نازش جانتی تھی کہ اس کے تینوں بچوں کو پڑھنے کا بہت شوق ہے مگر تینوں ہی فیس نہ ہونے کی وجہ سے اسکول نہیں جا سکتے تھے۔

"میں اپنے بچوں کی امید کو ٹوٹنے نہیں دوں گی۔" نازش نے پرعزم انداز میں سوچا اور کل اسکول جانے کے لیے الماری میں سے اپنا کوئی لباس منتخب کرنے لگی مگر اس کے پاس صرف تین جوڑے تھے اور تینوں کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ باہر پہن کر جائے جائیں۔ نازش چند لمحے خاموشی سے پیوندزدہ کپڑوں کو دیکھنے لگی۔

"اگر کام بن گیا تو روز کیسے جاؤں گی؟" نازش نے فکرمندی سے سوچا اور پھر اپنا ایک پرانا شیفون کا سوٹ نکالا جو اس کی ماں نے شادی میں دیا تھا جس پر دھاگے سے کڑھائی ہوئی تھی۔

"اتنی گرمی میں ریشمی سوٹ؟" نازش کے دل کو کچھ ہوا مگر وہ مجبور تھی۔ اس کے پاس تن ڈھانپنے کے لیے یہی ریشمی جوڑا ہی تھا۔ وہ بے دلی سے اگلی صبح کی تیاری کرنے لگی۔

☆☆☆

"سر رضوان بتا رہے ہیں کافی دیر سے ایک عورت تم سے ملنے کے لیے ویٹنگ روم میں بیٹھی ہوئی ہے۔"

روبینہ ٹھنڈے کمرے میں داخل ہوئی اور سر جھکائے کام کرتی کومل کو مخاطب کیا۔ کومل نے گہری سانس لی اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔

"تمہیں اس دن اپنی اکلوتی نند کے بارے میں بتایا تھا ناں! یہ وہ ہی ہے۔ جاب کے سلسلے میں آئی ہے۔" کومل نے بیزاری سے کہا۔

"اور کیا تم اس کی مدد کرو گی؟ ایسی بے وقوفی بھی مت کرنا۔ نند تو گھر میں برداشت نہیں ہوتی۔ اسکول میں کہاں کرو گی؟" روبینہ نے جلدی سے کہا۔

"ہمم! خیال تو میرا بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ نازش کو جاب کرنی ہے تو کسی اور اسکول میں بھی کر سکتی ہے۔ یہاں آنے کا مطلب؟"

کومل نے ناگواری سے کہا۔

"تم پر نظر رکھنا اور کیا۔ اتنے سال اسے نوکری کرنے کا خیال نہیں آیا اور جب آیا بھی تو تمہارے اسکول میں ہی کیوں؟ بہت چالاک ہے تمہاری نند۔۔!" روبینہ نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"ہاں مجھے تو شادی کے وقت ہی اس کا اکلوتا اور لاڈلا ہونا کھٹکتا تھا۔ اسی لیے میں نے شروع دن سے کبھی اسے منہ نہیں لگایا۔ ساس سسر میری شادی کے تین سال بعد ہی آگے پیچھے چلے گئے۔ شکر ہے کہ نازش کا فرض ادا کر گئے تھے۔ اس وقت نازش کی شادی کو دو سال ہوئے تھے۔

ان دو سالوں میں ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ نازش اپنے والدین کی زیادہ لاڈلی ہے جبکہ عثمان کا رویہ نارمل ہی تھا۔ بس میں نے عثمان کی اسی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر اسے نازش سے مزید دور کر دیا۔ اب تو شکر ہے کہ جیسا میں کہتی ہوں وہ مان لیتے ہیں۔"

کومل نے فخریہ انداز میں کہا۔ اسی وقت کسی کام سے سر رضوان دروازے پر دستک دے کر اندر داخل ہوئے۔ وہ اسکول کے انتظامی امور دیکھتے تھے۔

"باہر ایک خاتون کافی دیر سے انٹرویو دینے کے لیے بیٹھی ہوئی ہیں۔ آپ اگر فارغ ہیں تو انھیں بلا لیں۔ وائس پرنسپل مسز خورشید نے یہ ذمہ داری آپ کے سپرد کی ہے کیونکہ ان دنوں وہ اپنے بچے کی بیماری کی وجہ سے اسکول بہت کم آ رہی ہیں۔" سر رضوان جن کی عمر چالیس کے قریب تھی، سنجیدگی سے مدعا بیان کیا۔

"ابھی ہمیں ٹیچرز کی ضرورت تو نہیں ہے۔"

روبینہ نے جلدی سے کہا تو سر رضوان نے اس پر سنجیدہ نگاہ ڈالی۔

"اردو اور اسلامیات کی ٹیچرز کی ضرورت ہے اور اسی کی آسامی کے لیے نوٹس بورڈ پر اشتہار لگایا ہے۔ اسلامیات کی ٹیچر تو مل گئی ہیں۔ اردو ٹیچر کے طور پر انھیں دیکھ لیں۔ مجھے تو کافی سمجھدار لگی ہیں۔"

pklibrary.com

سر رضوان نے سنجیدگی سے کہا اور ہاتھ میں پکڑی فائل میز پر رکھ کر باہر چلے گئے۔

"ہونہہ! سمجھ دار ہے کوئی مجھ سے پوچھے۔۔۔!" کومل نے جھنجھلا کر کہا جبکہ روبینہ کسی گہری سوچ میں گم تھی۔

"میری کزن لبنیٰ ایم۔اے اردو ہے اور آج کل نوکری ہی تلاش کر رہی ہے۔ اگر اپنی نند سے بچنا چاہتی ہیں تو اسے رکھ لیں۔"

روبینہ نے کہا تو کومل کا چہرہ چمک اٹھا۔ اس نے فوراً ہامی بھر لی تو روبینہ اپنی چالاکی پر خود کو داد دیتی وہاں سے اٹھ کر باہر چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد کومل نے نازش کو کمرے میں بلایا تو وہ پسینے میں نہائی ہوئی تھی۔

"گرمی میں ریشمی کپڑے پہن کر سکول آنے کی کیا ضرورت تھی؟ میری یہاں ایک عزت ہے۔ نام ہے۔ اگر کسی کو پتا چل گیا کہ تم میری نند ہو تو میرے لیے مسئلہ ہو جائے گا۔ میری مانو تو کسی اور اسکول میں کوشش کر لو۔ ویسے بھی اردو ٹیچر کا بندوبست ہو گیا ہے۔"

کومل نے ایک سانس میں بغیر رکے کہا۔ نازش جو ابھی کرسی پر بیٹھی بھی نہیں تھی۔ آنسو پیتی، ضبط کرتی سر جھکا کر واپس مڑ گئی۔ اس کی آخری امید بھی ختم ہو گئی تھی۔ نازش نے بی۔اے کیا ہوا تھا۔ اسے اب لگتا تھا کہ والدین بیٹیوں کو اچھی قسمت تو نہیں دے سکتے ہیں مگر جو چیز یا ہنر دے سکتے ہیں وہ بیٹیوں کی اچھی اور اعلیٰ تعلیم ہے جو مشکل حالات میں کام آتی ہے۔ نازش چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی کمرے سے باہر نکلی تو اس کے چہرے پر آنسو بہہ رہے تھے۔

سر رضوان جو کسی کام سے کومل کے پاس آ رہے تھے۔ ایک دم چونک گئے۔ وہ کومل کی باتیں سن چکے تھے۔ اس لیے ساری بات سمجھ کر افسوس سے سر ہلانے لگے۔ نازش غائب دماغی کی حالت میں چلتی آگے بڑھی تو سامنے سے آتی درمیانی عمر کی سوبر خاتون سے ٹکرا گئی جو نازش کے چہرے کی طرف دیکھ کر چونک گئی تھیں۔

"آپ ٹھیک ہیں؟" خاتون نے نرم لہجے میں سوال کیا تو نازش نے گھبرا کر چادر سے چہرہ صاف کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ اسی وقت سر رضوان آگے بڑھے۔

"میم خورشید! یہ ٹیچر کے انٹرویو کے لیے آئی تھیں۔ بہت ضرورت مند ہیں۔ آپ ایک بار ان سے بات کر لیں۔" سر رضوان نے ملتجی لہجے میں کہا تو وائس پرنسپل مسز خورشید نے اثبات میں سر ہلایا اور نازش کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

"آپ آرام سے بیٹھیں اور تفصیل سے اپنے بارے میں بتائیں۔"

مسز خورشید نے نرم لہجے میں کہا اور گھنٹی بجا کر ملازمہ سے ٹھنڈا جوس لانے کا کہا۔ ملازمہ کے واپس آنے تک نازش مدھم لہجے میں اپنی کہانی سنا چکی تھی۔ مسز خورشید جو آج کل اپنے اکلوتے بیٹے کی بیماری کی وجہ سے ویسے ہی پریشان اور زود رنجی کا شکار تھی۔ نازش کی آپ بیتی سن کر ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"آپ کل سے اسکول جوائن کر سکتی ہیں۔ باقی کی کارروائی میں دیکھ لوں گی۔ آپ کے بچوں کو بھی یہاں داخلہ مل جائے گا۔ ان کی فیس بھی معاف ہو جائے گی۔" مسز خورشید نے مضبوط لہجے میں کہا اور گھنٹی بجا کر سر رضوان کو بلا کر ساری بات سمجھائی تو وہ خوشی سے سر ہلاتے واپس مڑ گئے۔

"میم! ڈیمو نہیں دینا ہو گا؟" نازش نے حیرانی سے سوال کیا تو مسز خورشید نے مسکرا کر نفی میں سر ہلایا۔

"میں آپ کو جاب پر اس لیے نہیں رکھ رہی کہ آپ بہت قابل ہیں۔ میں آپ کو یہ نوکری اس لیے دے رہی ہوں کہ آپ بہت ضرورت مند ہیں مگر کسی سے مانگنے کے بجائے، اپنی محنت کے بل بوتے پر کمانا چاہتی ہیں اور میرا ماننا ہے کہ ہمیں ایسے لوگوں کو راستہ ضرور دینا چاہئے جو زندگی ـــــ میں اندھیروں سے لڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں آپ جیسی سب باہمت خواتین کی دل سے قدر کرتی ہوں۔

باقی ابھی آپ کو کام سیکھنا ہو گا مگر یہ مشکل نہیں

pklibrary.com

ہے۔ میرا تعاون آپ کے ساتھ رہے گا۔"

مسز خورشید نے کہا تو نازش خوشی سے چمکتے چہرے کے ساتھ کمرے سے باہر چلی گئی۔ مسز خورشید نے گہری سانس لی۔ ایک اطمینان بھری لہر اس کے اندر اٹھی تھی۔ اسی وقت مسز خورشید کے موبائل پر کال آنے لگی۔ شوہر کا نام دیکھ کر وہ ایک دم چونک گئیں۔

"آج حمزہ کی سی ٹی اسکین رپورٹ آنی تھی۔"

مسز خورشید نے دھڑکتے دل کے ساتھ کال ریسیو کی مگر دوسری طرف سے شوہر کی مطمئن اور مسکراتی آواز سن کر انھوں نے رب کا شکر ادا کیا کہ ان کے بیٹے کی رپورٹس ٹھیک تھیں۔ مسز خورشید نے فون بند کیا تو ان کا یقین اس بات پر پکا ہو گیا کہ کسی بے بس کے ساتھ کی گئی نیکی کا اجر فوراً ملتا ہے۔

☆☆☆

اگلے دن نازش کو اسکول میں جونیئر کلاسز کو پڑھاتا دیکھ کر کومل کو شاک لگا تھا۔ کومل روبینہ کی کزن لبنیٰ کو بھی ہائر کر چکی تھی۔ لبنیٰ بہت تیز لڑکی تھی جس کا دھیان پڑھانے سے زیادہ، دوسروں کی ٹوہ لینے یا جاسوسی کرنے میں گزرتا تھا۔ نازش سے اس نے پہلے دن ہی بیر باندھ لیا تھا کیونکہ روبینہ اسے سب بتا چکی تھی۔

نازش کے لیے محدود وسائل میں گھر سے باہر نکل کر نوکری کرنا آسان نہیں تھا مگر اپنے بچوں کے بہتر مستقبل کے لیے یہ قدم اٹھانا ضروری تھا۔ شروع کے چند مہینے لگے مگر نازش نے محنت اور لگن سے کام کر کے اپنی پوزیشن وائس پرنسپل اور پرنسپل کے سامنے اچھی بنا لی تھی۔ جبکہ کومل سے وہ — حتیٰ الامکان دور رہتی اگر سامنا بھی ہو جاتا تو دونوں ایک دوسرے سے انجان بن جاتیں۔

عثمان کا خیال تھا کہ نازش کو نوکری دلوانے میں اصل ہاتھ کومل کا ہے۔ نازش نے بھائی کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اسے اب کسی سے کوئی غرض نہیں تھی۔ اس کی اپنی زندگی میں اتنے مسئلے مسائل تھے کہ وہ انھیں سلجھاتے وقت کے ساتھ بھاگنے کی کوشش کر رہی تھی۔

☆☆☆

"مس لبنیٰ! آپ کے ڈاکومنٹس مکمل نہیں ہیں؟ پچھلے چھ مہینے سے آپ اسکول میں ملازمت کر رہی ہیں مگر ابھی تک اپنے مکمل کاغذات جمع نہیں کروائے۔ میں حیران ہوں کہ آپ کو ملازمت کیسے مل گئی؟ یہ ہمارے ادارے کے اصول میں شامل نہیں ہے۔"

سر رضوان کے توجہ دلانے پر آج مسز خورشید نے لبنیٰ کو آفس میں بلا کر بات کی تو وہ لبنیٰ کا غیر ذمہ دار انداز گفتگو دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ ان کے اسکول کا ایک نام تھا۔ اچھی ساکھ کی وجہ سے لوگ اس پر اعتبار کرتے تھے۔

"دراصل شفٹنگ کے دوران کچھ کاغذات گم ہو گئے مگر میں جلد ان کی فوٹو کاپی جمع کروا دوں گی۔"

لبنیٰ نے مطمئن انداز میں جھوٹ بولا تھا۔

"آپ کو اس جاب کے بارے میں کیسے پتا چلا؟" مسز خورشید نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

"مس روبینہ میری کزن ہیں۔ ان کی مس کومل سے اچھی دوستی ہے مس کومل نے تو مجھے بغیر انٹرویو کے جاب پر رکھ لیا تھا۔" لبنیٰ نے فخریہ انداز میں کہا تو مسز خورشید غصے سے پہلو بدل کر رہ گئیں۔

"بہرحال! آپ ابھی خود کو ٹرائل پر سمجھیں۔ آپ کے پاس سنیئر کلاسز ہیں۔ اگر مڈٹرم میں کلاس کا رزلٹ اچھا آیا تو ہمارے ادارے کے لیے آپ جیسی ٹیچر کا ساتھ خوشی کی بات ہو گی، دوسری صورت میں آپ سمجھدار ہیں۔"

مسز خورشید نے نپے تلے انداز میں اسے وارننگ دی تھی۔ جسے لبنیٰ نے ان سنی کر دیا۔ سنیئر اسکول کو آرڈینیٹر کنول نے کئی بار لبنیٰ کے غیر سنجیدہ رویے کی شکایت کی تھی۔ اس لیے مسز خورشید کو نوٹس لینا پڑا۔ مسز خورشید نے کومل کو بلا کر بھی سخت الفاظ میں سرزنش کی۔ کومل نے دوران ملازمت پہلی بار اپنے اصولوں کے خلاف کام کیا تھا اور پہلی بار ہی اسے سخت شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا کہ اس کی ادارے سے ایمان داری ہی مشکوک ہو گئی تھی۔

کومل اس سب کے لیے بھی نازش کو ذمہ دار سمجھتی

pklibrary.com

تھی جس کی وجہ سے اس نے لبنیٰ کو بغیر سوچے سمجھے موقع مہیا کیا جواب اس کے لیے ہی مسئلہ بن گیا تھا۔ کومل نے روبینہ اور لبنیٰ سے اکیلے میں بات کی۔ انھیں متنبہ کیا مگر صورت حال کو سمجھنے کے بجائے، وہ دونوں کومل کے ہی خلاف ہو گئیں۔ اب انھیں جب بھی اور جہاں بھی موقع ملتا، وہ کومل کی برائی کرنے سے نہیں چوکتی تھیں۔ کومل کے کانوں تک سب باتیں پہنچیں تو وہ غصے کو دباتے ہوئے، بے بسی سے انھیں نظر انداز کر دیتی تھی۔ مگر مسز خورشید اس معاملے میں بے بس نہیں تھیں۔ انھیں اندازہ تھا کہ لبنیٰ نے اردو میں ایم۔ اے نہیں کیا ہوا اور یہ سچ بھی تھا جس پر لبنیٰ اور روبینہ نے چالاکی سے پردہ ڈال کر کومل کو بے وقوف بنایا تھا

مسز خورشید کے سمجھانے اور مسلسل نگرانی کرنے کے باجود بھی لبنیٰ اپنے کام کو لے کر غیر سنجیدہ ہی رہی۔ نتیجے کے طور پر اردو سیکشن کا رزلٹ خراب آیا جس پر لبنیٰ کو ملازمت سے نکال دیا گیا اور روبینہ کو بھی غلط بیانی کرنے پر نوکری سے ہاتھ دھونا پڑا۔ لبنیٰ اور روبینہ کو اس بات پر شدید غصہ آیا۔ دوسری طرف نازش کی اچھی کارکردگی کو دیکھتے ہوئے، مستقل بنیادوں پر رکھ لیا گیا۔ نازش کے تینوں بچوں کی فیس معاف کر کے اسکول میں داخلہ بھی دے دیا گیا۔

"یہ سب مس کومل نے جان بوجھ کر کیا ہے۔ اپنی نند کو آگے لانے کے لیے مجھے پیچھے کیا۔ اتنی ہی ایمان دار اور اصول پسند تھیں تو بغیر انٹرویو اور کاغذات کے مجھے نوکری پر نہ رکھتیں۔"

اسکول چھوڑنے سے پہلے لبنیٰ نے کومل کے خلاف ہر جگہ زہر گھولا۔ روبینہ بھی اس کے ساتھ تھی۔ کومل تک یہ باتیں پہنچیں تو اس کا ضبط جواب دے گیا۔ اس نے روبینہ کو بلایا۔ جس کا رویہ بہت روکھا تھا۔ دونوں کے درمیان تلخ کلامی ہوئی۔ اگلے دن مسز خورشید نے کومل کو اپنے آفس میں بلا کر جب نوکری سے فارغ کرنے سے پہلے ایک مہینے کا نوٹس دیا تو وہ ہکا بکا رہ گئی۔

"آپ کا اور ہمارا ساتھ کافی سالوں پر محیط ہے مگر آپ کی ایک چھوٹی سی جلد بازی نے ہمارے بچوں کا مستقبل داؤ پر لگا دیا ہے۔ آپ نے اپنی ذاتی غرض یا بغض میں اندھا ہو کر، اس ادارے میں آنے والے بچوں کے مستقبل کے بارے میں نہیں سوچا۔ اس لیے ہماری مجبوری ہے کہ ہم مزید کوئی رسک نہیں لے سکتے۔ آپ کی خدمات کو یاد رکھا جائے گا۔" مسز خورشید کے سخت انداز پر کومل لب کاٹ کر رہ گئی۔

وہ غصے میں بھری پرنسپل کے پاس گئی مگر مسز خورشید سے بھی زیادہ سخت رویہ پرنسپل کا تھا۔ کومل کو پہلی بار اپنی جلد بازی اور حماقت پر شدید غصہ آیا۔ اس نے ریزائن دیا اور خاموشی سے اپنا بیگ اٹھا کر آفس سے باہر نکلی تو جونیئر کلاسز کے پاس سے گزرتے ہوئے ٹھٹک کر رک گئی۔ کھلے دروازے سے، بچوں کو محنت اور لگن سے پڑھاتی نازش نظر آ رہی تھی۔ اس نے آج گہرے رنگوں کا سستا سا مگر لان کا نیا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ کومل کو وہ دن یاد آیا جب شدید گرمی میں وہ ریشمی سوٹ پہن کر باہر بیٹھی اپنی باری کا انتظار کر رہی تھی۔ کومل بجھے دل اور شکستہ قدموں کے ساتھ اسکول کے گیٹ کی طرف بڑھی۔

نازش نے گہری سانس لے کر ہاتھ میں پکڑی کتاب میز پر رکھی اور چھوٹے مگر مضبوط قدم اٹھاتی کلاس روم کے دروازے کے پاس آئی۔

اسے کچھ دور جاتی ہوئی کومل نظر آئی تھی۔ نازش جانتی تھی کہ کومل کو اسکول سے نکال رہے ہیں۔ وہ خاموش تھی۔ اس وقت بھی جب کومل نے روبینہ کے ساتھ مل کر اسے نوکری نہ دینے کا منصوبہ بنایا تھا۔ جس نے اتفاق سے ان کی سب باتیں سن لی تھیں۔ نازش کو وہ دن اور اس دن سامنے آنے والی سچائی آرے کی طرح کاٹتی تھی مگر اس نے صبر سے کام لیا اور اللہ نے اس کے صبر کا صلہ بہت جلد عطا کر دیا تھا۔ آج اس کے مالی حالات پہلے سے بہتر تھے۔ وہ اپنے بچوں کو بہترین ادارے میں پڑھا رہی تھی۔ کومل کے لیے اس کا دل دکھا ضرور مگر نازش جانتی تھی کہ کومل نے وہ ہی کاٹا، جس فصل کا بیج بویا تھا۔

☆☆

pklibrary.com

قرۃ العین سکندر

آج گھر میں خوب رونق تھی اور رونق کیوں نہ ہوتی نور منزل میں صبح سویرے نسرین اپنے شوہر عقیل اور بچوں سمیت میکے آن پہنچی تھی۔ صبح سویرے جب نسرین نے بچوں کو جگایا کہ وہ سب نانی کے گھر جا رہے ہیں تو بچوں کے چہروں پر خوشی دیدنی تھی۔ سب کی نیند کا خمار ہوا ہو چکا تھا۔ لپک جھپک باری باری سب کو تیار کر کے جانب منزل گامزن ہوئے تھے۔ عاصمہ بیگم تو بیٹی اور نواسوں کو دیکھ کر خوشی سے نہال ہو رہی تھیں۔

"میں صدقے جاؤں، میرے بچے آ گئے۔ گھر کیسا خوشیوں سے مہک اٹھا ہے۔" عاصمہ بیگم نے بیٹی کا محبت سے ماتھا چوما تھا۔

"آنٹی! ہم نے تو ناشتہ بھی نہیں کیا ہے۔ سوچا تھا کہ آپ کے ہاتھوں کے آلو کے خستہ پراٹھے کھائیں گے۔ سچ کہوں تو ترس گیا ہوں آلو کے پراٹھے کھانے کو۔" عقیل نے کہا تو نسرین نے برا سا منہ بنایا تھا۔

"ارے آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے کبھی میں نے آلو کے پراٹھے بنا کر ہی نہیں دیے ہیں۔"

عقیل نے ہنستے ہوئے اپنی روٹھی بیوی کو دیکھا تھا۔

"اجی پراٹھے تو کھاتے ہیں مگر جو مزہ اور ذائقہ آنٹی کے ہاتھوں میں ہے۔ وہ تمہارے بنے پراٹھوں میں کہاں؟" اب کے نسرین نے بھی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔

"یہ تو سچ ہے امی! میں نے بہت کہا امی کو زحمت ہو گی۔ میں جھٹ پٹ ناشتہ کروا دیتی ہوں۔ مگر مجال ہے کہ انہوں نے میری سنی ہو۔"

نسرین نے بھی اپنے شوہر نامدار کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا تھا۔ عاصمہ تو اپنے بچوں کی اس محبت میں ہی خوشی سے نہال ہو رہی تھیں۔

"ایسا کرو نسرین! تم فون کر کے جبین کو بھی بلا لو۔ وہ بھی آ جائے تو مزید رونق ہو جائے گی۔ میں نگین کو اٹھاتی ہوں پھر مل کر اچھا سا ناشتہ تیار کرتی ہوں۔ اور پھر سب مل کر تے ہیں۔"

عاصمہ بیگم نے کہا تو نسرین نے اپنے چیختے چلاتے شور کرتے بچوں کو باہر صحن میں جا کر کھیلنے کو کہتے ہوئے جبین کو بھی فون کر کے دعوت عام میں شریک ہونے کے لیے کہا۔ عاصمہ نے نگین کو جگایا تو نگین جو بے خبری سے چادر منہ پر تانے سوتی بن رہی تھی۔ اس وقت جگائے جانے پر سخت ناراض ہو رہی تھی۔

"کیا ہے امی! ایک ہی چھٹی کا دن ہوتا ہے اس دن آپ کو میرا اسکون سے سونا پسند نہیں ہے۔"

نگین نے سخت خفگی سے ماں کو دیکھا اور دوبارہ سے سوتی بن گئی تھی۔

"بیٹا! کتنی بری بات ہے باہر بڑی بہن آئی بیٹھی ہے۔ کیا وہ خود جا کر کچن میں ناشتہ بنائے گی۔ میں اکیلی جان میری بوڑھی ہڈیوں میں اتنا دم خم کہاں ہے کہ میں یہ سب دیکھوں۔"

عاصمہ نے کہا تو نگین نے ناراضی سے ماں کو دیکھا اور چادر پرے پھینکی۔

"اماں کیا! ان لوگوں کو ذرا سا بھی احساس نہیں

pklibrary.com

ہے کہ ہمارے پاس ایک ہی چھٹی کا دن ہوتا ہے اور ہر ویک اینڈ پر کبھی چھوٹی تو کبھی بڑی آپا آن دھمکتی ہیں۔ کسی ایک چھٹی والے دن ہمیں بھی یہ موقع دیا کہ کبھی اپنے گھر ڈھنگ کا کھانا ہی کھلا دیں۔ مجال ہے کہ کبھی غلطی سے بھی دعوت دی ہو۔"

نگین جو منہ میں آیا بولتی چلی گئی۔ عاصمہ بیگم جانتی تھیں کہ بیٹی جو کچھ کہہ رہی ہے سو فیصد درست ہے۔ مگر وہ اس پر بھی بہت خوش رہا کرتی تھیں کہ ان کی بچیاں اپنے اپنے گھروں میں خوش ہیں۔ آباد ہیں۔ دوسرا یہ بھی تھا کہ وہ کچھ دے دلا تو نہیں سکتی تھیں۔

سفید پوشی کا بھی بھرم ہوا کرتا ہے۔ تو کم از کم اتنا تو کر ہی سکتی تھیں کہ جب بچیاں اپنے شوہر اور بچوں سمیت گھر آئیں تو وہ ان کو اچھا کھلا پلا سکیں۔

"بری بات ہے بیٹا! بہنیں بہت مان سے گھر آتی ہیں۔ ان کے آنے سے کون سا گھر میں رزق کم ہوتا ہے۔ وہ اپنا رزق خود لے کر آتی ہیں۔ بلکہ میں نے تو نسرین سے کہا ہے کہ جبین کو بھی بلا لے۔ اسے معلوم ہوگا کہ بڑی آئی اور ایک قدم دور اس کا گھر ہے اور اسے

ناولٹ

نہیں بلایا تو اسے بہت برا محسوس ہوگا۔" ماں کی بات سن کر نگین کا موڈ مزید خراب ہو گیا تھا۔

"اماں! یہ سب آپ کی دی ہوئی ڈھیل کا ہی نتیجہ ہے۔"

وہ منہ بسورے واش روم میں گھس گئی تھی۔ فریش ہو کر باہر نکلی تھی۔ اس نے دیکھا اماں آلو ابالنے کے لیے چولہے پر رکھ چکی تھیں۔

"ایسا کرو عاقب کو جگا دو۔ وہ جا کر دہی اور ساتھ میں دوپہر کے لیے سبزی لادے۔"

اس نے مارے باندھے لاؤنج سے گزرتے ہوئے، بہنوئی اور بہن کو سلام کیا اور سیڑھیاں چڑھ کر چھت کی راہ لی تھی۔

اوپر والا پورشن زینب چچی کا تھا۔ اس نے جیسے ہی زینہ عبور کیا۔ سامنے ہی اسے نک سک سے تیار عاقب دکھائی دے گیا تھا۔

"ارے واہ کدھر کی تیاری ہے بڑے ہیرو شیرو بن کر نکل رہے ہو۔" نگین نے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"اب نظر نہ لگا دینا۔"

عاقب نے بھی بہ ظاہر خفگی سے کہا تھا۔ مگر اس دھان پان سی دودھیا رنگت والی لڑکی کو بہت دھیان سے دیکھا تھا۔

عاقب کی بات پر اس نے بے ساختہ ہی قہقہہ لگایا تھا۔

"میں کیوں نظر لگانے لگی۔ حد ہو گئی۔ میں اس لیے آئی تھی کہ نیچے امی بلا رہی ہیں۔ کچھ ضروری سامان منگوانا ہے۔"

نگین نے کہا تو عاقب نے اپنے بالوں کو اپنی انگلیوں سے سنوارتے ہوئے کہا۔

"اوکے...... میں آتا ہوں۔"

عاقب کی سعادت مندی کی تو وہ شروع سے ہی قائل تھی۔ اس نے کبھی بھی امی کے کسی کام کے لیے عاقب کے ماتھے پر کوئی شکن نہ دیکھی تھی۔ وہ خوش دلی سے بڑھ چڑھ کر ان کے سارے کام کرتا تھا۔

"ارے نگین بیٹی! صبح ہی صبح آ گئی۔ آؤ بیٹا، ناشتہ کر لو۔" کچن سے زینب چچی نے اسے دیکھ کر ناشتے کی آفر کی تھی۔ ناشتے سے اٹھتی ہوئی آملیٹ کی مہک بتا رہی تھی کہ زینب چچی اپنے ہاتھوں کا جادو جگا چکی ہیں۔

"نہیں چچی جان! اصل میں آپا آتی ہیں تو میری تو دوڑ لگی ہوتی ہے۔"

نگین نے منہ بنا کر جواب دیا تھا۔ زینب بیگم ہنس دی تھیں۔ جانتی تھیں کہ نگین نیند کی کتنی ماتی تھی اور ایک چھٹی والے دن وہ دوپہر کر کے ہی جاگتی تھی۔ مگر اس کے بعد ماں کو کسی بھی کام کو ہاتھ نہ لگانے دیتی تھی۔ مگر ایسا موقع اسے شاذونادر ہی میسر ہوتا تھا۔ تب جب بھی نسرین آپی کی آمد نہ ہوتی۔ یا جبین کی ساس بیمار ہوتیں۔ وہ دونوں نہ آتی تھیں۔ تو بقول نگین راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔ لیکن جب وہ آن دھمکتی تھیں۔ تو سارا دن ہی بہنوں کی نذر ہو جایا کرتا تھا۔ آج کا دن بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ وہ ہی رونق وہی چہل پہل تھی۔ دسترخوان پر ناشتہ لگ چکا تھا۔ جبین آ چکی تھی۔ بقول نگین کے۔

"جبین کے جناتی قہقہے بتا دیتے ہیں کہ جبین کی گھر میں اینٹری ہو چکی ہے۔"

جبین کے بچے بار بار اچک اچک کر کباب، پلیٹ سے اٹھانے کی کوشش میں ہلکان ہو رہے تھے۔ نگین دسترخوان لگا رہی تھی۔ اسے شدید کوفت ہو رہی تھی۔ دونوں بہنیں تو مزے سے لطف اندوز ہوں گی۔ مگر وہ جی ہی جی میں ہلکان ہو رہی تھی۔ نیند کا خمار تو ٹوٹ چکا تھا۔ مگر کسل مندی طاری تھی۔ اور اس پر ان باگڑ بلوں بچوں نے تنگ کر رکھا تھا۔ اس نے ایک زوردار جھانپڑ درمیان والے اسد کو رسید کیا تھا۔ اسد نے منہ کھول کر گلا پھاڑ پھاڑ کر رونا شروع کر دیا تھا۔

"ہائے...... ہائے میرے لعل کیا ہوا؟"

جبین نے اچانک، جناتی قہقہوں کو بریک لگا کر فکرمندی سے اپنے لاڈلے سپوت سے پوچھا تھا۔

"خالہ نے مارا۔" وہ رونا بھول بھال کر شکایت کرتے ہوئے بولا تھا۔ جبین نے تیز نگاہوں سے بہن کو دیکھا تھا۔

pklibrary.com

"نہ ایسا کیا قصور کر دیا میرے بچے نے۔ آج تک میں نے اسے ہاتھ نہیں لگایا اور تم نے اسے سیدھا تھپڑ لگا دیا۔" جبین نے تیز لہجے میں سرزنش کرتے ہوئے چھوٹی بہن سے پوچھا تھا۔

"اگر آپ نے ہی تھپڑ لگا دیا ہوتا تو آج مجھے یہ تھپڑ نہ لگانا پڑتا۔ گندے ہاتھوں سے کباب اٹھا رہا تھا کم از کم ان کے منہ ہاتھ تو دھلوا کر لاتیں۔"

نگین حد درجہ نفاست پسند تھی۔ اس نے کھلے لفظوں کا چابک مارا تھا۔ اور اندر کی کھولن باہر نکالی تھی۔ ماحول بہت ہی بوجھل ہو چکا تھا۔ جبین کو اپنی بڑی بہن کے سامنے سبکی بہت زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔

"اماں! دیکھ رہی ہیں۔ آپ کی بیٹی کو ہمارا آنا اب گراں گزرنے لگا ہے۔" جبین کا لہجہ بھیگا ہوا تھا۔ عاصمہ بیگم حد درجہ پریشان ہو چکی تھیں۔ جبین کی ناراضی کے بعد داماد کی ناراضی کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھیں۔ اس لیے بہتر یہی تھا کہ بیاہی بیٹی کو راضی کرنے کے لیے کنواری بیٹی کا دل توڑ دیتیں کہ وہ تو پھر بھی گھر کی ہی بچی تھی۔

"نگین! تمہیں کس نے کہا ہے کہ بچے کو مارو۔ خبردار جو میری جبین کے بچے کو ہاتھ لگایا۔ معافی مانگو بہن سے۔"

عاصمہ نے اتنی محنت سے سجے ہوئے دسترخوان اور ساری محنت کو اکارت جاتا دیکھ کر سخت لہجہ میں کہا تھا۔ نگین جو اتنی محنت کے بعد سب دسترخوان پر سجا چکی تھی۔ ماں کو زخمی نگاہ سے دیکھا تھا۔

"کوئی بات نہیں بیٹا! بہنوں میں ایسی باتیں ہو جایا کرتی ہیں۔ تم بڑی ہو درگزر سے کام لو۔"

حامد صاحب جواب کمرے سے نکلے تھے۔ سارا معاملہ سن چکے تھے۔ انہوں نے کہا تو معاملہ یوں رفع دفع ہو گیا تھا۔ سب مل جل کر کھانے میں مصروف ہو چکے تھے۔ دوبارہ سے سب خوش گپیوں میں مصروف مزے سے خستہ آلو کے پراٹھوں کا لطف اٹھا رہے تھے۔ ساتھ میں سادہ بل دار پراٹھے اور کباب بھی تھے۔ نگین نے رات کا آلو قیمہ بھی ساتھ رکھ دیا تھا۔ مگر اب خود اس کا دل ملول سا ہو چکا تھا۔ اس لیے خاموشی سے چائے بنانے کچن میں آ گئی تھی۔

عاقب بازار سے سارا سودا سلف لا کر کچن میں رکھ رہا تھا۔ اس نے دیکھا تو نگین نے جھٹ سے اپنے آنسو صاف کر لیے۔ مگر عاقب سے یہ منظر چھپ نہ سکا۔

"سنو۔" عاقب نے پکارا تو اسے براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکنا ہی پڑا تھا۔

"یہ حلوہ پوری میں تمہارے لیے لایا ہوں۔"

عاقب نے ایک الگ سے شاپر اس کو تھماتے ہوئے کہا تو نجانے کیوں کچھ الگ سے محسوسات نے نگین کے دل کے تاروں کو چھوا تھا۔ عاقب کو معلوم تھا کہ وہ کتنی ندیدی بن جاتی تھی حلوہ پوری کو دیکھ کر اس لیے وہ بازار سے اس کے لیے لایا تھا۔

"کیا بات ہے نگین! کسی نے کچھ کہا ہے کیا؟"

عاقب نے اس کی سنجیدہ سی صورت دیکھ کر سوال کیا تھا۔ ورنہ کوئی اور وقت ہوتا تو نگین کے چہرے پر بچوں والی خوشی ہوتی۔ عاقب اکثر اوقات اس کے لیے کچھ نہ کچھ لاتا ہی رہتا تھا۔ کبھی آئس کریم کبھی چاکلیٹ اور کبھی حلوہ پوری۔ اور وہ بھی تو بھاگ بھاگ کر عاقب کے سارے کام کرتی تھی۔ اس کے سارے کپڑے چپ چاپ جا کر اوپر چچی کے ساتھ دھلواتی تھی۔ اس کا کمرہ صاف کروا دیا کرتی تھی۔

جب سے زینب چچی کو نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا۔ تب سے وہ یوں بھی ان کا خاص خیال رکھتی تھی۔

چچا کی وفات کے بعد زینب چچی بیمار رہنے لگی تھیں۔ دل گرفتہ سی زینب چچی اس سے بے انتہا محبت کرتی تھیں۔ اور عاقب بھی اس کی کارگزاریاں دیکھتا تو بطور شکریہ اس کے لیے کچھ نہ کچھ لاتا رہتا تھا۔

"جانتے ہو عاقب! بچپن میں جب کبھی ہم سمندر کی سیر پر جاتے تھے۔ تو میں ریت سے کھیلتی تھی اور سیپ چنا کرتی تھی۔ وہ میری زندگی کا بہترین وقت تھا۔ ابو جب سے دل کے عارضے میں مبتلا ہوئے ہیں۔ میں نے بے فکری کے لمحوں کو گویا ریت کی مانند ہاتھوں پھسلتے دیکھا ہے۔ مگر میری اپنی بہنیں کیا انہیں کچھ دکھائی

pklibrary.com

نہیں دیتا۔ سارا حساب کتاب ڈسٹرب ہو جاتا ہے۔ ان کے آنے کے بعد سب غلط سلط ہو جاتا ہے۔ اور اماں یہی کہتی ہیں کہ رزق میں برکت ہوتی ہے۔"

وہ خفا خفا سی دل کے کتنے پاس لگ رہی تھی۔ عاقب مسکرا دیا تھا۔

"نگین! کبھی کبھی زندگی کو دوسروں کے نقطہ نگاہ سے بھی دیکھنا پرکھنا چاہیے۔ جو بات تمہیں بری لگ رہی ہے ہوسکتا ہے کہ بہنوں کے لیے کُل متاع زیست ہو۔ وہ لمحات جب وہ ماں سے میکے آتی ہیں۔ یہ ان کی کل عیاشی ہو۔"

عاقب نے رسانیت سے کہا تھا اور وہ ہمیشہ کی طرح عاقب کی بات پر پرسکون ہو گئی تھی۔ عاقب کا ٹھنڈا ٹھار لہجہ، ناصحانہ انداز اور سب سے بڑھ کر یہ احساس کہ کم از کم کوئی تو ہے جو بنا لفظوں کے اس کی بات کو بخوبی سمجھ رہا ہے۔ اور اس کی بات کا جواب بھی دے رہا تھا۔ وہ مسکرا دی تھی۔

"چلو شکر ہے تم مسکرائیں تو سہی۔ ورنہ آج کا سارا دن برباد ہی جاتا۔"

عاقب کہتے ہوئے لیے ڈگ بھرتا کچن سے جا چکا تھا۔ مگر اس کے لفظوں میں گونجتی محبت کی بازگشت نے نگین کو اپنے حصار میں باندھ لیا تھا۔

☆☆☆

اس کے کمرے کی کھڑکی صحن کی جانب کھلتی تھی۔ وہ بچوں کے ہوم ورک کی کاپیوں کا ڈھیر اٹھا کر گھر لے آئی تھی۔ دوپہر کو اس نے اسکول سے واپسی پر کچھ دیر سستا لیا تھا اور اب، وہ ساری کاپیاں اٹھائے ہوئے صحن میں چلی آئی تھی۔ کوئل کی کوک اور آم کے درخت میں گھسی، ایک دوسرے سے چوں چاں کرتی چڑیوں کی صدائیں اس کے اعصاب کو پرسکون کرتی چلی جا رہی تھیں۔ باغبانی کا شوق اسے ابا کی جانب سے ملا تھا۔ انواع و اقسام کے پھولوں کی مہک کے درمیان وہ اطمینان سے ساری کاپیوں کو چیک کرتی چلی گئی تھی۔

کام ختم کر کے وہ خالی الذہنی کی کیفیت میں کرسی پر بیٹھی ٹھنڈے ہوا کے جھونکوں سے لطف اندوز ہو رہی تھی، جب عاقب گرما گرم بھاپ اڑاتا کافی کا مگ لے آیا تھا۔

"کیا ہو رہا ہے بھئی؟"

عاقب نے مسکرا کر کہا۔ وہ اپنے خیالات سے چونکی تھی۔

"کچھ نہیں وہی روزمرہ کی روٹین۔" وہ ہولے سے بولی تھی۔

"میں نے اوپر سے جھانکا تو محترمہ کاپیوں میں غرق تھیں، میں نے آواز بھی لگائی مگر سنا ہی نہیں۔ اپنے لیے کافی بنائی سوچا تھکی ہوئی روح کے لیے بھی بنا لاتا ہوں کیا یاد کرو گی۔"

عاقب نے فراخ دلی کا ثبوت پیش کرتے ہوئے کافی کا بھاپ اڑاتا ہوا مگ اسے تھمایا تھا۔ نگین تو عاقب کے انداز پر ہی پرسکون ہوتی چلی گئی تھی۔ ورنہ تو مسلسل لگاتار ذمہ داریوں کے بوجھ تلے وہ دب سی گئی تھی۔ گھر آتی تو اماں کہتی تھیں۔

"اب نوکری چھوڑ دو۔" مگر ابا کی پینشن سے گزارا ممکن نہ تھا۔ وہ تو شکر تھا کہ گھر اپنا تھا اور آبائی گھروں کے سکھ دکھ سب سانجھے ہوا کرتے ہیں۔ ان کے مکینوں کے دل، دکھ سکھ میں شریک رہتے ہیں۔ جہاں ذرا سا بال دل میں آ جائے تو گھروں کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔

"شکریہ مزے کی ہے۔" وہ مسکرائی۔

"یہ ابھی تک کے لیے ہے۔ بعد میں تم نے ہی بنانی ہے۔ پھیل مت جانا۔"

عاقب نے دل کی اتنی بڑی بات اشارۃً اس کو کہی تھی۔ ایک دم مسکراتے ہوئے لب بھینچ گئے تھے۔ اس کے پرسکون اعصاب گویا تن سے گئے تھے۔

"پلیز۔" وہ بس اتنا ہی کہہ سکی تھی۔

"او کے او کے۔" عاقب ہنس دیا تھا۔ وہ مگ تھمائے پھر وہاں رکی نہیں تھی۔

☆☆☆

کمرے میں پھیلے ہوئے سناٹے کو موبائل کی مترنم

pklibrary.com

گھنٹی نے ایک دم ہی توڑ دیا تھا۔ وہ جو رات کے وقت سونے کی تیاری میں جتی تھی۔ اس وقت اچانک ہی فون کی گھنٹی نے اپنی جانب متوجہ کر لیا تھا۔ فون پر جبین آپی کا نام دیکھ کر اس کی دن بھر کی کلفت میں مزید اضافہ ہوا تھا۔ ایک دم ہی یاسیت اور قنوطیت نے اس پر، زور دار انداز سے حملہ کیا تھا۔

پہلے تو اس نے سوچا کہ فون، آف کر کے رکھ دے سائیڈ پر اور سوتی بن جائے۔ مگر جانتی تھی کہ جبین کا فون نہ اٹھایا تو پھر، گھر میں ہی ایک ہنگامہ اٹھا دے گی۔ اس نے اپنا اعصابی تناؤ کم کرنے کے لیے گہرا سانس لیا اور فون اٹھایا تھا۔

"ہیلو نگین!"

دوسری جانب نگین کے سلام کے جواب میں جبین کی سسکیاں سنائی دی تھیں۔ کچھ بھی تھا آخر کو وہ اس کی ماں جائی بہن تھی۔ سو اس کا فکر مند ہونا تو بنتا ہی تھا۔ اس نے پریشانی سے پوچھا تھا۔

"کیا ہوا ہے جبین آپی! سب خیریت تو ہے ناں؟"

دوسری جانب سے چھوٹے حمزہ کے رونے کی آواز سنائی دی تھی۔

"اب اس گھر میں یا تو میں رہوں گی۔ یا پھر ان کی اماں۔"

جبین کا لہجہ آنسوؤں میں بھیگا ہوا تھا اور انداز قطعیت بھرا تھا۔ ایک دم سے ہی نگین کے کندھوں پر جیسے پہاڑ سا آن گرا تھا۔

"کیا ہوا ہے آپی! ساری بات بتاؤ؟ اور سوچ سمجھ کر بولا کرو اگر عدنان بھائی نے سن لیا تو۔"

وہ کچھ ہراساں ہو کر بولی تھی۔

"ہاں تو میں کیا کسی سے ڈرتی ہوں۔ سنتے ہیں تو ہزار بار سن لیں۔ میں تو ان کے منہ پر کہتی ہوں۔ زندگی تماشا بنا کر رکھ دی ہے۔ بس تم ابا سے کہو کہ آ کر مجھے ابھی کے ابھی لے جائیں۔ یا پھر عاقب سے بولو۔"

جبین آپا نے تیز تیز چلاتے ہوئے کہا۔ آواز اتنی اونچی تھی کہ نگین کو ریسیور کان سے ہٹانا پڑا تھا۔

"اس وقت ابا کو پریشان کرنا مناسب نہیں ہے۔ اور میں اب رات کے وقت چھت پر جا کر عاقب کو اٹھانے، بلانے سے تو رہی۔ ایسی بھی کیا آفت ہے۔"

دوسری طرف سے نگین کی بات کو حسب معمول سے نظر انداز کر دیا گیا تھا۔

"مفت کے مشورے اپنے پاس ہی رکھو۔ خود تو مزے میں جی رہی ہو۔ تمہیں تو بہنوں کا گھر آنا پہلے ہی کھٹکتا ہے۔" جبین نے کھٹاک سے فون ہی بند کر دیا تھا۔

اور جبین کے اس لفظ میں الجھی کہ وہ مزے میں جی رہی ہے۔ نگین سوچ رہی تھی کہ صبح سویرے کچن کے کام نبٹا کر گھر کا جھاڑو پونچھا کر کے وہ جاب پر چلی جاتی ہے۔ سارا دن بچوں کی چیخ چیخ اور ان کے والدین کی ان گنت شکایات اور مطالبات۔

چند ہزار کے لیے پرنسپل صاحبہ اس کا خون اچھی طرح نچوڑتی تھیں۔ کئی بار تو عزت نفس پر آتی ہوئی ٹھیس کی وجہ سے وہ سخت بددل ہو جاتی تھی۔ مگر جانتی تھی کہ ابا کی پینشن میں، وہ اور اماں تو گزارا کر ہی لیتیں مگر آئے دن بہنوں کے چکروں کی وجہ سے، سارا بجٹ خراب ہو جاتا تھا۔ اس نے تو دل میں مصمم ارادہ باندھ رکھا تھا کہ شادی کے بعد، ادھر کا رخ ہی نہیں کرے گی کہ وہ اماں کے لیے فکر مندی کا سبب نہیں بن سکتی تھی۔ گھر آ کر وہ اماں کا ہاتھ بٹاتی اور شام کو بچے ٹیوشن کے لیے آ دھمکتے تھے۔ اس کا موڈ خواہ کیسا ہی ہوتا۔ وہ تو بس ایک گلی بندھی زندگی کی قیدی بن کر رہ گئی تھی۔

اس کے شوق تو کچھ بھی نہ تھے۔ زیادہ سے زیادہ ایک اچھی کتاب کا مطالعہ یا پھر اماں کے ساتھ بیٹھ کر ماضی کی گپ شپ کرنا۔

وہ سوچ رہی تھی کہ جبین کا فون بند کر دینا کسی بڑے خطرے کا اعلان تھا۔ وہ سر تھامے وہیں بیٹھی، شش و پنج کا شکار تھی کہ کیا کرے؟ وہ اب مرتی کیا نہ کرتی کے مصداق، اپنی کتاب ایک طرف رکھتے ہوئے قدرے بے زاری سے کمرے سے نکلی تھی۔ اس نے دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے ہوئے، اماں ابا کے کمرے کی طرف جھانکا تھا مگر وہاں تو ہنوز، خاموشی کے بادل چھائے تھے۔

pklibrary.com

سیڑھیوں کے پاس کھڑی، قدرے شش و پنج کا شکار ہو چکی تھی کہ کیا اس وقت، عاقب کے کمرے میں جانا مناسب ہوگا؟ ابھی وہ اس کشمکش کے درمیان کھڑی تھی کہ اوپر سے آہٹ محسوس ہوئی تھی۔ وہ آہٹ محسوس کر کے جھٹ سیڑھیاں چڑھ گئی تھی۔ اندازہ تو ہو ہی رہا تھا کہ — جبین دھماکہ کر چکی ہے۔ اس کے منع کرنے کے باوجود بھی۔

عاقب اپنے الجھے ہوئے بالوں میں انگلیاں گھماتے ہوئے کمرے سے نکلا تھا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کی نیند خراب ہو چکی ہے اور وہ اب بے گانوں کے بوجھ لادنے کی تیاری میں ہے۔ نگین کو عاقب کی یہی بات بہت بری لگتی تھی۔ اس بندے کو انکار کرنا تو آتا ہی نہیں ہے۔ ابھی نوکری سے تھک ہار کر سویا ہوگا کیا ضرورت تھی ہامی بھرنے کی۔ کہہ دیتا، کہ بی بی ٹک کر اپنے گھر بیٹھو۔

یہی سوچتے اس کی اور عاقب کی نگاہوں کا تصادم ہوا تھا۔ رات کے اس گھمبیر خاموشی بھرے لمحوں میں بھی عاقب کی نگاہ، اس پر پڑی تو اس کی نگاہوں میں محبت کے جگنو چمک اٹھے تھے۔

وہ نظر چرا گئی تھی۔

"کدھر جا رہے ہو؟" وہ سوالیہ ہوئی تھی۔

"جانتے ہوئے کیوں انجان بن رہی ہو۔ تمہاری اتنی تعریف سن چکا ہوں اب تک۔ آپا کا بس چلتا تو فون سے نکل کر تمہارا قیمہ بنا دیتیں۔"

عاقب ہلکے پھلکے انداز میں کہہ رہا تھا۔

"پھر اب؟" وہ پریشانی سے پوچھ رہی تھی۔

"اماں کو جگاتا ہوں۔ اوپر لے آتے ہیں۔ صبح انکل کے جانے کے بعد ہی بتاتے ہیں تمہاری امی کو۔"

وہ منصوبہ ساز بنا اپنا منصوبہ بتا رہا تھا۔

وہ قدرے ہلکی پھلکی ہو گئی تھی۔ اس وقت آدھی رات کو تماشا نہیں چاہتی تھی۔ پریشانی برے وقت کو لاتی ہے۔ مگر برے وقت سے زیادہ پریشانی تب بڑھ جاتی ہے جب اسے سر پر غلط وقت پر مسلط کیا جائے۔ یہ ہی بات ایک مناسب وقت پر بھی بتائی جا سکتی تھی۔

"آپا کیا مان جائیں گی؟" وہ کچھ الجھن سے بولی تھی۔

"وہ احسان بھی تو نہیں لینا چاہتی ہیں تمہارا۔" وہ شرارت سے ہنسا تھا۔ کتنا بھلا شخص ان کے روز روز کے جھمیلوں میں پڑ چکا تھا۔

"تمہیں کتنا برا لگتا ہوگا نا، میری بہنیں نہ دن دیکھتی ہیں نہ رات تمہیں بھگائے رکھتی ہیں۔" وہ شرمندگی سے بولی تھی۔

"نگی! یہ تم نے کیسی بات کی ہے۔ کیا تم مجھے غیر سمجھتی ہو؟ کیا تمہاری بہنیں میری کچھ بھی نہیں لگتی ہیں؟" تحیر زدہ نگاہوں سے بھی بڑھ کر غیر یقینی لہجہ تھا۔

وہ اپنی انگلیاں اضطراری انداز میں مروڑنے لگی تھی۔

"پھر بھی تم نے ہی عادتیں بگاڑ دی ہیں۔ سر پر اٹھا رکھا ہے۔ ایک بار انکار کر دو تو دوبارہ کر فون کھڑکانے کی ہمت ہی نہ کریں گی۔" وہ بھی بضد رہی تھی۔

"عادتیں جس کی بگاڑنا چاہتا ہوں، وہ تو کوئی فرمائش ہی نہیں کرتی ہے۔ جس کے لیے ہر بار اقرار ہی اقرار ہے۔"

اس نے بے حد بھاری لہجہ میں جذبات سے مغلوب ہو کر کہا تھا۔ اس وقت نگین کے یک ٹک دیکھنے سے کچھ پزل ہو گیا تھا۔

"میرا مطلب ہے۔ حامد انکل کے بے پناہ احسانات ہیں۔ وہی نہیں چکا سکتے ہیں۔ یہ تو ان کے احسانات کے سامنے کچھ بھی نہیں ہے۔"

پھر وہ مضبوط لہجہ میں بولا تھا۔

"ہاں مگر...... بہر حال۔"

وہ کچھ بولتے بولتے نجانے کیوں چپ کر گئی تھی۔ عاقب کی نگاہوں میں محبت، اتنی واضح تھی کہ وہ اس کی سطر سطر میں ڈوب رہی تھی۔ مزید دیکھنا اور اس گہری محبت کا سامنا کرنا اب اس کے بس کی بات نہ تھی۔

"تم جاؤ میں زینب چچی کو بتا دیتی ہوں۔" وہ ایک کام اپنے ذمے لے چکی تھی۔

وہ کندھے اچکا کر نیچے اتر گیا تھا۔ اب وہ جبین اور

pklibrary.com

بچوں کو ساتھ لے کر ہی آتا۔ تب تک اس نے مناسب لفظوں میں زینب چچی کو موجودہ صورت حال سے آگاہ کیا تھا۔ جبین کی زبان درازی سے تو سب ہی واقف تھے۔ اس لیے زینب چچی کو بھی بخوبی اندازہ تھا۔ اس لیے بنا کسی بحث کے اٹھ کر مہمان خانے میں، بچوں کے لیے مزید تکیے اور چادریں وغیرہ اوڑھنے کے لیے رکھ آئی تھیں۔

''زینب چچی! آپ کتنی اچھی ہیں، کتنا خیال رکھتی ہیں۔ آپ تو جانتی ہیں کہ جب سے ابا کو پہلا ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ اس کے بعد ہم ان کو کوئی بری خبر دیتے ڈرتے ہیں۔ مجھے تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کب میری بڑی بہنوں کو عقل نصیب ہوگی۔''

وہ جلتے کڑھتے ہوئے بول رہی تھی۔ جب عاقب روتی دھوتی جبین کے ہمراہ اوپر آیا تھا۔ عاقب نے ننھے حمزہ کو اٹھا رکھا تھا اور ساتھ میں فاطمہ کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ آٹھ سالہ فاطمہ ہراساں سی تھی۔

جبین نے نگین کو سرے سے ہی نظر انداز کر کے زینب چچی کو گلے لگالیا تھا اور بھاں بھاں کر کے رونے بیٹھ گئی تھی۔

''چچی جان! اس سے کہیں کہ اپنا منحوس چہرہ لے کر یہاں سے دفعان ہو جائے۔ میں اس کی شکل بھی دیکھنے کی روادار نہیں ہوں۔''

عاقب کے سامنے اس کی اتنی انسلٹ پر اس کا چہرہ دھواں دھواں ہونے لگا تھا۔

''کیسی باتیں کر رہی ہو؟ چھوڑو سب، کیا تم نے کچھ کھایا بچوں نے کھایا؟ ابھی کھا پی کر سونے کی کوشش کرو صبح اس مسئلے پر تفصیل سے بات کرتے ہیں۔''

زینب چچی نے معاملہ فہمی سے کہا تھا۔

''ارے کھانے کو لے کر ہی تو اس کی ماں نے اتنی باتیں سنا ڈالی تھیں۔ ایک تو میں سارا دن گھن چکر بنی رہتی ہوں۔ اوپر سے لے کر نیچے تک گھر کے کام، سارا گھر ہی میرے ناتواں کندھوں پر آن پڑا ہے۔''

جبین کی نان اسٹاپ چلتی زبان شروع ہو چکی تھی۔

''بیٹا! تحمل سے، صبر سے چلتے ہیں ناں۔''

زینب چچی نے ڈرتے ڈرتے کہا تھا اور ان کا ڈر سچ ہی نکلا تھا۔

''خدا کے لیے اب آپ نہ شروع ہو جائیں۔ میری تو اپنی ہی سگی بہن نے اتنے طعنے مار دیے۔ اگر آپ پر بھی بوجھ ہوں تو صاف صاف بتا دیں۔ میں ابھی کے ابھی اپنے بچے لے کر چلتی بنتی ہوں۔ میں کسی پر بھی بوجھ نہیں بننا چاہتی اور نہ ہی اتنی باتیں سن سکتی ہوں۔''

جبین نے حد درجہ، بے اعتنائی کا مظاہرہ کرتے ہر لحاظ بالائے طاق رکھتے ہوئے کہا تھا۔ نگین کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ یہاں سے اٹھ کر چلی جاتی۔ مگر اس نے طے کیا تھا کہ کچن کے سارے کام نپٹا کے نیچے جائے گی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ چچی کو مزید تکلیف ہو۔ سو چپ چاپ ضبط کیا۔

''کچھ تو لحاظ کرو آپی! دن دیکھا نہ رات، عاقب بھاگا بھاگا گیا تم کو لے آیا۔ کیا غیر سمجھتے ہیں تم کو، حد بھی ہوگئی۔''

جبین نجانے کیوں پہلی بار نگین کی بات پر چپکی رہ گئی تھی۔

''میں بچوں کے لیے اور تمہارے لیے کھانا لاتی ہوں۔ تم بیٹھو آرام سے۔''

آخر وہ بہن ہی تھی۔ مگر اختلاف تو محض نظریاتی تھا۔ وہ بھی دل سے اس کی خوشی کے لیے دعا گو تھی۔ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی بہن اجڑ جائے۔ دل سے اس کی گھر، گھر ہستی کے لیے دعا کرتی تھی اس وقت بھی یہ ہی چاہتی تھی۔ چپ چاپ کچن کی راہ لی تھی۔ نیچے نہیں جا سکتی تھی اماں ابا کا کمرہ کچن کے بالکل پاس تھا اور ابا کی نیند ٹوٹ جاتی تو پھر آتی نہیں۔ اور پھر بے آرامی ہوتی۔ یہی سوچ کے اس نے فریج کھول کر دیکھا۔

آلو انڈے کا سالن تھا اور آج جو اس نے بریانی بنائی تھی وہ بھی فریج میں رکھی تھی۔ اس نے دو چپاتیاں بنا کر، بریانی بھی گرم کر دی تھی۔ اچھے طریقے سے

pklibrary.com

کروائی جائے۔ معاملے کو التوا میں نہ ڈالا جائے۔"

عاقب نے سارا ملبہ اپنے سر پر لے لیا تھا اور وہ بخوبی جانتی تھی کہ اس کے ہر خیال میں تائید کرنے والا عاقب ہی تھا۔

"بیٹا! اب یہ کہیں نہیں جائے گی۔ جب تک عدنان خود نہیں آجاتا۔ ہم اس کے آنے تک اپنی بچی کو ہرگز واپس بھیجنے کے روادار نہیں ہیں۔"

عاصمہ اپنے شوہر کی بات سن کر گھبرائی تھیں۔

"ارے یہ کیسی بات کی آپ نے؟ یہ بہت ہی نازک معاملات ہوتے ہیں، میں جا کر صلح کروا کے آتی ہوں جبین اپنے گھر جائے گی۔ وہی اس کا اصل گھر ہے۔" عاصمہ نے کہا۔

عاصمہ کی بات پر تو جیسے جبین کو پتنگے لگ گئے تھے۔

"اماں! آپ کو تو بس بیٹیاں بوجھ لگتی ہیں۔ آپ نے تو میرا سارا مان ہی مٹی کر دیا۔"

جبین کا لہجہ گستاخانہ سا تھا اور اس کے انداز میں جارحانہ پن تھا۔ جیسے سوچ کر یہاں آئی بیٹھی ہو کہ وہ اپنے مجازی خدا سے اپنی منوا کر ہی واپسی کی راہ لے گی۔

"تم خاموش رہو۔ ہم بھی تو ہیں۔ اپنے گھر میں نباہ کیے ہوئے ہیں۔ اس طرح ذرا ذرا سی بات پر اپنا گھر بار چھوڑ چھاڑ کر آنا کہاں کی عقل مندی ہے؟"

"اور آپ اس کی وکالت نہ کریں۔ جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے۔ معاملہ فہمی سے ہر مسئلہ سلجھایا جاسکتا ہے۔ یہ تو ناسمجھ ہے آپ تو کچھ سمجھ بوجھ سے کام لیں۔"

عاصمہ کا تو عجیب حال تھا، ایک جانب خود سر شوہر اور دوسری جانب انا پسند بیٹی تھی۔

وہ معاملہ جتنا اچھی طرح سلجھالینا چاہتی تھی۔ لگتا نہیں تھا کہ اتنی آسانی سے سلجھ سکتا ہے۔

"ٹھیک ہے۔ لیکن فی الحال یہ ادھر ہی رہے گی۔ یہ اپنے باپ پر بوجھ نہیں ہے بس کہہ دیا۔"

حامد صاحب کہہ کر رکے نہیں تھے۔ اٹھ کر اندر کمرے میں چل دیے تھے اور ان کی بات سن کر جبین نے فخریہ انداز میں اپنی چھوٹی بہن نگین کو دیکھا تھا۔ جیسے جتا رہی ہو کہ تم نے تو کوئی کسر نہ چھوڑی تھی لیکن دیکھو ابا ہمارے ساتھ ہی ہیں۔

عاصمہ بیگم کے چہرے پر شکنوں کا جال سا بچھ گیا تھا۔ تفکر زدہ نگاہوں سے ——— اپنی بیٹی جبین کو دیکھ رہی تھیں۔ جواب نگین سے اپنا پسندیدہ کھانے کا مینیو نوٹ کروا رہی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

عدنان پریشانی کے عالم میں سسرال کی طرف جا رہا تھا کیوں کہ کل سے گھر کا ماحول جہنم بنا تھا۔ جبین جھگڑا کر کے میکے چلی گئی تھی اور ساس میں گھر کے کسی کام کو کرنے کی سکت نہ تھی۔ ایک دن میں ہی گھر الٹ پلٹ ہو گیا تھا۔ اب اس کی ساس نے ہی حکم صادر کیا تھا کہ جا کر بہو کو منالاؤ، وہ اسی وقت جبین کو لینے نکلا تھا۔ لیکن اسے خوف بھی تھا کہ وہ اتنی جلدی تو نہیں مانے گی۔ ضرور نخرا کرے گی۔ اس کے اتنی جلدی مان جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس نے نور منزل پر جا کر بائیک روکی اور کال بیل پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ قدرے توقف سے اندر سے نگین نکلی تھی اسے دیکھ کر خوب گرم جوشی سے ملی۔

"عدنان بھیا! آپ آئے ہیں سو بسم اللہ۔"

اس کا حوصلہ بندھا تھا۔ اسے نگین کی یہ ہی بات بہت پسند تھی، یہ نگین اپنی باقی بہنوں سے بالکل الگ طبیعت اور فطرت کی مالک تھی، خوب گرم جوشی سے ملتی۔ عزت دیتی

عدنان کے دل سے اس پیاری لڑکی کے نصیب کے لیے دعا نکلی تھی۔ اندر سے آواز سن کر عاصمہ بیگم بھی آگئی تھیں۔

عدنان کو دیکھ کر ان کو بہت اچھا لگا تھا۔ داماد بیٹے بن جاتے ہیں اور پھر ان کی بچیوں کا سارا بار ان دامادوں کے کندھوں پر آن پڑتا ہے۔ کہ وہ اپنے دامادوں کو بھی بیٹا ہی تصور کرتی تھیں۔ انہوں نے کبھی نسرین کے شوہر تحقیل اور جبین کے شوہر عدنان میں فرق نہیں روا رکھا تھا۔ دونوں کو عزت دی تھیں۔

"بیٹا! تمہارا ہی انتظار تھا۔ میں نے قیمہ کریلے

pklibrary.com

بنائے ہیں، بچوں کی فرمائش پر پلاؤ بھی بنایا ہے۔ تم منہ ہاتھ دھولو تو سب مل کر کھانا کھاتے ہیں۔"

عاصمہ بیگم نے کہا تو عدنان گہری سانس لے کر رہ گیا تھا۔ ایک نظر اس نے اندر ڈالی جہاں جبین بے فکری سے ٹی وی پر کوئی ڈرامہ دیکھ رہی تھی، ابھی تک اسے عدنان کے آنے کی بالکل خبر نہ ہوئی تھی۔ اچانک ٹی وی کے سامنے اس کا بیٹا آ گیا تو اس نے اسے زور سے ڈانٹا تھا۔

"بالکل اپنے باپ پر گیا ہے۔ مجال ہے کہ ذرا سا بھی سکون کا سانس لینے دے۔"

جبین کے اس بے لاگ تبصرے کے بعد عاصمہ اپنی نگاہ چرانے پر مجبور ہو چکی تھیں۔ عدنان کے چہرے کے عضلات بھی اچانک ہی تن چکے تھے۔ یقیناً وہ اپنی ذات پر اتنا اعلا تبصرہ سماعت فرما چکا تھا۔

"کیا بات ہے بیٹا! رک کیوں گئے؟ اندر آؤ ناں، جانے دو اس کی تو باتیں ہی ایسی ہیں۔ میری بیٹی دل کی بری نہیں ہے۔ بس زبان کی تھوڑی کڑوی ہے ناسمجھ ہے۔"

انہوں نے معاملہ فہمی سے کہا تھا۔ تب ہی عدنان لاؤنج میں داخل ہوا تھا اور عدنان کو دیکھ کر چپس منہ میں لے جاتا جبین کا ہاتھ رک چکا تھا اور چہرے کے زاویے بگڑ چکے تھے۔ البتہ دونوں بچے بھاگ کر باپ سے جا لپٹے تھے۔ یہ تو ایک فطری عمل تھا۔ لیکن جبین کو عدنان کے ساتھ بچوں کے یہ لگاوٹ کے مظاہرے بالکل بھی اچھے نہیں لگے تھے۔

عاصمہ بیگم نے اپنی بیٹی کو گھور کر دیکھا اور سلام کرنے کا اشارہ کیا تھا۔ لیکن جبین نے سرے سے جیسے اس اشارے کو نظر انداز کر دیا تھا اور تن کر بیٹھ گئی تھی۔ عاصمہ کو سخت خفت ہوئی تھی دل میں، ملال بھی ہوا تھا، جھگڑا اور کسی بات پر ناراضی اپنی جگہ پر مگر سلام کرنا تو واجب تھا۔

انہیں سخت تاسف نے گھیرا تھا۔

"آنٹی! انکل کو بھی بلائیں۔ میں سلام دعا کرلوں۔"

عدنان نے ایک جانب بیٹھتے ہوئے کہا تھا۔ بچے اس کو گھیرے اس کے دائیں بائیں موجود تھے۔

"ارے اتنی جلدی کس بات کی ہے۔ کھانا کھا کر جانا۔ کھانا بالکل تیار ہے۔"

عاصمہ بیگم نے مہمان نوازی کا حق ادا کرتے ہوئے کہا تھا۔

"نہیں آنٹی! گھر میں امی اکیلی ہیں۔ امی نے تو دوپہر سے کچھ کھایا بھی نہیں ہے ان کی طبیعت سست ہو رہی ہے۔ میں جبین کو ـــ لینے آیا ہوں۔ گھر چل کر کچھ کھالیں گے۔" عدنان نے کہا۔

"ہاں راستے سے کچھ لینا نہیں۔ یہاں کھانے دینا نہیں۔ صاف کیوں نہیں کہتے کہ نوکرانی کی ضرورت ہے۔ اور نوکرانی بنا کر ہی لے جانا چاہتے ہیں۔ عقل ٹھکانے آ گئی نا ایک دن میں۔"

جبین کی تیز زبان کو بریک ہی نہ لگ رہا تھا۔ اتنی تیکھی زبان تھی۔ زہر میں بجھی ہوئی۔ گویا لفظوں سے لہو ٹپک رہا تھا۔ عدنان نے ایک گہری ملامتی نگاہ پہلے تو جبین پر ڈالی تھی۔ اس کے بعد عاصمہ کو پلٹ کر دیکھا تھا۔

"آپ نے اب خود ہی سب سن لیا ہے نا آنٹی! اس کی اس زبان درازی کی وجہ سے میں نالاں ہوں۔ اس کو ذرا بھی خیال نہیں کہ وہ میری ماں ہیں اور ان کے لیے کس طرح کے الفاظ استعمال کرنا چاہئیں۔"

عدنان حق بجانب تھا اور وہ خود میں شرمندہ تھیں۔

"جبین! یہ کیا انداز ہے؟ کیا میں نے تمہاری تربیت ایسے کی ہے جو تم یوں بات کر رہی ہو۔ اگر کوئی تمہاری ماں کے لیے ایسے الفاظ استعمال کرے تو تمہیں کیسا لگے گا؟"

عاصمہ کا تو تاسف ہی کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ عدنان اب بالکل خاموش ہو چکا تھا اس نے بڑے ضبط اور حوصلے سے جبین کی کڑوی کسیلی باتوں کو پیا تھا۔

pklibrary.com

"میں نے کہہ دیا نا کہ میں ان کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ جب تک ان کو احساس نہ ہو کہ میں ایک جیتی جاگتی انسان ہوں۔ کوئی ملازمہ نہیں ہوں اور امی آپ کو کیا لگتا ہے کہ یہ میری کمی یا میری محبت میں مجھے لینے کے لیے آئے ہیں۔ ان سے پوچھ لیں ان کو ان کی والدہ نے کہا تو بھاگے آئے امی! میں سب سمجھتی ہوں۔"

جبین کا لہجہ تیز ہو گیا تھا۔ اور آواز اندر لیٹے حامد صاحب تک جا پہنچی تھی۔ وہ آوازیں سن کر باہر آ گئے تھے۔

عدنان کو دیکھ کر ٹھٹک کر رک گئے تھے۔ عدنان کے چہرے پر اب خشونت آ چکی تھی۔ جبین کے تیز لہجے نے ساری نرماہٹ چھین لی تھی۔ اس کی جگہ ناگوار تاثرات نے لے لی تھی۔

عاصمہ اس وقت بیٹی کی نوکیلی زبان کے تیروں سے ہی ہراساں تھیں اور شوہر نامدار کے غصے سے بھی بخوبی واقف تھیں۔ سو پریشان تھیں۔ عدنان نے سلام کیا تو جواب میں بولے۔

"شور کیسا ہے؟"

حامد صاحب کے سوال کا جواب عدنان کے پاس تھا مگر دینا نہیں چاہتا تھا۔ سو چپ سادھ لی۔

"اپنا بیٹا عدنان آیا ہے اپنی جبین کو لینے۔ میں نے کہا کھانا کھا کر جانا۔ جاؤ جبین اپنی تیاری کر لو۔"

عاصمہ نے بیٹی کو گھورا جب اس کے تیور نہ بدلے تو عاصمہ نے منت سماجت کے اشارے کیے۔ لیکن وہ تو ٹس سے مس تک نہ ہوئی۔

"ابا جان! ان سے کہہ دیں، میں نہیں جانے والی جب تک یہ اور ان کی اماں معافی نہیں مانگ لیتے۔ میں کب تک طعنے سنتی رہوں۔"

جبین نے ماں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے باپ سے براہ راست کہا تھا۔

اور یہ کہہ کر رکی نہیں تھی اندر کمرے میں چلی گئی تھی۔ لیکن جاتے جاتے دونوں بچوں کو باقاعدہ کھینچتے ہوئے دبوچ کر اندر لے گئی تھی۔ اس کے انداز پر عدنان بھونچکا رہ گیا تھا۔ حامد صاحب نے بھی کرخت سا انداز اپنا لیا تھا۔

"کھانا کھا کر جانا۔ جبین ابھی نہیں جائے گی۔ جواز سن چکے ہو تم، میری بچی مجھ پر بوجھ نہیں ہے کہ اسے چار دن بٹھا کر کھلا نہ سکوں۔"

حامد صاحب نے بے حد روکھے انداز میں کہا تھا۔

عدنان میں ابھی اتنی غیرت ضرور باقی تھی کہ مزید وہاں نہ رکتا۔ سو ویسا ہی ہوا اس نے مزید رکے بنا واپسی کی راہ لی۔ عاصمہ بیگم کے ترلے منتیں بھی سب بے کار چلے گئے تھے۔ کیونکہ وہ اتنی عزت افزائی کے بعد رکنے والا تھا نہیں۔

☆☆☆

دنیا کی اس بھیڑ میں ہر کوئی آپ کے اندر اتر کر نہیں دیکھ سکتا ہے۔ بھری دنیا میں فقط کوئی ایک شخص ہی ہوا کرتا ہے، جو آپ کے اندر قطرہ قطرہ اترتے آنسوؤں کا ذائقہ چکھ سکتا ہے۔ اور یہ ہی نہیں ان آنسوؤں کا تریاق بھی جانتا ہے۔ اور لاعلم نگین کو سرے سے علم ہی نہیں تھا کہ کہ عاقب اپنی تمام تر چاہت کے ساتھ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ یہ ضرور تھا کہ اس نے لفظوں کی ڈوری باندھ کر محبت کی کمند نہیں ڈالی تھی۔

وہ جانتا تھا کہ نگین حساس طبیعت کی مالک ہے۔ اسے نجانے کیوں ہر کسی سے اتنی ساری شکایات تھیں - ریزہ ریزہ ٹوٹ کر بکھرتی، اس لڑکی کو وہ محبت سے گندھے خالص جذبے سے سمیٹ لینا چاہتا تھا۔

اس وقت بھی عاقب اسے عین دوپہر کے وقت کچن میں جھلستی ہوئی گرمی میں سالن بھونتے دیکھ رہا تھا۔ جانتا تھا کہ ابھی وہ اسکول سے لوٹی ہے اور اب کھانا بنانے کے بعد وہ دو گھڑی آرام اور پھر بچوں کی قطار ٹیوشن کے لیے آدھمکے گی۔ وہ سالن بھونتے ہوئے پلٹی تھی جب اس کی نگاہ عاقب پر جا پڑی تھی، جو اشتیاق سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ چھ فٹ سے بھی

pklibrary.com

زیادہ لمبا نکلتا قد، بے حد گوری رنگت اور چہرے پر محبت کی نرماہٹ لیے وہ وہیں دروازے کے پاس ایستادہ تھا۔

"خیریت تو ہے نا؟ کیا تم نے بھی کوئی فرمائش کرنی ہے۔ جب سے آپی کی انٹری ہوئی ہے نا، بھی کوئی فرمائش اور بھی کوئی فرمائش، آج ـــــ بھنڈی کا جی للچایا ہے۔ مجال ہے کہ ذرا سا کچن میں جھانک لیں۔

صبح سے اماں، ان کے بکھیڑے سمیٹ رہی ہیں۔ ہفتہ ہونے کو آرہا ہے مگر ان کے تو کانوں پر جوں تک نہیں رینگی۔ اللہ اتنا ڈر لگ رہا ہے دوسری جانب سے بھی خاموشی چھا چکی ہے۔ عدنان بھائی نے آنا تو درکنار پھر فون تک نہیں کیا۔"

دن رات کی مصروفیت کے بعد، اتنے دنوں بعد عاقب دکھائی دیا تو وہ بلا تکان بولتی چلی گئی تھی۔ اور جانتی بھی تھی کہ سننے والا وہی ایک واحد ہے۔

"تم فکر نہ کرو اس کا بھی کوئی نہ کوئی حل نکال لیتے ہیں۔ میں تو یہاں سے گزر رہا تھا تمہیں کام کرتے دیکھ رک گیا تھا۔ میں کہہ رہا تھا کہ میں تازہ روٹی لگوا لاتا ہوں۔ اتنی گرمی میں کہاں بناتی رہوں گی۔ تم بس سالن ہی بنالو۔"

عاقب نے کہا تو اس کے چہرے پر لمحہ بھر کے لیے حیرت اور پھر ہلکی سی مسکان چھا گئی تھی۔

"سچی یہ تو، نیکی اور پوچھ پوچھ؟ جلدی جاؤ جا کر یہ لگوا لاؤ۔ اور ہاں آتے ہوئے آپی کے نمونوں کے لیے، آئس کریم لیتے لانا کل سے کان کھا رہے ہیں اور پھر نہ لے کر دی تو اماں سے ابا تک یعنی، شاہی سواری تک خبر، شکایت کی صورت جا پہنچے گی۔ ٹھہرو میں پیسے لاتی ہوں۔"

وہ چولہے کی آنچ ہلکی کرتے ہوئے بولی تھی۔

"بس کردو نگین! تمہاری یہی غیریت کی باتیں اجنبیت کی دیوار کھڑی کر دیتی ہیں۔ اب کیا میں تم سے بھی پیسے لوں گا؟"

وہ ناراض ہوا تھا۔ اور وہ فقط کندھے اچکا کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

ایک شام اڑوس پڑوس سے کوئی خاتون نگین کا رشتہ لے آئی تھیں۔ لڑکا بہت پڑھا لکھا تھا۔ سلجھا ہوا گھرانہ تھا۔ لمبا چوڑا کوئی خاندان بھی نہ تھا ـــ اکلوتا تھا اور ساس سسر تھے۔ ان لوگوں کو نگین بے حد پسند آئی تھی۔ نگین سے پوچھنے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ عاقب کی والدہ نے، سخت برا منایا اور عاصمہ سے کہا کہ انہوں نے تو ہمیشہ سے، نگین کو اپنی بہو بنانے کا خواب دیکھا ہے۔

"ہاں تو بات ٹھیک ہے آپ کی۔ عاقب گھر کا دیکھا بھالا لڑکا ہے۔ نیک سیرت ہے۔" جبین نے لقمہ دیا۔ اس دن اماں بھی خوب جوش میں تھیں۔

"زینب بہن! میں نے بھی عاقب کو بطور داماد ہی دیکھا۔ اپنے بیٹے جیسا ہے۔ مجھے بھلا کیا اعتراض لیکن ماں ہوں نا، تو ــــ آپ کی جانب سے ہی بات شروع ہوتی، تو مناسب ہوتا میں تو انتظار میں تھی۔"

عاصمہ نے بھی خوش دلی سے کہا تھا۔ زینب اور عاصمہ آنے والے دنوں میں آپس کے رشتے کی مزید مضبوطی کے تصور سے ہی نہال ہو رہی تھیں۔ جب نگین کو معلوم ہوا تو اس کو تو صدمے سے چپ ہی لگ گئی تھی۔

اس کی خاموشی کو سب، اس کی شرم پر محمول کر رہے تھے۔ لیکن اس کی چپ زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکی تھی۔ ایک دن جب عاصمہ بیگم باقاعدہ منگنی کی تیاریاں کر رہی تھیں وہ آن دھمکی تھی۔

"اماں! جا کر زینب چچی کو صاف صاف کہہ دیں کہ میں عاقب سے شادی نہیں کروں گی۔"

نگین نے کہا، اس کا انداز دوٹوک تھا۔ عاصمہ جو اس وقت گلابی دوپٹے کو گوٹا لگا رہی تھیں۔ قدرے تحیر سے اپنی بیٹی کو دیکھا تھا۔ آیا کہ وہ مذاق تو نہیں کر رہی ہے۔

پاس ہی بیٹھی ہوئی جبین کو بھی پانی پیتے پیتے

اچھولگ گیا تھا۔
"یہ کیابات ہوئی بھلا؟"
جبین کی تو سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ اعتراض کرے تو کیسے کرے۔
"تم ہوش میں تو ہو؟"
"کیا بک رہی ہو؟ اب ایک تم رہ گئی تھیں۔ اب تم بھی ماں کو مایوس کردو؟" عاصمہ جھنجلا گئی تھیں۔
وہ تو اپنی دانست میں رشتہ پکا کیے بیٹھی تھیں۔ ساری بات طے شدہ تھی۔ گھر کا بچہ تھا۔ سعادت مند خدمت گزار اور نیک بھی۔
"میں نے اپنی رائے دی ہے۔ اور مجھے لگتا ہے کہ شادی بیاہ میں ان دونوں فریقین کی آرا کو ضرور مقدم رکھنا چاہیے۔ جو آپس میں ایک زندگی گزارنے جارہے ہوں۔ مجھے عاقب سے شادی نہیں کرنی ہے۔"
اس کا انداز اتنا قطعیت بھرا اور دوٹوک تھا۔ زینہ عبور کرتا ہوا عاقب جو نیچے کسی کام سے آرہا تھا اپنے حوالے سے، نگین کے منہ سے یہ جملہ سن کر دم بخود رہ گیا تھا۔
اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ نگین نے اس کا نام لے کر انکار کیا ہے۔ وہ تو دو دن سے اتنا خوش تھا کہ بن مانگے اس کی مراد پوری ہونے جارہی تھی۔
"کیا عیب ہے عاقب میں؟ کیا وہ تمہیں پسند نہیں ہے؟"
جبین نے تیز لہجہ میں پوچھا تو نگین نے تیزی سے جواب دیا۔
"ہاں نہیں پسند مجھے۔"
اس کے واشگاف جواب کے بعد عاقب میں مزید کچھ سننے کا حوصلہ نہیں رہا تھا۔ اس لیے جیسے آیا تھا ویسے ہی الٹے قدموں لوٹ گیا تھا۔
"اور امی، عاقب میں کوئی عیب ہو یا نہ ہو۔ کیا میری رائے میری مرضی کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ میں اپنی آدھی زندگی تو اپنی دو بڑی بہنوں میں پستی چلی آرہی ہوں۔ اب مزید نہیں پس سکتی۔
ان دونوں بہنوں کو تو عادت ہے ہر دوسرے دن آکر بیٹھ جانے کی۔ خدمتیں کروانے کی لیکن میں اس گھر میں رہ کر مزید ان کے نخرے نہیں اٹھاسکتی۔ آپ اس دوسرے رشتے کے لیے ہاں کردیں۔ میں شادی ادھر ہی کروں گی۔ کم از کم اس جنجال سے تو جان چھوٹے گی۔"
اس نے ہر لحاظ، مروت بالائے طاق رکھ کر کہا تھا اور وہ ایسا کرنے میں اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتی تھی۔ اتنے دنوں سے جبین یہاں آئے بیٹھی تھی۔ لیکن اس کا آرام ختم ہونے میں نہیں آرہا تھا۔ اس کی وجہ سے گھر میں راشن ختم ہو چکا تھا، بچے کھانے پینے کے عادی تھے۔ ہمہ وقت ان کے تقاضے ہوا کرتے تھے۔ کبھی فرائز بنواتے کبھی نوڈلز۔
سخت پریشانی کے دن تھے جو گھر والے کاٹ رہے تھے۔ پہلے تو کچھ بچت ہوجاتی تھی۔ اب تو اس کی ٹیوشن کے پیسے بھی ختم ہو چکے تھے۔ اب وہ مزید ایسی زندگی نہیں چاہتی تھی کہ جس میں اسے مزید گھلنا پڑے۔ یا قربانی کا بکرا بننے۔ پر مجبور کیا جائے۔
"امی دیکھ رہی ہیں کتنی لمبی زبان چل رہی ہے اس کی۔ ہمارا آنا اس کو کتنا کھلتا ہے میں خود پکالوں گی۔"
جبین نے دوبدو کہا تھا۔ جو نگین کو آگ کی طرح لگا تھا۔
"یہ بھی ایک طعنہ ہے یہ خود پکائیں گی۔ امی! ان کو پہلے یہ تو بتادیں کہ آج آخری ہزار روپے تھے مہینے کے، جو آپ نے ان کے لاڈلے سپوت کی فرمائش پر برگر منگوا کر دے دیے ہیں۔ بڑی آئیں پکانے والی۔ کیا یہ کسی اور گھرانے سے بیاہ کر گئی ہیں اسی گھر سے گئی ہیں جو حالات کا علم نہیں۔"
نگین نجانے کہاں کہاں کا سارا غصہ، غبار دل سے نکال رہی تھی۔
جبین تو منہ کھولے حق دق اپنی بہن کی زبان درازیاں ملاحظہ کررہی تھی۔
اس کے بعد وہ رکی نہیں تھی۔ اماں کی منت سماجت، روکنا سب بے کار گیا تھا نگین کچھ دیر تو جبین

pklibrary.com

کے اس نخرے کو دیکھتی رہی لیکن پھر تھک ہار کر خود کو کمرے میں جا کر بند کر لیا تھا۔ پھر اماں کی فکر اور احساس میں اس نے اندر کا لاک کھول دیا تھا۔

جبین نے فون کر کے عدنان کو بلا لیا تھا۔ اس کی ساری اکڑ فوں نکل چکی تھی۔ سارا رعب و دبدبہ ملیا میٹ ہو چکا تھا۔ عدنان بھی شاید اس کی جانب سے اسی طرح کی کسی پیش قدمی کا منتظر تھا، سو اس نے ذرا بھی دیر نہ کی تھی، اسی شام اپنے بیوی بچوں کو لینے کے لیے آ گیا تھا۔

دونوں کی عقل اتنی مدت میں ٹھکانے پر آ چکی تھی اور خود جبین، کون سا ساری زندگی کے لیے آ گئی تھی۔ حامد صاحب عدنان کو دیکھ کر بری طرح سے چونک گئے تھے۔

"ارے عدنان میاں کو کس نے بلوایا ہے؟"

وہ کچھ تعجب سے پوچھ رہے تھے۔ عاصمہ نے خاموشی اختیار کی تھی۔

دل سے وہ بھی نگین سے خفا ہو چکی تھیں۔ مانا کہ ہاتھ تنگ ہوتا تھا مگر وہ اپنے نواسوں کے لیے دل کھول کر خرچ کرنا چاہتی تھیں۔ اس لیے نگین کے سخت جملے ان کو گراں گزرے تھے۔ وہ نگین سے کلام کرنا تو دور کی بات اس کی شکل تک دیکھنے کی روادار نہ تھیں۔

"اپنی بیٹی نگین سے پوچھیں ابا جان! مجھے تو احساس نہ ہوا کہ کب میرے اور میرے بچوں کے دو لقمے آپ پر بھاری پڑ گئے کہ آج مجھے اپنی ہی چھوٹی بہن سے تنی باتیں سننا پڑ گئی ہیں۔" جبین جب ابا سے ملنے کے لیے آئی تھی وہیں ابا نے اس سے پوچھا تھا۔

ابا جان کا دل برا تھا۔ عدنان سے ملنے کو جی نہ چاہتا تھا، دوسرا وہ کچھ کشمکش میں مبتلا تھے کیونکہ خود انہوں نے، منظر دیکھا کہ جبین مسکرا مسکرا کر اس کو جواب دے رہی تھی۔

اب کمرے میں جاتے وقت ملنے کے لیے آئی تو ابا جان پوچھے بنا نہ رہ سکے تھے۔

"نگین نے کیا کہا ہے اس کا کیا حق ہے کہ اس معاملے میں کچھ بھی بولے۔"

"ابا جان! اب آپ نے ہی جب ملنا ہو آ جایا کریں۔ ہم نہیں آنے کے۔ اور ہاں اماں جو خرچا ہوا ہے اور جو روپے نگین کے لگتے رہے ہیں وہ میں جلد لوٹا دوں گی۔ ابھی عدنان کے سامنے بھرم رکھنا چاہتی ہوں۔ ان کو یہی کہا ہے کہ بچے اداس تھے۔"

جبین کی نم آلود آنکھیں دیکھ کر خود عاصمہ کا دل بھی ہولنے لگا تھا۔ بیٹی کو اس طرح وداع کرنے کا کب سوچا تھا۔ شادی جب رخصت کیا تھا وہی منظر ان کی نگاہوں میں گھومنے لگا۔ عدنان عاصمہ اور حامد صاحب سے مل کر ان کی رضامندی سے اپنے بیوی بچوں کو لے گیا تھا۔

☆☆☆

گھر میں اچانک ہی اتنی خاموشی چھا گئی تھی۔ اماں چپ تھیں۔ ابا اپنی ہی سوچوں میں گم صم اور خود وہ چور بن گئی تھی اور سب سے بڑھ کر تین دن بعد بھی اوپر سے عاقب اور نہ ہی چچی زینب نے جھانکا۔

گویا اس کا انکار اوپر جا چکا تھا۔ جب سے اس سے خفا ہو کر جبین گئی تھی۔ احساس جرم زیادہ ہی اٹھنے لگا تھا۔ ضمیر کے کچوکے جب دل پر لگتے ہیں تو نیلو نیل کر دیتے ہیں۔ چھٹی کا دن تھا۔ جب بہت دنوں بعد اس نے عاقب کو ٹریک سوٹ میں ملبوس اخبار کے مطالعے میں مصروف دیکھا تھا۔

یہ ان کے گھر کا ایک حصہ تھا۔ یعنی اس نے کرسی بھی اپنے حصہ میں بچھا رکھی تھی۔ نگین نے اسے دیکھا تو دل نے ایک عجیب ہی لے پر دھڑکنا شروع کر دیا تھا۔ اب جب کہ سب اس سے بول چال بند کر چکے تھے۔ عاقب اور زینب چچی نے بھی رشتے کے لیے اصرار کرنا ترک کر دیا تھا۔ نجانے کیوں اس کے دل کو گہرے ملال نے گھیر لیا تھا وہ خود کو سنبھالتی قدم قدم چلتی ہوئی اس کے عین پاس جا پہنچی تھی۔ وہ شاید جان کر بھی اس کی آہٹ سے انجان بنا اخبار کی سرخیوں میں گم بیٹھا رہا۔ حتیٰ کہ اسے گلا کھنکھار کر اسے متوجہ کرنا پڑا تھا۔ اتنے فاصلے تو کبھی بھی نہ تھے درمیاں۔ فضا میں ایک عجیب سی سوگواریت تھی نگین کو

pklibrary.com

بھی ایسا محسوس ہو رہا تھا۔

"کچھ کہنا چاہتی ہو۔"

عاقب نے براہ راست اس کی نگاہوں میں جھانکا تھا۔

آج کا عاقب، اس عاقب سے تو بہت ہی مختلف دکھائی دے رہا تھا جو اس کے کام بھاگ کر تا تھا۔ اس کی پرواہ کرتا تھا۔ اس کے لیے ہلکان رہتا تھا۔ آج عاقب کی نگاہ میں حد درجہ اجنبیت کا بسیرا تھا۔ وہ خود بھی جھجک کر رہ گئی تھی۔

میری آنکھوں کو اب رہائی دے
مجھے ہر طرف نہ تو دکھائی دے

وہ دل میں سوچ کر، اس کو زیادہ دیر تک نہ دیکھ سکا تھا اس لیے اخبار تہ کرنے لگا تھا۔

"کیا تم مجھ سے ناراض ہو؟ ادھر اماں نے بھی قطع کلامی کر رکھی ہے۔ میں کس کس کو راضی کروں؟ کیا میری خوشی کوئی معنی نہیں رکھتی، سب مجھے ہی کیوں موردالزام ٹھہرا رہے ہیں؟" وہ روہانسی ہو کر بولی تھی۔

"کون موردالزام ٹھہرا رہا ہے؟ میں یا میری اماں؟ امی کو میں نے سمجھا دیا ہے کہ تم اس جگہ رشتے کے لیے راضی نہیں ہو۔ اور ہی بات اس رشتے کی جو آیا تھا۔ میں نے خود کہہ دیا ہے آنٹی سے، وہ لوگ جلد ہی تاریخ لینے آجائیں گے اور ہاں۔"

وہ جاتے جاتے کہتے پلٹ کر رکا تھا۔

"میں نے یہ ہی کہا ہے کہ میں ہی اس رشتے کے قابل نہیں ہوں۔"

وہ یہ کہہ کر مزید نہیں رکا تھا اور نگین کو لگا تھا کہ جاتے جاتے جیسے وہ اس کی روح بھی، ساتھ کھینچ کر لے گیا ہو۔ کچھ لوگ اتنے ہی دل کے قریب ہوتے ہیں کہ ہمیں اس وقت تک جب تک نظروں کے آس پاس بستے ہیں احساس تک نہیں ہوتا اور جب وہ نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں تو گویا، دل ڈوبنے لگتا ہے، نبض مدھم پڑ جاتی ہے، فضا کے سارے رنگ مدھم پڑ جاتے ہیں۔

وہ اپنی نمناک نگاہیں لیے وہیں کافی دیر تک کھڑی رہی تھی۔ اس کا دل دھواں دھار رونے کو چاہ رہا تھا۔

اس کا خاص الخاص دوست آج اس سے خفا ہوا تھا۔ وہ جو کبھی اس کے ایک آنسو کو برداشت نہیں کرتا تھا۔ آج کیسے منہ موڑ کر گیا تھا۔

"قصوروار تو میں ہوں۔ قصور تو سارے میرے ہیں۔ میں نے ہی آپا کو رلایا۔ ابا کو اماں کو شرمندہ کروایا۔ عاقب کی محبت سے میں کیسے دستبردار ہو سکتی ہوں؟ وہ تو میری روح میں ہے۔"

☆☆☆

اماں نے دوبار اس کے کمرے میں جھانکا تھا۔ مغرب کا وقت ہونے کو آیا تھا مگر وہ کمرے سے باہر ہی نہ نکلی تھی۔ اماں کا تو جی ہولنے لگا تھا۔ جھٹ قریب بیاہی بڑی بیٹی کو بلایا کہ دیکھو کیا معاملہ ہے۔ دل ابھی تک میلا ہی تھا۔ نسرین بچوں کے ساتھ بھاگی آئی تھی۔

کمرے میں جا کر دیکھا تو وہ نیم بے ہوش سی پڑی تھی۔ تپ رہا تھا سارا وجود۔

"اماں! اس کو تو اتنا تیز بخار ہے۔ اتنی بھی کیا لاپروائی؟" نسرین نے ناراضی سے کہا۔

"ہائے میری بچی، جا عاقب کو بلا لا، تیرے ابا تو گھر پر ہی نہیں۔" پانی کے چھینٹے بھی مارے گئے مگر وہ ہوش میں ہی نہ آرہی تھی۔ عاصمہ کا تو رو رو کر برا حال تھا۔

"میری بچی! میں کب تجھ سے خفا ہوں، تو نے کیا حال بنالیا۔"

وہ رو رہی تھیں جب نسرین اوپر گئی تو عاقب اور زینب چچی چائے پی رہے تھے۔ مگر اب بتانا بھی ضروری تھا۔

"ماشاء اللہ نسرین بیٹی! کب آئیں معلوم ہی نہیں ہوا؟"

زینب چچی نے مسکرا کر کہا تھا۔ عاقب نے سلام کیا۔

"آؤ بیٹی! چائے پیو، ساتھ میں یہ پکوڑے بھی کھاؤ۔"

pklibrary.com

زینب چچی بہت ہی ملنسار طبیعت کی مالک تھیں۔

"نہیں چچی! میں عاقب کو بلانے آئی تھی۔ نجانے نگین کو کیا ہوا ہے، بے ہوش پڑی ہے۔ تیز بخار میں جل رہی ہے۔ اماں نے بلایا تو میں بھی دوڑی چلی آئی۔"

نسرین نے اپنے تھکے ماندے وجود کو قریبی دیوار کا سہارا دیا تھا۔ عاقب کے کپ سے چائے چھلک گئی تھی۔ اس نے سرعت سے کپ میز پر رکھا اور بنا کوئی لفظ کہے نسرین کر۔ پیچھے چھوڑتا ہوا، نیچے کو لپکا تھا۔

زینب اور نسرین نے ایک دوسرے کو تحیر اور ذومعنی انداز میں دیکھا تھا۔

عاقب کی بے قراری بہت کچھ عیاں کر گئی تھی نسرین بھی پیچھے پیچھے ہولی تھی۔

عاقب اسے ہوش میں لانے کے طریقے آزما رہا تھا۔ کسی کو کیا معلوم تھا کہ اس ساری صورت حال میں اس کا دل بھی کچلا جا رہا تھا۔ اسے بخوبی احساس ہو رہا تھا کہ اس کے ناروا سلوک کی وجہ سے نگین کی یہ حالت ہوئی ہے۔ وہ اس سے ہمیشہ کی طرح نجانے کیا کہنے، دل کا غبار نکالنے آئی تھی۔ لیکن کچھ کہہ نہ سکی۔ الٹا مزید بوجھ عاقب نے اس کے کندھوں پر ڈال دیا تھا۔

☆☆☆

اس ایک صبح میں جب نگین کو احساس ہوا کہ وہ عاقب کے بنا ادھوری ہے۔ اس صبح کی شام میں عاقب کو نگین جب بخار میں بے ہوش ملی اسے لگا اب جینے کا کوئی جواز ہی نہ رہا ہو۔ جب محبت کی شدت دونوں جانب برابر ہو تو رفیق زندگی بننے کے سوا کچھ حاصل نہیں۔

نگین کو نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا۔ ڈاکٹرز نے بتایا کہ وہ شدید ڈپریشن کا شکار ہے۔ اور جب نگین ہوش میں آئی تو اس نے رو رو کر سب سے پہلے اماں سے معافی تلافی کا سلسلہ شروع کیا جو جبین سے ہوتا ہوا عاقب تک جا پہنچا تھا۔ عاصمہ تو اس کی صحت مندی پر ہی خوشی سے نہال تھیں۔

"پگلی تو روتی کیوں ہے؟ کون سا دیر ہوئی ہے میں نے پہلے ہی دوسرے رشتے والوں کو انکار کر دیا تھا۔ میں ماں ہوں۔ میں جانتی تھی کہ تو صرف ضد میں ایسا بول رہی ہے اور تیری خوشی عاقب کے ساتھ میں ہی ہے۔ ہم سب تو یونہی چپ تھے کہ تو کب عقل سے کام لے۔"

عاصمہ بیگم نے کہا تو اس کے دل سے منوں بوجھ جیسے اتر گیا تھا۔

"مگر جبین آپی تو خفا ہیں ناں۔"

اس کے چہرے پر زردی چھائی ہوئی تھی۔

"نہیں بیٹا! وہ تو بہن ہے، بہنوں میں تو اونچ نیچ ہو ہی جاتی ہے۔ وہ تو کل بھی مجھ سے کہہ رہی تھی کہ نگین کو معاف کر دیں۔ وہ سچ کہہ رہی تھی۔ ساری غلطی میری ہی تھی۔ میں نے نصیحت حاصل کر لی ہے۔ اب مجھے احساس ہوا ہے کہ وہ چھوٹی ہو کر بھی ہم سے زیادہ سیانی ہے۔"

عاصمہ کا ساتھ حوصلہ نگین کے لیے بہت تقویت کا سبب تھا۔

"تم سے دوری سوہان روح ہے نگین! تم دوبارہ ایسا مت کرنا۔"

ایک بے ساختہ سا شکوہ عاقب کے لبوں سے پھسلا تھا۔ اور اس درد کی انتہاؤں میں اس نے بے ساختہ ہی عاقب کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں کسی شکنجے کی مانند کس لیا تھا۔ جیسے بچھڑ جانے کا خوف ہو۔

☆☆☆

اور آج نکاح کے بندھن میں بندھنے کے بعد وہ دونوں ایک ہو چکے تھے۔ بھانت بھانت کے چہروں کے درمیان دو چہرے بہت خوش تھے۔ خوشی کا محور فقط محبت تھی۔ اس وقت بیک گراؤنڈ میوزک چل رہا تھا۔

تیرے جیا ہوا کوئی نا

عاقب نے شوخی سے نگین کو دیکھا تھا وہ نظر جھکا گئی تھی۔

☆☆

pklibrary.com

نپا تلا سا کوکنگ آئل کڑاہی میں ٹپکا کر بگھار کے لیے پیاز چھیلتے میری آنکھوں میں اک جلن سی اتر آئی تھی۔ کڑاہی میں کڑکڑاتے تیل میں پیاز جھونک دی۔ ڈھیر سارا دھواں کچن کی چھت کو جا کر لگا۔ میری آنکھوں کی جلن دگنی ہوگئی۔ اور میرے اندر ٹھہرے کسی آنسو کو رستہ مل گیا۔

محسن...... اور بچوں کے سدھارنے کے بعد صبح کا وقت میرا اپنا ہوتا۔ ماسی جھاڑ پونچھ بھگتاتی میں کچن میں جا گھستی۔ صبح سے شام تک کا کچن کا کام بھگتاتے بھی بہت کچھ بچ جاتا۔ رات میں ہم سب اکٹھے ہوتے۔ ڈائننگ ٹیبل بجتی تو میری پکار بار بار پڑتی۔ ان آوازوں میں میرے لیے زندگی تھی۔ بچے قد برابر ہوگئے۔ کالج یونیورسٹی جانے لگے۔ مگر فرمائشیں وہی بچوں جیسی۔ آج یخنی پلاؤ کی فرمائش تھی۔ جو دہی کا رائتہ پودینے کی چٹنی کے بغیر ادھوری رہتی۔ یہ تال میل مجھے کائنات کی ہر شئے میں نظر آتا۔ میری عمر

سیما بنت عاصم

محبت ریت جیسی تھی

pklibrary.com

چوتھی دہائی کراس کرگئی تھی۔اس عمر میں حافظہ جواب دے ہی جاتا ہے۔صبح ہی پھیری والے سے اتنا کچھ خریدا۔مگر رائتہ ـــــ کے لیے پودینہ نہیں تھا۔پلاؤ دم دے کر ماسی کو پودینہ کے لیے دوڑایا تو کچھ لمحات میسر تھے۔پیڈسٹل فین کی ٹھنڈی ٹھار ہوا سے وجود کی تپش کم ہونے لگی۔حواس ٹھکانے آئے۔جانے کیوں آنے بہانے میری نظر میں بار بار ماضی گھومتا تھا۔

کیسی خوش باش مگن سی ہوا کرتی تھی۔گرمیوں کی طویل دوپہروں میں کمرہ بند کیے بے فکری کی نیند سویا کرتی۔شاید یوں کہ تب زندگی،نون،تیل،لکڑی کی چک پھیریوں میں نہ الجھی تھی۔میرے اندر کی عورت وہی وقت تلاشتی۔شاید شادی کے بعد ہر عورت کا اپنا آپ کہیں گم ہو جاتا ہے۔وہ وقت آنکھوں میں پھر جاتا تو اک ہوک سی اٹھتی۔تب گمان بھی نہ تھا۔کہ زندگی بھی یہ وقت بھی دکھائے گی۔شوہر کے نام پر اک مٹی کا مادھو۔لگی بندھی روٹین، اخبار،ناشتا،بینک،شام کی چائے اور لیپ ٹاپ، بیوی کی حیثیت وہی تھی کہ موسم یا مہنگائی کا احوال جانچنے کے لیے اخبار کے کسی کونا پر نظر ڈال لی جائے۔پٹرول کا خرچ رکھ کر جیب جھاڑ۔بے فکری کی نیند سوتے کہ بعد کی فکرات میرے سر تھیں۔اور یہ بے فکری محسن کی ساری زندگی پر محیط تھی۔بینک سدھارتے ہر روز کچھ نہ کچھ بھول جاتے۔تو پارکنگ سے پکار پڑتی،میں اپنے بیڈروم سے ملحق بالکونی سے اچھال دیتی۔شاید میں بھی یوں ہی اچھال کر بخشی ہوئی کوئی چیز رہی۔

میں ایک پھول تھا وہ مجھ کو رکھ کے بھول گیا
تمام عمر اسی کی کتاب میں گزری!!

پروردگار نے انسان کو جوڑے کی شکل میں تخلیق کیا۔مگر قدرت کی تال میل کا یہ فلسفہ مجھے آج تک سمجھ میں نہیں آیا کہ۔وہ لوگ دل میں اترتے ہی کیوں ہیں۔جن سے قسمت کے ستارے نہیں مل پاتے۔

میری آنکھوں میں نمی تیرنے لگی تھی۔

ماضی سب کا ہوتا ہے۔محسن کا بھی تھا۔اور اس ماضی سے جڑا اک حوالہ مجھ پر کھلا۔تو یوں جیسے شادی کی پہلی رات گھونگھٹ اٹھا کر نئی نویلی دلہن کو اس کا ہم سفر مژدہ سنا دے کہ میرا سب کچھ تمہارا ہے۔سوائے دل کے اور میں اس دل کو اپنے نام کرنے کے لیے سر پٹختی رہتی،ایسی بھی نادان نہ تھی سو مرد اپنے اختیارات میں کتنا بے پروا ہوتا ہے۔مصلحتوں کی ماری عورت کے لیے لفظوں ہی نہیں۔احساسات پر بھی تالے ڈال کر رکھنا۔اک مجبوری ٹھہری،محسن عام سے انسان تھے۔اور عام لوگوں ہی جیسے تھے شاید قلب ونظر میں بھی سما ہی جاتے۔اگر ان کی ذات کی ایک پرت نہ کھلتی۔

گزرتے وقت کے ساتھ محسن کے وجود پر۔پرتیں ہی پرتیں چڑھتی چلی گئی تھیں۔اور میں سوچتی یہ خودکار مشین نما انسان کیوں کر رومانس بگھارتا ہوگا۔اس نے پہلے پیار کا اظہار کیسے کیا ہوگا۔شاید کوئی پھول دیا ہو یا رنگ۔یا اس کی خوب صورتی کو دان کرتے جملے۔پرانی کتاب کے کسی اولین ورق پر اس کا نام اب بھی درج ہو۔میرے حصے میں تو بس عذر آئے۔جواز آئے۔اصول آئے۔معاملہ محبت کا ہو تو عورت کے بالوں میں دھوپ بھر جانا کس کو نظر آتا ہے۔مرد کا کمر جھکا لینا کمال ہے۔اور کمال کیا ہوتا ہے۔سو محسن میرے ہم سفر تھے۔

سالوں گزر گئے۔میرے اندر نا قدری و نارسائی کے احساس پر مٹی پڑتی چلی گئی تھی۔مگر اک ان جانا سا احساس سر اٹھانے لگا تھا کسی گم گشتہ یاد کا دیا نئے سرے سے جل اٹھا۔

ماضی سے وابستہ اک دلکش حوالہ اور اس سے جڑے زنگ آلود لمحات زندہ ہوکر آنے بہانے میرے سامنے آن کھڑے ہوتے۔اور پل میں...... میں وہیں پہنچ جاتی۔یوں جیسے دن ڈھلے لان کے پیڑوں کی آبیاری کرتے کوئی ہاؤ کر کے چونکا دے گا۔یا عقب سے میری آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر ہٹائے گا تو

pklibrary.com

سب کچھ روشن۔ اجلا نظر آنے لگے گا۔ اور میری وہی اک سرخوشی۔

''ارے حارث! تم آ گئے؟ پتا بھی نہیں چلا۔''

امی نے تیل شیمپو رگڑ کر بال گھٹنوں تک بڑھا دیے تھے۔ حارث ساری کی ساری چوٹی ہاتھ پر لپیٹ لیتا تو میں سٹ پٹا اٹھتی۔

''ارے چھوڑو کوئی دیکھ لے گا۔''

صد شکر کہ کبھی کسی نے نہ دیکھا۔ نہ وہ مناظر، نہ میرے اندر جلتا چاہت کا دیا۔ رشتہ تو ٹیوٹر کا بنتا تھا مگر وہ خود بی کام کا اسٹوڈنٹ تھا۔ چند ہی دنوں میں سالوں کے فاصلے سمٹ گئے تھے۔ لان کے کسی گوشہ میں پیپل کی نرم ٹھنڈی چھاؤں تلے بید کی کرسیوں کے درمیان میز پر کتابیں اور اس کا سونیا جی کہنا، اس وقت کو سوچوں تو اک ٹھنڈک سی وجود میں اترتی چلی جاتی ہے۔ الجبرائی سوال سلجھاتے زندگی کب الجھ گئی۔ پتا ہی نہیں چلا۔ سولہ کا سن تھا۔ چہرہ پر کشش آنکھیں خواب دیکھتی ہیں۔ ان خوابوں میں میری زندگی تھی۔ پاپا جیسے مکمل مرد کو آئیڈیلائز کرتی اور حارث نے ایک بار کہا کیا تھا۔

''زندگی کا ساتھی من چاہا مل جانا بھی آپ کی خوشیوں سے مشروط نہیں ہے۔'' تب سنتا کون تھا۔ کچی عمر کی نادان محبت کا خمار سر چڑھ کر ناچتا۔

گنتی تو ہزاروں پر آتی تھی۔ وہ حساب نہ سکھاتا تو آج سب کچھ کتنا بے ترتیب ہوتا۔ بجٹ ترتیب دیتی۔ بچوں کی فیسز۔ یومیہ خرچ۔ یوٹیلٹی بلز۔ یہ وہ۔ حساب کے ان سوالات میں زندگی آج بھی چکراتی تھی۔

محبت مختصر بھی ہو
تو یہ سچ ہے
کسی کو بھول جانے میں
زمانے بیت جاتے ہیں

بہت کم وقتوں میں کچی عمر کی محبت کا ڈراپ سین حارث امتحانات سے نتائج کے درمیانی وقفہ میں اپنے گاؤں سدھارا۔ وہ موبائل فون کا دور تو تھا نہیں کہ خبر رکھتے، فاصلے سمٹ جاتے۔ میں برہا کی ماری۔

وصال کی گھڑیاں گنتی رہی میٹرک کے بعد انٹر بھی بھگتا لیا۔ وہ گاؤں سے واپس نہ لوٹا۔ مگر میری محبت پر امید ہی رہی۔ انتظار کا دیا بجھنے ہی نہ دیتی۔

کہ فیصل آباد سے خالہ میرا ہاتھ مانگنے چلی آئیں۔ لڑکا دیکھا بھالا بینکر تھا۔ امی کو اور کیا چاہیے تھا۔ میرے کانچ سے خواب اک اک کر کے ٹوٹتے چلے گئے تھے۔ ایسے ہی وقتوں میں امی نے مجھ سے کہا تھا۔

''انسان جو سوچتا ہے۔ وہ ہوتا نہیں ہے۔ ہوتا وہ ہے۔ جو کبھی سوچا بھی نہیں ہوتا۔ یہی تقدیر ہے۔''

اور میرے اندر اک ٹھہراؤ سا اتر آیا تھا۔ انتظار کا کوئی جواز بھی تو ہو۔ کبھی کوئی دلاسا۔ کوئی وعدہ میرے آنچل سے نہ باندھا تھا۔ بات شادی تک آئی ہی نہ تھی کہ وہ خود اسٹوڈنٹ تھا۔ مگر اس محبت کے نقش پختہ تھے۔

میں بیاہ کر فیصل آباد چلی آئی۔ مگر اپنا آپ وہیں کہیں چھوڑ آئی۔ اس یاد سے وابستہ اک کسک بار بار سر اٹھاتی۔ شاید کبھی وہ لوٹا ہو۔ تو میرے بارے میں سن کر یہی سوچتا ہوگا کہ میں نے پیسہ کی کھنکھناہٹ کو اپنے خواب وفا۔ محبت دان کر دی۔ اپنے میکہ فون کرتی تو ذہن و دل میں سر اٹھاتے سوالات لبوں تک آتے دم توڑ جاتے۔ کراچی جاتی تو محتاط سی۔ ڈری سہمی۔ چھپتی سی پھرتی۔ یکدم جو کبھی وہ سامنے آن کھڑا ہوا تو کیا جواز تراشوں گی۔ کیوں کر اپنے احساسات عیاں کر پاؤں گی۔

فریم میں جڑی۔ شادی کی پرانی تصویر میں ہمارے چہروں پر بہت کچھ مصنوعی تھا۔ پھر یہ مصنوعی پن زندگی میں ہی در آیا۔ سال بھر میں میری گود میں ہانیہ ہمکنے لگی تھی۔ ہاں اس لفظ کے ساتھ ہی منہ میں مٹھاس سی گھل جاتی ہے۔ ٹھنڈے میٹھے شفاف پانی کا کوئی جھرنا۔ میرے اندر چھنا چھن کی تال بجاتا۔ وہیں پڑے کسی پتھر میں اک شگاف تھا۔ میں اس جانب کبھی نظر نہ کرتی۔ کرنا ہی نہ چاہتی تھی۔ شاید وہ ٹھہراؤ ہمیشہ کے لیے دل کا مکین بن ہی جاتا۔

اگر جو محسن نے اپنے ماضی سے جڑا۔ محبت کا

pklibrary.com

حوالہ بے نقاب نہ کیا ہوتا۔ انہیں خبر ہی نہ ہو سکی۔ خزاں رسیدہ پھول کی طرح میرے اندر کیا کچھ بکھرتا چلا گیا ہے۔ زندگی سے اگر محبت ہی حذف کر دی جائے تو باقی بس جدوجہد رہ جاتی ہے۔ سو وہ مقدر رہی۔ مگر ان ساری چک پھیریوں کا مرکز حاصل زیست نہ رہا۔ سنا ہے۔ عورت کے مزاج کی پرت اک تریاہٹ بھی ہے۔ سو میرے اندر کی عورت بھی اک ہٹ پرڈٹ گئی تھی۔ کبھی جو پل بھر کو بکھر جاتا۔

امی نے شادی سے پہلے سمجھایا تھا۔ نوے فی صد عورتیں شادی کے نام پہ سمجھوتا کیا کرتی ہیں باقی دس فی صد میں عورتوں کی کون سی قسم آتی ہے۔ ناقدری و نارسائی کی اس اذیت کا خود کے سوا کس پر بس تھا۔

سو اک فرسٹریشن میرا مقدر تھی جو دیمک کی طرح اندر ہی اندر مجھے ختم کر رہی تھی۔ زندگی کی گاڑی دواؤں کے ایندھن سے گھٹتی وجود کی شکستہ عمارت کے اندر جالے ہی جالے تھے۔ سکھ انسان کے اندر نہ ہو تو کہیں نہیں ہوتا۔ میرے آس پاس ہر جگہ اک سلیقہ۔ قرینہ تھا۔ مگر سب کچھ ترتیب سے رکھنے میں میرا اپنا آپ بکھر گیا تھا۔

جمع تم ہو نہیں سکتے۔ ضرب ہم دے نہیں سکتے۔ نفی سے تم کو نفرت ہے۔ سوچوں کے تانے بانے الجھتے تو لفظ گڈمڈ ہو جاتے۔ یہ میرے اندر کا انتشار تھا۔ شادی کے نام پر کوئی ٹریجڈی میرا بخت نہ تھی۔ مگر وہ جو اک ناشکری حضرت انسان کی مٹی میں گندھی ہے۔ رشتے میں اپنے پن کی تال میل۔ زندگی کی تکمیل اسی تال میل میں ہے۔ میرے اندر کی عورت اسی کو ترستی، یہ محسن نہ جانتے تھے یہیں آ کر میرے اندر کے ٹھہراؤ میں دراڑ پڑ جاتی۔ بظاہر میری زندگی مکمل ہے۔ میری گردن میں وہ تناؤ نہ تھا۔ جو، دونوجوان قابل سپوتوں کی ماں میں ہوتا ہے۔ شاید یوں کہ اک بیاہی بیٹی کی ماں بھی تھی۔ محسن کی ریٹائرمنٹ سر پر ہے۔ بڑا بیٹا سی اے کر رہا ہے۔ محسن کی ریٹائیرمنٹ پرسن کوٹہ میں کھپ جائے گا۔

دوسرے کی اسٹڈی جاری ہے۔ مگر وہی ناشکرے حضرت انسان کے گمان

یوں نہ ہوتا عدم تو یوں ہوتا۔

کبھی کبھی میں سارے منظر میں ہوتے ہوئے بھی کہیں نہیں ہوتی۔ اور جہاں ہوتی۔ وہاں خزاں رسیدہ لان کے کسی گوشہ میں پیپل تلے پرانی دو بید کی کرسیاں۔ مگر وہ فرصتیں اب کہاں۔ کبھی کبھی میں سوچتی جاتی اب وہ کہاں ہوگا۔ کیسا دکھتا ہوگا۔ اس کی اپنی اک دنیا ہوگی۔ جانے کبھی مجھے یاد کرتا بھی ہوگا۔

محبت ریت جیسی تھی
مجھے یہ غلط فہمی تھی
کہ محبت ڈھیر ساری تھی
میں دونوں ہاتھ بھر بھر کے
محبت کو سنبھالوں گا
زمانے سے چھپالوں
کبھی کھونے نہیں دوں گا
مگر......!
میں نے اسی ڈر سے
محبت ہی نہ کھو جائے
یہ مٹھیاں کھولیں تو
مگر جب مٹھیاں کھولیں تو
دونوں ہاتھ خالی تھے
محبت کے سوالی تھے
کیونکہ......!
محبت ریت جیسی تھی۔

کچھ خوابوں کی کوئی تعبیر نہیں ہوتی۔ شاید اس لیے کہ ان خوابوں کی کوئی تقدیر ہی نہیں ہوتی۔ خوابوں اور زندگی کی یہ تال میل ہنوز میری سمجھ سے باہر ہے۔

ماسی لوٹ آئی تھی۔ مگر میرے اندر کا انتشار۔ کم ہو کے نہ دیتا۔ آج بھی رائتے میں نمک کی جگہ شکر پڑ گئی تھی۔ کھانے پر بچوں کی بدمزگی کا سوچ کر میں ہنسی۔ اور ہنستی ہی چلی گئی۔ اور جانے کب سے میرے اندر ٹھہرے کسی۔ خاموش آنسو کو رستہ نصیب ہو گیا۔

☆☆

pklibrary.com

آسیہ رئیس خان

مکمل ناول

اس نے پیسے نکالنے کے لیے ہاجرہ کا ہاتھ ذرا دیر کے لیے چھوڑا تھا اور جب کرایہ ادا کر کے پلٹی تو وہ پیچھے نہیں تھیں۔ اس نے دائیں بائیں نظریں گھمائیں، پیچھے مڑ کر دیکھا، تیزی سے آگے بڑھ کر عمارت کے داخلی دروازے کا جائزہ لیا مگر وہ کہیں نہیں تھیں۔

اسپتال کا احاطہ تھا، اس لیے مسلسل رکشا، اسکوٹر، بائیک اور دیگر سواریوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ وہ تیز قدموں سے چلتی ماں کو ڈھونڈنے لگی۔ عجلت اور بے قراری اس کے انگ انگ سے ظاہر تھی۔ ہاجرہ سی جسامت والی دو عورتوں کو اس نے دوڑ کر پکڑا اور رخ اپنی سمت کر کے چہرہ دیکھا۔ اجنبی چہرہ دیکھتے ہی ان سے اپنی حرکت کی معذرت یا وضاحت کیے بنا وہ انھیں چھوڑ کر اسی رفتار سے آگے بڑھ کر دوسرا چہرہ دیکھنے لگتی۔

گھبراہٹ میں وہ یہ بھی فراموش کر بیٹھی تھی کہ ہاجرہ نے آسمانی ساڑھی پہنی ہے۔ مختل ہوتے حواس سنبھالتے ہوئے وہ ان کے سے قد و قامت والی ہر عورت کو روک رہی تھی۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اس کی دھڑکن دھیمی ہوتی جا رہی تھی، مانو بس اب تھم جانے کو ہو۔ ہاتھ پیر بے جان ہونے لگے تھے۔ اس کا دوپٹا سر سے ڈھلک کر شانوں پر آن گرا تھا۔ ہینڈ بیگ کا ایک اسٹریپ کاندھے سے نیچے جھول رہا تھا۔ اسپتال کے آس پاس کا سارا علاقہ چھاننے کے بعد وہ آنسوؤں سے بھری آنکھوں اور کانپتے ہاتھوں سے عبدالخالق کو فون لگا رہی تھی۔

pklibrary.com

"اور نہیں میرے اللہ!" اس کا روم روم تڑپتے ہوئے دعا گو تھا۔
"ہیلو۔" عبدالخالق کی آواز سنتے ہی وہ رونے لگی۔
"ابو! امی نہیں مل رہیں۔"
"کیا مطلب؟"
"رکشے والے کو پیسے دے رہی تھی، اتنی دیر میں وہ جانے کہاں چلی گئیں۔"
"تم روؤ مت بیٹا، گھبراؤ نہیں، وہیں کہیں ہوں گی۔" ان پر بھی ایک دم بے چینی اور گھبراہٹ طاری ہوئی، انھیں بیٹی بیوی دونوں کی فکر لاحق ہوئی مگر صائبہ کے سامنے خود کو پرسکون ظاہر کرنا ضروری تھا۔
"تم وہیں ٹھہرو، میں آتا ہوں۔" اپنی کیفیت اس پر ظاہر کیے بنا انہوں نے مضبوط لہجے میں کہا۔
"جی ابو، جلدی آئیں۔" انہوں نے فون بند کر دیا۔ اس نے آنسو صاف کیے اور ایک بار پھر ہاجرہ کی تلاش شروع کی۔ اب وہ وہاں موجود لوگوں کو ان کا حلیہ بتا کر ان سے پوچھ رہی تھی۔ پوچھتے پوچھتے اسے اچانک فون میں موجود ہاجرہ کی تصویر کا خیال آیا۔ جب تصویر دیکھ کر بھی سب نفی میں سر ہلانے لگے تو باپ سے بات کرنے کے بعد بندھی ڈھارس پھر ختم ہونے لگی۔
"مجھ سے ہی کیوں ہوتا ہے یہ؟ اللہ امی! یہیں کہیں ہوں، وہ جلد مل جائیں، انھیں کچھ نہ ہوا ہو۔"
وہم اور بے آرام کرنے والے خیال، جن سے وہ بڑی مشکلوں سے پیچھا چھڑا پاتی تھی، ایک بار پھر اس کے سر پر پھیلائے منڈلانے لگے تھے۔ ان کا سیاہ سایہ ایک بار اس کے ساتھ چل رہا تھا۔ اسے احساس ہی نہیں ہوا، وہ مسلسل رو رہی ہے۔ کچھ اسے حیرت اور بے زاری سے دیکھ رہے تھے تو کچھ کی نگاہوں میں ترحم تھا۔ عبدالخالق اسکوٹی سے وہاں پہنچے تو وہ اسپتال کے دروازے پر کھڑی رو رہی تھی۔
"سب جگہ دیکھ لیا ابو وہ کہیں نہیں ہیں۔"
"حوصلہ رکھو۔" انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔ "اندر دیکھا؟"
"نہیں۔"
"آؤ، اندر دیکھ لیں ایک بار۔" وہ اس کا ہاتھ تھامے اسپتال کی عمارت کے اندر داخل ہوئے۔
"یہاں نہیں ہوئی تو پولیس اسٹیشن چلتے ہیں۔" یہ سنتے ہی اس کے قدم بے جان ہو گئے۔
"پولیس اسٹیشن؟" وہ ان کا ہاتھ چھوڑ کر رک گئی۔ اس کا ہراساں چہرہ دیکھ کر عبدالخالق کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔
"وہ اندر ہی ہوں گی ان شاءاللہ۔" انہوں نے پھر اس کا ہاتھ تھاما اور آگے بڑھ گئے۔
یہ ایک نیم سرکاری اسپتال تھا، اس لحاظ سے صاف ستھرا مگر بھیڑ سے بھرا تھا۔ استقبالیہ لابی سے آگے بڑھ کر کشادہ راہداریوں سے گزرتے ہوئے وہ دونوں مخالف سمت میں مختلف کیبنوں کے سامنے بیٹھے مریضوں میں ہاجرہ کو ڈھونڈنے لگے۔ آخری کیبن کے بعد راہداری کے اختتام پر اسٹاف رومز کے سامنے پہنچ کر وہ بالکل مایوس ہو کر پلٹ رہی تھی کہ دائیں طرف اسے وہ نظر آ گئیں۔
"امی!" وہ دوڑ کر ان تک پہنچی اور قدموں میں بیٹھ پھوٹ کر رو دی۔
"رو کیوں رہی ہے؟" انہوں نے درشتی سے کہا۔
"دیکھ تو ثوبان مل گیا مجھے۔" ان کی آواز میں بشاشت تھی۔
"آں......" اس نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ دھواں دھار نکل رہے آنسو ایک دم تھم گئے اور پل بھر کو خوشی کی پُرزور لہر ابھر کر دم توڑ گئی۔ ہاجرہ بینچ پر ساتھ بیٹھے شخص کا ہاتھ تھام کر بڑی محبت سے ان ہاتھوں کو دیکھنے لگیں۔
صائبہ نے سر اٹھا کر ان کے بازو میں بیٹھے شخص کو دیکھا۔ اسیر اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اس عجیب صورت حال پر حیرت یا جھنجھلاہٹ

pklibrary.com

نہیں بلکہ نرمی کا تاثر تھا۔ نگاہ ملتے ہی وہ ہلکے سے مسکرایا۔ صائبہ نے نگاہوں کا زاویہ بدل کر ماں کو دیکھا۔ وہ خوشی سے مسکراتے ہوئے اپنے ہاتھ میں اجنبی کا ہاتھ جکڑے اسے سہلا رہی تھیں۔ اس نے گہری سانس لیتے ہوئے چہرہ خشک کیا اور کھڑی ہوگئی۔ اس میں فی الحال اس اجنبی شخص کو وضاحت دینے، معذرت کرنے اور اس صورت حال سے نپٹنے کی سکت نہیں تھی۔ اس سے پہلے بھی ایسا کئی دفعہ ہو چکا تھا اور ہر بار زبردستی پکڑ کر بٹھائے گئے بندے کو سمجھانا اور پھر اس کی تلخ و ترش باتیں سننا پڑتی تھیں۔ وہ کچھ کہے بنا وہاں سے دور ہو کر عبدالخالق کو فون لگانے لگی۔

"ابو لاسٹ میں آئیں، امی ادھر ہیں، جی۔" ان کے کال ریسیو کرتے ہی اس نے کہا۔

زرد اور سرمئی امتزاج کے سوٹ میں گندمی رنگت اور درمیانے قد والی اس لڑکی کو وہ یوں دیکھ رہا تھا جیسے بعد میں یادداشت کے سہارے اس کا ہو بہو اسکیچ بنانا ہو اور معمولی سی تفصیل بھی مس کرنا گناہ ہوگا۔ اسے اس کی متورم گہری سیاہ آنکھیں، چھوٹی سی ناک، قدرے سیدھی بھنویں، مختصر سا ماتھا اور بھرے بھرے ہونٹ ہی نہیں اس کا سیاہ ہینڈ بیگ، براؤن جوتے، کان کی چھوٹی سی بالیاں، دائیں آستین سے جھانکتی گھڑی اور بائیں ہتھیلی کی پشت کا داغ بھی ازبر ہوگیا تھا۔ اتنا ہی نہیں ترتیب سے اس کے چہرے پر بدلے فکر، اطمینان، مسرت اور پھر دکھ کے ساتھ ملامت کے تاثرات بھی ذہن میں درج تھے۔ عمر کے فرق کے باوجود اس کے قریب بیٹھی خاتون اور اس جاذب نظر لڑکی کے چہروں کی مماثلت انھیں ماں بیٹی بتا رہی تھی۔

فون بند کر کے اس نے ایک تھکی تھکی سانس لے کر ہینڈ بیگ اور دوپٹا درست کیا اور وہیں کھڑی عبدالخالق کا انتظار کرنے لگی۔ ماں کے مل جانے پر کچھ دیر پہلے والی بے قراری اب ناپید تھی اور ذرا پیچھے چلی گئی دائمی اداسی پھر احساسات کی محفل میں نشست سنبھال چکی تھی۔ اس نے مڑ کر دوبارہ انہیں دیکھا نہیں تھا مگر اسیر کو محسوس ہو رہا تھا۔ وہ آنسو ضبط کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

"کہاں ہیں؟" عبدالخالق صاحب نے قریب پہنچ کر پوچھا ہی تھا کہ بنچ پر نظر پڑی۔

"اوہ!" ایک اجنبی نوجوان کا ہاتھ تھامے بیٹھی بیوی کو دیکھتے ہی انہیں سارا ماجرا سمجھ میں آگیا۔ وہ بنچ کے پاس آکر رک گئے۔

"ہاجرہ! ڈاکٹر کا کیبن اِدھر نہیں ہے، چلو ورنہ ہمارا نمبر چلا جائے گا۔"

"آپ کیوں آگئے یہاں؟ میں ثوبان کے ساتھ جاؤں گی۔" وہ نروٹھے پن سے گویا ہوئیں۔

"ثوبان کو بہت ضروری کام ہے اس وقت، اسے پہلے وہ کرنے دو۔" ان کی بات پر ہاجرہ نے اسیر کو دیکھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا کر اپنا ہاتھ ہاجرہ کی گرفت سے نکال کر ان کا ہاتھ تھپتھپایا۔

"آپ پہلے ڈاکٹر سے مل لیں۔" اس سلجھے انداز میں ان کے ساتھ جھوٹ میں شامل ہونے پر وہ دونوں باپ بیٹی حیران ہوئے۔ ہاجرہ نے انھیں ایسی مشکل میں پہلے بھی ڈالا تھا اور ہر بار انھیں مقابل کی بے آرامی، ناگواری، جھنجلاہٹ اور کبھی غصہ تک جھیلنا پڑتا تھا۔ کوئی ان کے ساتھ اس کھیل میں اس طرح شامل نہیں ہوتا تھا جیسے وہ ہوا تھا۔

"تم صائبہ کے ساتھ جاؤ، میں پیچھے آرہا ہوں۔" انہوں نے ہاجرہ کو کھڑا کیا۔ تب تک وہ بھی قریب پہنچ گئی تھی۔

"چلیں امی۔" اس نے ان کے شانوں کے گرد بازو پھیلایا اور انھیں ساتھ لے کر آگے بڑھی۔ ہاجرہ نے مڑ کر اسیر کو دیکھا جو اب کھڑا تھا۔ اس نے مسکرا کر انھیں جیسے تسلی دی۔ راہداری میں غائب ہونے تک وہ مڑ مڑ کر اسے دیکھتی رہیں۔

"ہم اس تکلیف اور پریشانی کے لیے بہت شرمندہ ہیں۔" عبدالخالق نے انگریزی میں کہا۔

"معذرت کر کے شرمندہ نہ کریں انکل۔" اس

pklibrary.com

نے شائستگی سے شستہ اردو میں کہا۔

"آنٹی نے شاید مجھے انٹرنس پر دیکھا اور وہیں سے میرے پیچھے یہاں تک چلی آئی تھیں۔"

"بیٹا کھو دینے کا غم اور اس کے نہ ہونے کی حقیقت اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی وہ پوری طرح قبول نہیں کر پائی ہے۔ کبھی کبھی یونہی کسی نوجوان میں اسے اپنا بیٹا نظر آ جاتا ہے۔"

"اوہ! میں ڈاکٹر اسیر زماں......" اس نے تعارف کے ساتھ مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا جسے عبدالخالق نے تھام لیا۔ "جنرل سرجن، کچھ دن پہلے ہی یہاں جوائن کیا ہے۔"

"ماشاءاللہ۔ بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔"

اس نے ہاجرہ کے ڈاکٹر کا نام پوچھا اور چند مزید باتوں کے بعد عبدالخالق ڈاکٹر ساحل عیٹھی کے کیبن کے پاس چلے آئے کہ دن کا یہ وقت سب ہی ڈاکٹروں کی او پی ڈی کا ہوتا تھا۔ یقیناً اس کے مریض بھی انتظار کر رہے ہوں گے۔

یہ معمول کا فالو اپ تھا لیکن کچھ دیر پہلے والے اپی سوڈ کے بعد ڈاکٹر نے مزید کچھ دواؤں کا اضافہ کر دیا۔ وہ تینوں وہاں سے فارغ ہو کر واپس ہو رہے تھے تب ہاجرہ کی نظر پھر استقبالیہ پر کھڑے اسیر پر پڑی۔

"اب ثوبان کو بھی ساتھ ہی لے لیں۔" انہوں نے رک کر اس کی سمت اشارہ کرتے ہوئے شوہر سے کہا۔ اس نئی فرمائش پر ان دونوں کے چہرے پر پریشانی پھیل گئی۔ تب ہی اسیر بات ختم کر کے پلٹا اور انہیں دیکھ کر اس سمت چلا آیا۔ صائبہ نے ہینڈ بیگ کا اسٹریپ سختی سے پکڑا۔

"اب جانے کیا سین کریٹ ہو۔" اس کا دل پہلے ہی بیٹھنے لگا۔

"مجھے کچھ اور وقت لگے گا، کام ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔" اس نے بنا کسی تمہید کے ہاجرہ کو مخاطب کیا۔

"یہاں تمہارا کیا کام؟"

"میں ڈاکٹر ہوں یہاں۔"

"اچھا اچھا۔" ہاجرہ بے انتہا خوش ہوئیں۔ شکر تھا انہوں نے مزید حجت نہیں کی تھی نہ تفصیل پوچھی تھی۔

"چلو، انہیں کام کرنے دو، ان کا وقت ضائع نہ کرو۔" عبدالخالق نے بیوی کا ہاتھ تھاما۔

"اللہ حافظ بیٹا۔" اسے کہتے ہوئے وہ ہاجرہ کو لیے آگے بڑھ گئے۔

"دیر مت کرنا ثوبان، جلدی آنا۔" انہوں نے مڑ کر بڑے لاڈ اور استحقاق سے کہا۔ اسیر نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔ صائبہ بھی ان کے پیچھے آگے بڑھی۔ باہر نکلنے سے پہلے اس نے مڑ کر دیکھا، دراز قد اور چوڑے شانوں والا وہ خوبرو سرجن وہیں کھڑا انہیں دیکھ رہا تھا اس کے چہرے سے ذہانت ٹپکتی تھی۔

اسے امی کو لے کر یہاں بار بار آنا تھا اور وہ یہیں ڈاکٹر کے فرائض انجام دے رہا تھا، یہ حقیقت اسے ابھی سے نڈھال کر گئی۔

"یا اللہ! آئندہ کبھی امی اور اس ڈاکٹر کا سامنا نہ ہو۔" اس نے دعا مانگی۔

عموماً اسپتال میں اتنا وقت نہیں لگتا تھا مگر آج کے غیر معمولی حادثے کی وجہ سے خاصی دیر ہو گئی تھی۔ عبدالخالق بھی اس کے فون پر آفس سے اسپتال آئے تھے۔ وہ واپس آفس جانے کے بجائے اپنی اسکوٹی پر ان کے رکشا کے پیچھے گھر ہی چلے آئے۔ ہاجرہ کا مزاج ٹھیک ہوتا تو ہی صائبہ انہیں اسپتال لے جاتی تھی ورنہ پھر یہ کام عبدالخالق کو کرنا پڑتا تھا۔

ان تینوں نے ایک ساتھ کھانا کھایا پھر ہاجرہ کو دوائی دی۔ انہوں نے بمشکل ظہر کی چار فرض پڑھی اور دوا کی وجہ سے فوراً سو گئیں۔ نمازوں پر بھی ان کی ذہنی کیفیت اثر انداز ہوتی تھی۔ کبھی ایک ہی نماز دو چار بار پڑھ لیتیں، کبھی ان پر جیسے ضد سوار ہو جاتی، شوہر اور بیٹی کے کہنے پر بھی وہ نماز کو کھڑی نہیں ہوتیں، کبھی ان کے یاد دلانے پر چپ چاپ پڑھ لیتی تھیں۔

pklibrary.com

اس کے بعد عبدالخالق آفس چلے گئے۔ ایسے ایپی سوڈ کے بعد وہ جب سو کر اٹھتیں تو سب بھول جاتی تھیں لیکن آج اسے ڈر لگ رہا تھا کہ شاید انھیں سب یاد رہے گا۔ پہلے بھی کوئی یوں ان کا بیٹا نہیں بنا تھا جیسا آج بنا تھا۔ ان کے کمرے کا دروازہ بند کر کے وہ ہال میں آ گئی۔ اب انہوں نے شام میں ہی جاگنا تھا۔ صوفہ اور درمیان کا رگ چھوڑ کر وہ فرش پر دیوار سے ٹیک لگا کر پیر سامنے پھیلا کر بیٹھ گئی۔

دوائی کے زیر اثر ہوش و خرد سے بیگانہ بے ہوشی جیسی نیند میں ڈوبی ماں، سرکاری نوکری سے سبکدوشی کے بعد خود کو مصروف رکھنے کے لیے ایک معمولی فرم میں اکاؤنٹینٹ کی نوکری کرنے والا باپ، جس کزن کو پسند کر لی تھی اس کا رشتہ ٹھکرا کر دوسرے شہر شادی کرنے والی بہن اور بیوی بچوں کے ساتھ دوسرے ملک بس جانے والا بھائی، ان سب کی قصوروار وہ تھی۔ اس گھر کی تنہائی، خاموشی، اداسی اور دائمی دکھ کی وجہ وہ تھی۔ اس کی ایک غلطی، ایک لاپروائی نے ان سب کو زندہ درگور کر دیا تھا۔

وہ گہرے خیالوں میں ڈوبی تھی اور ہمیشہ کی طرح اس کے ناخن خود بخود بائیں ہتھیلی کے پرانے زخم کو کریدنے لگے تھے۔ اس کی اسی عادت نے وہاں بدنما داغ بنا دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی اس کی سزا ختم ہو بلکہ وہ اپنے پیاروں کی سزائیں بھی خود بھگتنا چاہتی تھی مگر کاش ایسا کر پانا اس کے اختیار میں ہوتا!

وہ اکثر سوچتی تھی، کیا فائدہ سائنس کی اتنی ترقی کا جب ہم کسی کا درد نکال کر اپنے اندر منتقل کرنے کے قابل نہیں ہوئے ہیں۔

☆☆☆

وہ اس سے ایک سال ہی چھوٹا تھا۔ ہمیشہ اس کا ہاتھ تھام کر ہر جگہ جانے والا اس کا معصوم بھائی اس کی غفلت کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے کھو گیا تھا۔

سمینٹ فیکٹری اور ٹریکٹر مینوفیچرنگ پلانٹ کے قریب ہونے کی وجہ سے اس شہر کو شہرت حاصل تھی۔ دوسری وجہ یہاں کسی ٹرسٹ کے زیر اہتمام بنا بہت بڑا انیم سرکاری اسپتال تھا۔ یہاں کے آبائی باشندوں کی تعداد کم تھی۔ زیادہ تر ان فیکٹریوں میں کام کرنے والے یہاں آن بسے تھے۔ ان کی رہائشی کالونیاں تھیں ان کے بچوں کے لیے اسکول، کالج تھے۔ اسپتال اور آبادی بڑھنے کے ساتھ روزگار کے ذرائع بھی پیدا ہو جاتے ہیں اس وجہ سے کچھ قریبی دیہات والے بھی اب یہاں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ ہفتے کے دن ان کے گھر کے قریب ہی بازار لگتا تھا۔

ایسے ہی ایک دن وہ ثوبان کا ہاتھ تھامے بازار میں گھوم رہی تھی۔ وہاں اسے اسکول کی سہیلیاں مل گئیں۔ ان کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے اسے احساس ہی نہیں ہوا کہ وہ کب ثوبان کا ہاتھ چھوڑ کر سہیلیوں کے ساتھ املی، پاپڑ، چنے اور چپس کھانے لگی ہے۔ جب سہیلیاں وداع ہوئیں تو وہ چونکی، "ثوبان کہاں ہے؟" تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ اسے ڈھونڈنے کی اپنی سی کوشش کے بعد وہ روتے دھوتے گھر پہنچی جہاں ڈانٹ پھٹکار کے بعد سب بازار میں ثوبان کو ڈھونڈنے دوڑے۔

بازار میں اعلان ہوا، محلے والے بھی تلاش میں شامل ہوئے پھر رشتے دار اور آخر میں پولیس۔ اگلا دن نکلا پھر دوسرا اور پھر تیسرا۔ پانچ سالہ زندہ بچے کی تلاش کسی بری خبر کے انتظار میں ڈھل گئی۔ اس کی تصویریں مقامی اخباروں میں چھاپی گئیں، شہر کے ہر گلی محلے، بس اڈے اور ریلوے اسٹیشن پر پوسٹر چسپاں کیے گئے، انعام کا اعلان ہوا، والدین کی اپیل کرتی ویڈیوز بنا کر سوشل میڈیا پر عام کی گئیں مگر ثوبان ملا نہ اس کی کوئی خبر۔

کئی لوگوں نے پوسٹر اور ویڈیوز دیکھ کر فون کیے مگر تحقیق اور ملاقات کے بعد وہ سب بے سود ثابت ہوتے۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ بے چینی، بے قراری اور اداسی بڑھتی جا رہی تھی۔ دن ہفتے اور پھر مہینوں میں ڈھل گئے تھے۔ صبر اور سکون غائب تھا۔

کبھی کوئی کہتا "فلاں جگہ ثوبان جیسا بچہ دکھا تھا۔" تو عبدالخالق فوراً وہاں پہنچتے، کبھی کسی لاوارث

pklibrary.com

لاش کی خبر گردش کرتی تو وہاں بھی دوڑتے مگر سب بے ثمر رہا۔ اس وقت شہر کے تھانے کے انچارج اقبال چوہدری کے لیے بھی یہ کیس اتنا خاص بن گیا تھا کہ سبک دوشی کے بعد بھی وہ ثوبان کی تصویر جیب میں لیے گھومتے تھے۔ پیچھے بنا کسی شواہد اور نشانیوں کے بچے کا یوں غائب ہونا اور پھر اس کی کوئی خبر نہ مل پانا، ان کے کریئر کا واحد داغ تھا۔

اس کیس نے انھیں عبدالخالق کے قریب کر دیا تھا۔ ایک عرصے بعد اب وہ عبدالخالق کے دوست بھی تھے۔

ہر آنے والا صائبہ سے سوال کرتا ”کیسے تم نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا؟ بھائی کا خیال کیوں نہیں رکھا؟“ سب اس چھ سالہ بچی سے کہتے، تم بڑی تھیں، وہ تمہاری ذمہ داری تھا۔ کسی خبر سے بندھی نئی امید ٹوٹنے پر گھر کا کوئی فرد یا رشتے دار ہی آخر میں ایک کاش کے ساتھ اس کی غلطی دہرا دیتا تھا۔ چھ سال کی عمر میں اس حادثے نے کم عمری میں ہی اس پر وہ بوجھ ڈالا کہ وہ دنیا تو دور اپنے مقابل بھی سر نہ اٹھا سکی۔

کئی تھے جو عبدالخالق اور ہاجرہ کو بھی غیر ذمہ دار گردانتے تھے، جنھوں نے چھوٹے بچوں کو یوں تنہا بازار میں جانے دیا تھا۔ یہ الزام سہنا آسان نہیں ہوتا تھا۔

”میں تو کبھی اپنے بچوں کو تنہا کہیں جانے نہیں دیتی۔ اور“ بھیڑ والی جگہوں پر میں ہمیشہ بچوں کے ساتھ جاتا ہوں۔ "جیسے"

ہم ذمہ دار والدین" کی کمان سے یہ "چہ غیر ذمہ دار والدین" والا تیر نکلتا تھا۔ لوگ افسوس کرتے ہوئے گھر والوں کی دلی اور ذہنی کیفیات یکسر فراموش کر جاتے تھے۔ اپنا غم الگ اور دنیا کی ہمدردی کے ساتھ بطور والدین ان کے متعلق فیصلہ کن باتیں، آرا اور نگاہیں الگ۔ صرف ابو تھے جنھوں نے ایک بار بھی اسے قصور وار نہیں ٹھہرایا تھا، کبھی اس سے مجرموں والی پوچھ تاچھ نہیں کی تھی بلکہ اسے بہلاتے اور تسلی دیتے تھے۔ اسے ہمیشہ باور کرانے کی کوشش کرتے کہ اس میں اس کی غلطی نہیں۔ یہ ان کے خاندان کا ایسا داغ تھا جو جگ پر ظاہر تھا۔ اسے چھپایا نہیں جا سکتا تھا۔ اسی لیے یہ لوگوں کے لیے کبھی پرانا ہوا نہ جلد کسی نے اسے فراموش کیا۔ اس واقعہ نے انھیں مشہور کر دیا تھا، سب انھیں جانتے تھے۔ راستہ چلتے ہوئے بھی لوگوں کی باتیں اور نگاہیں کئی دن تک ان کا پیچھا کرتی رہی تھیں۔

ثوبان سب سے چھوٹا اور گھر بھر کا لاڈلا تھا۔ اس کی شرارتیں، اس کی باتیں کوئی بھول نہیں سکا تھا۔ انتظار کی سولی پر مہینے سالوں میں بدلتے گئے۔ عبدالخالق پابندی سے پولیس اسٹیشن کے چکر لگاتے رہے۔ ان کی تلاش اور حوصلہ دم توڑ گئے تھے مگر اب بھی جو اول دن اتنا ہی شدید تھا وہ دکھ تھا، اس کی خیریت جاننے کی تڑپ تھی، اسے پا لینے کی، اس کے مل جانے کی امید تھی۔ سب جیسے اس کے متعلق اچھی بری نہیں مگر کوئی خبر سننے کے لیے جی رہے تھے۔ ثوبان کے ساتھ ہی گھر سے خوش حالی اور اطمینان بھی غائب ہو گئے تھے۔

زندگیاں اور مسرتیں ٹھہر گئی تھیں مگر وقت نہیں رکا تھا۔ ان بیس برسوں میں ہاجرہ کی حالت بد سے بدترین ہوتی گئی۔ ابتدا میں وہ سارا دن سوئی رہتیں کہ یہ عارضی بے ہوشی حقیقت سے فرار کا آسان راستہ تھی۔ کبھی گھر کے کام کرتے کرتے وہ سب چھوڑ کر ایک طرف خاموش بیٹھ جاتیں، خالی آنکھوں سے دروازہ تکتی رہتیں۔ کبھی انھیں ہر کسی پر غصہ آتا اور وہ مسلسل سب کو برا بھلا کہتیں۔ کبھی ان کے عتاب کے نشانے پر صرف صائبہ ہوتی۔ کبھی سارا سارا دن وہ ایک جگہ بیٹھے بیٹھے گزار دیتیں، کسی کام کو ہاتھ نہ لگاتیں۔

عبدالخالق کا پورا دن آفس میں گزرتا تھا۔ گھر میں ماں کی اس حالت کا اثر تینوں بچوں پر ہونا ہی تھا۔ ان سب کی وجہ سے لائبہ اور صائبہ کو جلد ہی گھر اور باورچی خانے کی ذمہ داریاں اپنے سر لینا پڑی تھیں۔ ایک سال تک چھوٹی خالہ کی شادی نہیں ہوئی

pklibrary.com

تھی تب تک وہ کبھی کبھار ان کے پاس رک جاتی تھیں لیکن اس گھر میں پھیلی وحشت اور اداسی لوگوں کو نحوست لگنے لگی تھی، وہ یہاں آنے سے کترانے لگے تھے۔ خالہ کی شادی اور نانی، نانا کے انتقال کے بعد ننھیال سے جیسے تعلق ٹوٹ ہی گیا تھا۔ ایک تایا کا خاندان تھا جو کبھی کبھار خبر گیری کے لیے آجاتے تھے ورنہ سب نے انھیں چند ماہ بعد ہی مکمل ان کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ سب کو اس حادثے کا دکھ اور افسوس تھا، انھیں پورے خاندان سے ہمدردی بھی تھی مگر چند بول کے علاوہ انھیں مزید کیا کرنا چاہیے وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھے پھر اس گھر کی افسردہ اور دل گیر فضا کسی کو یہاں زیادہ دیر ٹھہرنے بھی نہیں دیتی تھی۔ گھر والے بھی مل جل کر مقابلہ کرنے کے بجائے اپنی اپنی جنگ الگ لڑ رہے تھے۔ ماں نیم دیوانی، باپ مصروف اور بچے اپنے خول اور دائرے میں بند ہوتے گئے۔

ماں کے مزاج اور گھر پر چھائی وحشت سے دور جانے کے لیے ہی لائبہ نے تایا کے بیٹے سے شادی سے انکار کر دیا اور اٹھارہ سال کی عمر میں آئے پہلے رشتے کے لیے ہامی بھر کے شادی کر کے دوسرے شہر چلی گئی تھی۔

وہ اس گھر، اس شہر سے بہت دور جانا چاہتی تھی۔ وہ جانتی تھی محلہ بدل لینے سے زندگی نہیں بدل سکتی۔ خاندان میں اور اسی شہر میں رہتے ہوئے وہ کبھی اس دائرے سے باہر نہیں نکل سکے گی، جس میں صرف اداسی اور دکھ ہی نہیں ایک عجیب سی بے چینی اور وحشت بھی تھی۔ ثوبان کی یادیں اور اس کی گمشدگی کا احساس خوشی نگلنے والی عفریت کی طرح اس شہر اور گھر سے لپٹا تھا۔

یہ حادثہ ان کے سروں پر پھیلا وہ گہرا سیاہ بادل تھا جو اپنے زیر سایہ زندگیوں کو اپنے رنگ میں رنگ دیتا ہے۔

جو لائبہ نے کیا وہ ہی نعمان نے بھی کیا۔ وہ دسویں کے بعد ہی تعلیم کے بہانے شہر چھوڑ چکا تھا۔ ڈگری مکمل کرتے ہی اس نے شادی کے لیے نہ صرف وہاں لڑکی پسند کر لی تھی بلکہ وہ ملک سے باہر جانے کے سارے انتظام بھی مکمل کر چکا تھا۔

اس نے سارے فیصلے کرنے کے بعد باپ کو بس آگاہ کیا تھا اور انہوں نے بھی اس کی ساری باتیں مان لی تھیں۔ جہاں اور جس سے کہا، اس سے شادی کر وا دی اور اسے باہر جانے سے بھی نہیں روکا۔ ایک بار پھر پیچھے وہ رہ گئی تھی، بوڑھے والدین اور پرانے زخموں کے ساتھ۔

گھر والوں کے لیے ثوبان کی گمشدگی کے بعد سب سے بڑا بار ہاجرہ بن گئی تھیں جس کا اندازہ انھیں بہت دیر سے ہوا تھا۔ ان کا مزاج اور حالات اس تیزی سے تنزلی کا شکار تھے کہ جلد ہی ماہر نفسیات کو دکھانا پڑا اور اب وہ پرانی نفسیاتی مریضہ تھیں جن کا مسلسل علاج جاری تھا۔ ان کا ذہن اس خسارے کو قبول نہیں کر سکا تھا۔ ان کو مختلف دورے پڑتے رہتے۔ صائبہ کو کوسنے اور الزام دینے سے لے کر کسی بھی راہ چلتے کو ثوبان مان لینے تک، یہ دورے بڑے غیر متوقع اور غیر یقینی ہوتے تھے۔

کبھی وہ سارا [illegible] تہس نہس کر دیتیں، صائبہ پر چیختی چلاتیں تو کبھی بالکل نہیں لگتا انھیں کوئی مسئلہ ہے۔ زیادہ بات نہیں کرتی تھیں۔ اپنے کمرے سے باہر کم ہی نکلتیں۔ جب ٹھیک رہتیں تو چپ چاپ ساری باتیں مان لیتی تھیں۔ کھانا کھالو، دوا لے لو، نماز پڑھ لو، جو ان سے کہا جاتا کر لیتیں۔

ایک ہاتھ سر کے نیچے رکھے وہ فرش پر لیٹ گئی۔ اس کا رخ دروازے کی طرف تھا۔ کچھ دیر بعد وہ اسی حالت میں سو گئی تھی۔

مغرب سے پہلے ہاجرہ جاگیں تو دوپہر والے واقعے کا ان پر کوئی اثر نہیں تھا۔

☆☆☆

نورن خالہ آج وقت سے پہلے صفائی کر کے جا چکی تھیں۔ وہ ان کے دھوئے برتن جگہ پر رکھ کر ہال میں آئی تو ایک بج رہا تھا۔ وہ اور ہاجرہ عموماً ظہر کی نماز

پڑھ کر کھانا کھاتی تھیں۔ عبدالخالق نو بجے ٹفن لے کر جاتے تھے اور شام پانچ بجے ان کی واپسی ہوتی تھی۔ اس نے غسل کیا، اس کے بعد ظہر کی نماز پڑھی۔ ہال میں میز پر کھانا لگائے کے بعد وہ ہاجرہ کو بلانے ان کے کمرے میں آئی۔

"چلیں امی...... " دروازہ کھلتے ہی وہ گھبرا گئی۔ کمرہ خالی تھا۔

" امی......! امی...... !" اس نے آوازیں لگاتے ہوئے سارا گھر چھان مارا۔ وہ کہیں نہیں تھیں۔ چھوٹے سے احاطے کا داخلی دروازہ کھلا دیکھ کر اس کے ہاتھ پیر بے جان ہونے لگے۔ گھبراہٹ کے ساتھ پھر اس کی ٹانگیں اور ہاتھ کانپنے لگے تھے۔ وہ فوراً جہاں کھڑی تھی، وہیں بیٹھ گئی۔ وہاں سے جو بھی گزرتا، باورچی خانے سے اسے ضرور نظر آتا تھا۔ اس کا مطلب تھا وہ اس کے غسل خانے میں جانے کے بعد گھر سے باہر گئی ہیں۔ اس نے فون اٹھایا لیکن پھر ابو کو پریشان کرنے کے خیال پر اسے رونا آ گیا۔ اسپتال والے واقعہ کو ابھی چھ سات دن ہی ہوئے تھے۔

"ہاسپٹل ...... "اسپتال کا خیال آتے ہی اس کا ذہن جاگ گیا۔ کپڑے تبدیل کرنے اور بال بنانے کا وقت نہیں تھا۔ اس نے ہینڈ بیگ اٹھایا اور گھر کو قفل لگا کر رکشا سے اسپتال پہنچی۔

" مجھے ڈاکٹر اسیر زماں سے ملنا ہے۔ " اس نے استقبالیہ پر بیٹھی لڑکی سے کہا۔

"اوہ...... "لڑکی نے بغور اسے دیکھا۔ پھر کسی کو آواز دے کر اسے ڈاکٹر اسیر زماں خان کے کیبن تک پہنچانے کو کہا۔ اسے شاید پہلے ہی ہدایت مل چکی تھی کہ اس سے ملنے آنے والے کو کیبن تک پہنچا دیا جائے۔

"یہ ڈاکٹر زماں کا کیبن ہے۔ " وارڈ بوائے اسے کیبن کے باہر چھوڑ کر چلا گیا۔

" اللہ کرے امی یہیں ہوں۔ " اس نے دل سے دعا کرتے ہوئے دروازے پر دستک دی۔

" کم اِن۔ " اندر سے اسیر کی آواز آئی۔ دروازہ کھلتے ہی سامنے کرسی پر ہاجرہ نظر آ گئیں۔ اس کے تنے اعصاب اور عضلات ایک دم ڈھیلے پڑے۔

" تم کیوں یہاں چلی آئیں ؟" ہاجرہ نے پُرشکن پیشانی کے ساتھ برہمی سے پوچھا۔ اس نے ماں کی جھاڑ پر شرمندگی سے اسیر کو دیکھا۔ میز کے دوسری طرف آج وہ بلیو اسکرب میں تھا۔

"یا اللہ! امی نے انھیں آپریشن تھیٹر سے باہر نہ نکالا ہو۔ "اس نے دعا کی۔

"امی! یہاں ؟ انھیں بہت اہم اور ضروری کام ہوتا ہے، آپ یوں بنا اطلاع دیے کبھی بھی ملنے نہیں آ سکتیں۔ " ان کی کرسی کے قریب پہنچ کر اس نے نرمی سے دھیمی آواز میں کہا۔ ہاجرہ نے منہ پھلا لیا۔

"میں اپنے بیٹے سے کبھی بھی ملنے آ سکتی ہوں، اس کے لیے مجھے تمہاری یا کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں۔ "

"اچھا مل لیا ناں، اب چلیں گھر۔ "اس نے اب اور آہستگی اور نرمی سے کہا۔

"میں ثوبان کے ساتھ واپس آ جاؤں گی، تم جاؤ۔ " انہوں نے اس کی طرف سے رخ موڑ کر اسیر کی طرف کیا۔

" مجھے ابو کو ساتھ لانا چاہیے تھا۔ "صابہ نے بے بسی سے سوچا۔ اسیر کرسی کھسکا کر کھڑا ہوا۔

" چلیں گھر چلتے ہیں، میری ڈیوٹی ختم ہو گئی ہے۔ "ہاجرہ کے چہرے پر مسرت پھیل گئی۔ یہ قطعی غیر متوقع صورت حال اس کے لیے پریشان کن تھی۔ وہ نروس سی انگلیاں مروڑنے لگی۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اس سے کیا کہے۔

" گھر پہنچ کر اگر امی انھیں واپس جانے ہی نہ دیں تو......؟ "اس کی کشمکش اسیر نے بھی محسوس کی۔

" میں چینج کر کے آتا ہوں۔ آپ بیٹھیں۔ " اس نے دور رکھی ایک کرسی اٹھا کر اس کے قریب رکھی۔

pklibrary.com

"ریلیکس۔" اس نے دھیرے سے کہا۔ صائبہ اسے دیکھنے لگی۔ بس اس کا رونا باقی تھا۔ وہ یونہی کھڑی رہی۔

"بیٹھیں۔" اس نے میز سے چھوٹی سی پانی کی بوتل اٹھا کر اس کی طرف بڑھائی۔ کسی بے جان روبوٹ کی طرح بیٹھ کر اس نے بوتل تھام لی۔

"میں دو منٹ میں آیا۔" اسیر نے ہاجرہ کو مخاطب کیا اور دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔

"امی! آپ کو ثوبان سے ملنے یہاں آنا ہو تو مجھے کہا کریں۔" پانی سے حلق تر کرنے کے بعد وہ ماں کی طرف متوجہ ہوئی۔ "میں آپ کو لے کر آؤں گی۔ آپ جانتی تو ہیں، رکشا والے کتنا لوٹتے ہیں، آپ سے کچھ بھی رقم کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔"

"ہاں" ہاجرہ نے سمجھنے والے انداز میں لمبا ہنکار بھرا۔ "جبھی مجھ سے پورے چار سو روپے لیے اس نے۔"

"آپ کے پاس تھے؟"

"اونہوں۔" انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

"پھر کرایہ کیسے دیا آپ نے؟"

"ثوبان نے دیا۔" صائبہ کی آنکھوں کے سامنے سارا منظر واضح ہو گیا۔

"امی!" اس نے ان کا ہاتھ تھاما۔ "آئندہ آپ اکیلی کبھی گھر سے نہیں نکلیں گی۔ یہاں ثوبان کبھی آپریشن تھیٹر میں ہوا تو پیسے کون دے گا؟"

"وہ کیوں ہوگا آپریشن تھیٹر میں؟" انھیں صائبہ کی بات پسند نہیں آئی۔ انہوں نے خفگی سے ہاتھ چھڑا لیا۔ اس اجنبی کو اس کی مرضی اور اجازت کے بنا ثوبان بنانا اسے بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا مگر اس وقت ہاجرہ کو یہ باتیں ذہن نشین کرانا بھی ضروری تھا۔

"امی! وہ ڈاکٹر ہیں، یہاں ان کے مریض ہوتے ہیں، ان کے آپریشن اور علاج کے لیے وہ آپریشن تھیٹر میں ہوتے ہیں، اس طرح بنا اطلاع اور بے وقت کوئی ملنے آئے گا تو ان کا کام متاثر ہوگا اور اسپتال والے بھی ناراض ہوں گے، ثوبان کے لیے کوئی مشکل نہیں ہونا چاہیے، ہے ناں؟"

"ہمم۔" انہوں نے جیسے چار و ناچار سر ہلاتے ہوئے اقرار کیا۔

تب ہی اسیر نے دروازہ کھولا۔ وہ اسکرب کی جگہ جینز اور ٹی شرٹ میں تھا۔

"چلیں۔" اس سے پہلے ہاجرہ کھڑی ہو گئیں۔ وہ دونوں آگے اور وہ ان دونوں کے پیچھے اسپتال سے باہر آئے۔ ان کے پیچھے چلتے ہوئے اسے اندازہ ہوا وہ کار پارکنگ کی طرف جا رہے ہیں۔ اسے کوفت نے گھیرا۔ کسی کی شرافت اور انسانیت کو اس قدر بھی آزمانا ٹھیک نہیں کہ یہ اس کے لیے سزا بن جائے۔

گاڑی کے پاس رک کر پہلے اس نے اگلا دروازہ کھول کر ہاجرہ کو اندر بٹھایا، سیٹ بیلٹ لگایا پھر اس کے لیے پچھلا دروازہ کھولا۔ وہ مجرموں کی طرح نادم سی اندر بیٹھ گئی۔

"راستہ بتائیے گا۔" دروازہ بند کرتے ہوئے اس نے جھک کر کہا۔ صائبہ نے سر ہلایا۔

وہ اسے دایاں بایاں بتانے لگی۔ ہاجرہ خوشی خوشی گاڑی کا جائزہ لے رہی تھیں۔

ابھی چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ معمول کی طرح عبدالخالق کی کال آ گئی۔ وہ روز دوپہر میں ایک بار اسے فون ضرور کرتے تھے۔ اسے دبی آواز میں مختصراً سب بتانا پڑا۔ گھر کے سامنے گاڑی رکی اور اترنے سے پہلے ہاجرہ نے کہا۔

"تمہیں بھی بھوک لگی ہوگی، آؤ فوراً کھانا کھاتے ہیں۔" اس نے مسکرا کر تائید کی اور جب سے شرمندہ بیٹھی صائبہ کو ایک دم غصہ آ گیا۔

"کیا ضرورت ہے اس کھیل میں شامل ہونے کی؟ اوروں کی طرح ہاتھ جھٹک کر آگے بڑھ جاتے۔" باہر نکل کر اس نے دروازے کا قفل کھولا اور اندر داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے وہ دونوں بھی اندر آئے۔ مختصر سے احاطے کے دونوں طرف دو کمرے

pklibrary.com

تھے۔ درمیان میں چھوٹا سا پکا صحن تھا۔ دائیں طرف باورچی خانہ تھا اور بایاں کمرہ لائبہ اور نعمان کی آمد پر ہی کھلتا تھا۔ سامنے ہال کا دروازہ تھا۔ ہال میں مزید دو کمروں کے دروازے کھلتے تھے۔ ایک کمرہ اس کا تھا اور دوسرا ہاجرہ اور عبدالخالق کا۔

"کھانا تو ٹھنڈا ہو گیا ہوگا۔" ہال میں آتے ہی ہاجرہ نے میز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "صائبہ گرم کر لو۔" پھر اسیر کی سمت مڑیں۔

"تمہیں فریش ہونا ہوگا؟"

"نہیں، میں ٹھیک ہوں۔" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

"واش بیسن میں ہاتھ دھو لو پھر۔" انہوں نے صحن کی سمت اشارہ کیا۔ صائبہ نے ہینڈ بیگ صوفے پر رکھا اور میز سے پیالے اٹھا کر باہر نکل گئی۔ اسیر ہاتھ دھونے اس کے پیچھے باہر نکلا تھا۔ ابھی تک اس اجنبی کی ممنون تھی صائبہ کو اب گھر میں ثوبان کی حیثیت سے اس کی موجودگی کھل رہی تھی۔ باورچی خانے میں پہنچ کر خیال آیا؟ فون بھی ہینڈ بیگ میں ہے۔ وہ ابو کو فون کر کے بلانا چاہ رہی تھی۔ دال واپس پتیلی میں گرم کرنے رکھی اور چاول مائیکروویو میں رکھے۔ روٹیاں میز پر ہاٹ پاٹ میں ہی تھیں۔ وہ پیالے لے کر واپس آئی تب تک وہ دونوں کرسیاں سنبھال چکے تھے۔

"شروع کرو بیٹا۔" ہاجرہ نے اس کے سامنے رکھی پلیٹ میں دال ڈالتے ہوئے کہا۔

"جی۔" اس نے بہت تھوڑے سے چاول پلیٹ میں ڈالنے کے بعد اسے دیکھا۔ وہ کھڑی ہاجرہ کی پلیٹ میں کھانا نکال رہی تھی۔

"آپ نہیں کھا رہیں؟" اسیر نے یوں پوچھا جیسے وہ روز ساتھ کھانے کا عادی ہو۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ہاجرہ کے آگے پانی سے بھرا گلاس رکھ کر وہ صوفے پر رکھے ہینڈ بیگ سے فون نکال رہی تھی تب ہی اطلاعی گھنٹی بجی۔ وہ باہر بھاگی۔ دروازے پر عبدالخالق تھے۔ وہ انھیں ساری تفصیل بتا کر ان کے ساتھ ہال میں داخل ہوئی تو چہرے پر ذرا اطمینان تھا۔ اسیر اپنی پلیٹ صاف کر کے چمچ پلیٹ میں ایک طرف رکھ چکا تھا۔ اس نے انھیں سلام کیا۔ وہ جواب دیتے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ صائبہ نے گلاس میں پانی ڈال کر انھیں دیا۔ ہاجرہ کھانے میں مصروف تھیں۔

"دوائیاں بھی دے دو۔" انہوں نے صائبہ سے کہا۔ وہ کمرے میں جا کر دوائیاں لے آئی۔ کھانے کے بعد ہاجرہ نے خاموشی سے ساری دوائیاں لے لیں۔ وہ بڑی مطمئن تھیں۔ اس وقت انھیں دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ انھیں کوئی مسئلہ ہے اور وہ کسی اجنبی کو اپنا بیٹا بنا کر گھر لے آئی ہیں۔

"چائے پیو گے؟" اٹھتے ہوئے انہوں نے اسیر سے یوں پوچھا جیسے یہ روز کا معمول ہو۔

"نہیں۔"

"اچھا، میں نماز پڑھ کے آتی ہوں۔" وہ کمرے میں چلی گئیں۔ صائبہ میز سے برتن سمیٹ کر باہر چلی گئی۔

"اس پریشانی کے لیے بہت معذرت بیٹا۔ یہ پہلی بار ہوا کہ وہ اکیلی کچھ کہے بنا گھر سے نکل گئی۔"

"پلیز آپ معذرت نہ کیا کریں، میں جانتا ہوں وہ مریضہ ہیں۔ آپ یہ احتیاط کریں کہ اب سے دروازہ لاک رکھا کریں۔"

"یہ آپ کی شرافت ہے بیٹا! جو آپ اپنی پرائیویسی اور پروفیشنل لائف میں یہ زبردستی کی مداخلت برداشت کر رہے ہیں۔"

"مجھے ان سب سے کوئی تکلیف یا پریشانی نہیں ہے انکل، آپ اتنا نہ سوچیں۔" پھر وہ ان سے ہاجرہ کی کیفیت اور ان کے مزاج اور برتاؤ کے متعلق سوال پوچھنے لگا۔

کچھ وقت بعد صائبہ کافی کے دو مگ لیے واپس آئی۔ وہ اس کے کیبن میں میز پر ڈسپوزیبل کپ میں جوں کی توں پڑی سرد کافی دیکھ چکی تھی۔ اس نے دونوں کے سامنے مگ رکھے۔

pklibrary.com

"ابو آپ کافی پی کر امی کو دیکھ لیں۔" وہ یوں تو دواؤں کے زیر اثر جلد سو جاتی تھیں لیکن انہیں اس وقت باہر نکلنے سے روکنے کے لیے بستر پر لٹانا ضروری تھا۔

"میں نہیں پیوں گا بیٹا۔" وہ کھڑے ہو گئے۔ "آپ ٹھہریں، میں تھوڑی دیر میں آیا۔" اسیر سے کہہ کر وہ اندر کمرے میں چلے گئے۔

"بیٹھ جائیں۔" وہ جس کرسی کے قریب کھڑی تھی، اسیر نے کافی کا مگ دھیرے سے ادھر سرکایا۔ اسے وہاں تنہا چھوڑ کر چلے جانا بھی بداخلاقی تھی سو وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ اپنے مگ سے کافی کا گھونٹ لے کر اس نے دوسرا مگ اسے تھمانے کے لیے اٹھا کر اس طرح اوپر کیا کہ اسے مگ لینا پڑا۔ سر جھکائے وہ بھی کافی پینے لگی۔ سیاہ ٹراوزر پر سفید اور سرخ امتزاج والے کرتے پر اس نے سیاہ دوپٹا اوڑھ رکھا تھا، الجھے نم بال کیچر میں قید تھے، کان میں ننھی بالیاں تھیں مگر کلائی پر گھڑی نہیں تھی۔ اس وقت اس کا حلیہ اس دن سے مختلف اور گھریلو سا تھا مگ کے گرد پھیلی ہتھیلی کی پشت پر کچھ نئے نشان تھے۔

اس کی مسلسل نظر کا اثر تھا کہ صائبہ نے سر اٹھایا۔ پکڑے جانے پر نگاہ چرانے کے بجائے اسیر مسکرایا۔ اس کی گہری نگاہیں اور مسکراہٹ سے جھلکتی دلچسپی پر اس نے سر جھکا لیا۔

"آنٹی کی یہ کنڈیشن کب سے ہے؟"

"بیس سال سے۔"

"انکل نے کہا تھا انہوں نے بیٹا کھویا ہے، کیا وہ......" صائبہ نے جس بے قراری سے مگ رکھ کر ہاتھ میز کے نیچے کیے، اس کے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے۔ اسے غلطی کا احساس ہوا اور فوراً بات بدل دے یا معذرت کر لے، وہ فیصلہ نہیں کر پایا۔

"کافی ٹھنڈی ہو رہی ہے۔" کچھ توقف کے بعد اس نے کہا۔

صائبہ نے آہستہ سے میز کے نیچے سے ہاتھ نکالے اور دونوں ہاتھ پر مگ تھام لیا۔ اسے دونوں ہاتھوں میں مگ لینے کی عادت تھی۔ اس کے ہاتھ پر نظر پڑتے ہی اسیر نے چونک کر اسے دیکھا۔ ہتھیلی کی پشت کے نشان کو بڑی بے دردی سے کریدا گیا تھا لیکن اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار نہیں تھے۔ اس کے اندر کا طبیب بے چین ہوا۔ مزید کچھ نہ کہنے اور آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ نہ دیکھنے کے لیے اس نے بمشکل خود کو روکا۔ اس نے خالی مگ میز پر رکھا تب عبدالخالق واپس آئے۔ ان کے آتے ہی وہ اس کا خالی مگ اور اپنا آدھا بھرا اٹھا کر باہر چلی گئی۔

"سو گئی۔" کرسی پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے ایک لمبی سانس کھینچی، وہ خاموش رہا۔ ذرا توقف کے بعد عبدالخالق نے کہنا شروع کیا۔

"ہمارا سب سے چھوٹا بیٹا ثوبان بیس سال پہلے گم ہو گیا تھا۔ وہ آج تک مسنگ ہے۔" ان کی آواز میں درد تھا اس میں تہ در تہ درد کی کئی داستانیں تھیں۔ وہ کچھ نہ کہہ سکا۔

"ہم سب نے خود کو سنبھال لیا ہے زندگی کے ساتھ آگے بڑھتے گئے مگر وہ بیس سال بعد بھی سنبھلی نہیں ہے۔"

اسیر جانتا تھا "سنبھال" کا مطلب پردہ ڈال لیا اور بڑھتے گئے کے معنی گھسیٹتے گئے ہوتا ہے۔ اس کے دکھ اور خسارے کی شدت اور اس کا اظہار کم، زیادہ ہوتا ہے۔ کبھی خاموش تو کبھی چیخیں اور کبھی اس طرح کی خود فریبی۔"

"کتنی عمر تھی اس وقت بیٹے کی؟"

"پانچ سال۔ جو اختیار میں تھا، جو ممکن تھا وہ سب کیا مگر انتظار اب بھی ختم نہیں ہوا ہے۔"

امید مت چھوڑیں، حوصلہ رکھیں، ایک دن وہ مل جائے گا، اس کی کوئی خبر ملے گی، وہ جہاں ہوگا بخیر ہوگا کتنے ہی فقرے ذہن میں آئے مگر زبان تک کوئی نہیں پہنچا۔

وہ پھر آج کی پریشانی اور تکلیف کے لیے معذرت کرنے لگے تو وہ کھڑا ہو گیا۔

"یقین کریں انکل! مجھے بالکل پریشانی نہیں

pklibrary.com

ہوئی ہے بلکہ آپ کے معذرت کرنے پر شرمندگی ہوئی ہے، بہ حیثیت انسان اور ڈاکٹر میرا فرض ہے یہ کہ مریض کا خیال رکھوں۔"

اس نے جیب سے والٹ نکالا اور اس میں سے کارڈ نکال کر ان کی طرف بڑھایا۔

"اس پر میرا نمبر درج ہے اور بہتر ہوگا آپ بھی اپنا فون نمبر مجھے دے دیں۔ آئی ہوپ آئندہ ایسا کچھ نہ ہو پھر بھی احتیاطاً ہمارے پاس ایک دوسرے کے نمبرز ہونے چاہئیں۔"

"ہاں ہاں، یہ ٹھیک رہے گا۔" عبدالخالق نے کارڈ لے لیا۔ اسی وقت صائبہ ہال میں داخل ہوئی۔

"بیٹا! انھیں اپنا اور میرا فون نمبر دے دو۔" ان کے مخاطب کرنے پر وہ بھی مڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

"جی۔" اس نے صوفے پر رکھے ہینڈ بیگ سے پین اور چھوٹی ڈائری نکالی، اس کے ایک صفحے پر فون نمبر اور نام لکھے اور وہ صفحہ کھینچ کر ڈائری سے الگ کیا۔ دونوں چیزیں دوبارہ بیگ میں ڈال کر میز کے پاس آئی اور وہ چھوٹا صفحہ اسیر کے سامنے میز پر رکھ دیا۔

"یہ ڈاکٹر صاحب کا نمبر تم بھی سیو محفوظ کر لو۔" عبدالخالق نے کارڈ اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے کارڈ لے لیا۔

"میں چلتا ہوں۔" اسیر نے میز سے پرچی اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ایک بار پھر بہت شکریہ۔" عبدالخالق اس کے ساتھ باہر نکل گئے۔"

صائبہ نے کارڈ پر نظر ڈالی۔

ڈاکٹر اسیر زماں خان ایم ایس۔

نیچے دو موبائل فون نمبر درج تھے۔ اس نے کارڈ پلٹا۔ کہیں اسپتال کا نام اور فون نمبر نہیں لکھا تھا۔

☆☆☆

آج صبح سے ہی ہاجرہ کا مزاج بگڑا ہوا تھا۔ اب بھی اس کا دیا ناشتہ انہوں نے پھینک دیا۔ شکر تھا کہ سارا غصہ بنا آواز کے نکل رہا تھا۔

"ہاجرہ!" عبدالخالق کو بھی غصہ آگیا۔ "بچی دن رات تمہاری خدمت میں خوار ہوتی ہے، کچھ تو مروت کیا کرو، اس کی بھی ماں ہو تم......"

"ابو" اس نے ان کے قریب آکر شانے پر ہاتھ رکھا۔ "پلیز۔" اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں خاموش رہنے کی التجا کی۔ عبدالخالق کے لیے اسے یوں دیکھنا بھی ایک عذاب تھا۔ بیوی کی دیوانگی اور بیٹی پر اس کا عتاب، یہ دوہری اذیت بیس برسوں کی تھی۔

وہ فرش پر گرے اور ٹوٹے برتن اٹھا کر چلی گئی۔

کچھ دیر بعد عبدالخالق باورچی خانے میں آئے۔

"کچھ کھانے کو دے دو بیٹا! دوائیاں دینا ہیں۔"

اس نے دودھ کا گلاس اور ایک سیب کاٹ کر پلیٹ انھیں تھمائی۔ دونوں جانتے تھے، اب وہ اس کی پکائی ہوئی کوئی چیز نہیں کھائیں گی۔ ایسے وقت میں وہ بلا کی ضدی ہو جاتی تھیں۔ انھیں دوائیاں دینے کے بعد وہ ان کے سو جانے کی تسلی کر کے ہی گھر سے باہر نکلے۔

وہ کھانا بنا کر فارغ ہوئی تو نورن خالہ آگئیں۔ وہ انھیں تاکید کرتی نہانے چلی گئی۔ پانچ سات منٹ بھی نہیں ہوئے تھے کہ نورن خالہ نے دھڑا دھڑ دروازہ بجانا شروع کیا۔

"صائبہ بی بی...... جلدی باہر آئیں، بڑی مالکن باہر چلی گئی ہیں......"

وہ جیسے تیسے باہر نکلی۔

"کیسے باہر چلی گئیں دروازہ تو بند تھا؟"

"میں کچرا باہر گلی کے کوڑا دان میں پھینکنے گئی تھی دروازہ کھلا ہی تھا...... واپس مڑ کر دیکھا تو وہ گلی میں اتنی دور چلی گئی تھیں، میں نے آواز دی تو مڑ کے دیکھا اور تیزی سے آگے بڑھ گئیں۔"

اس بار الجھن اور فکر کے ساتھ کہیں یہ اطمینان بھی تھا کہ وہ اسپتال ہی گئی ہوں گی۔ نورن خالہ کو صفائی کرتا چھوڑ اور دروازہ مقفل کر کے چابی پڑوس میں دینے کا کہہ کر وہ سیدھی اسپتال پہنچی۔

"ڈاکٹر اسیر تو سرجری میں ہیں۔" اس کے استفسار پر استقبالیہ والی لڑکی نے انٹرکام پر بات کرنے کے بعد کہا۔

"آپ ویٹ کریں، کافی وقت ہو گیا ہے، کسی بھی وقت باہر آتے ہوں گے۔"

"کچھ دن پہلے جو لیڈی ان سے ملنے آئی تھیں، کیا وہ آج بھی آئی ہیں؟"

"ڈونٹ نو میم۔" اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

"میں ڈاکٹر اسیر کے کیبن کے باہر ویٹ کرتی ہوں۔" وہ اسے کہہ کر اندر کی طرف بڑھ گئی۔

اسے امید تھی ہاجرہ کیبن کے باہر ہی ہوں گی مگر وہاں پہنچ کر اسے مایوسی ہوئی۔ دروازہ کھول کر اندر جھانکا وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ وہیں انتظار کرنے کے بجائے اس نے سارا فلور دیکھ ڈالا۔ زیادہ تر ماہرین ڈاکٹر کی او پی ڈی کا وقت تھا اس لیے ہر کیبن کے باہر مریضوں کی بھیڑ تھی۔ لیکن ہاجرہ کہیں نہیں تھیں۔ دوسرے سرے کے آخری کیبن سے وہ واپسی کے لیے مڑی تب ہی سامنے لفٹ کا دروازہ کھلا۔ اسیر بہت فاصلے پر مگر سامنے تھا۔ اسے دیکھتے ہی اپنے کولیگ سے کچھ کہتا وہ لمبے ڈگ بھرتا اس کے پاس آیا۔

"امی پھر گھر پر نہیں ہیں۔" اس کے قریب آتے ہی اس نے کہا۔ "یہاں بھی سب جگہ دیکھ لیا، کہیں نہیں ہیں۔"

"میرے کیبن میں......"

"سارا فلور دیکھ لیا، کہیں نہیں ہیں۔" وہ بیگ سے فون نکال کر عبدالخالق کو کال کرنے لگی تھی۔

"کتنا وقت ہوا ہے؟"

"شاید چالیس پینتالیس منٹ۔"

"آپ کیبن میں ویٹ کریں، میں دیکھتا ہوں۔" وہ اسے کہہ کر تیزی سے چلا گیا۔

فون پر بات کرتے ہوئے وہ اس کے کیبن میں آئی۔ اسیر داخلی دروازے کا سی سی ٹی وی فوٹیج دیکھ کر واپس آیا تو وہ چھوٹی سی جگہ میں ٹہل رہی تھی۔

"وہ یہاں نہیں آئیں۔"

"پھر کہاں گئیں؟" اس کا چہرہ اس بری طرح متغیر ہوا کہ اسیر کو لگا، وہ غش کھا کر گر جائے گی۔

"آپ بیٹھ جائیں۔"

"نہیں۔" وہ باہر جانے لگی تھی۔

"میں بھی چلتا ہوں۔" اس نے ڈیسک کے اس طرف جا کر میز سے گاڑی کی چابی اٹھائی۔ اس نے سنا یا نہیں وہ سمجھ نہیں پایا کیوں کہ وہ باہر نکل گئی تھی۔ چینج کرنے کا وقت نہیں تھا۔ وہ اپنے کولیگ کو فون کرتے ہوئے اس کے پیچھے تھا۔

"پلیز، میرے ساتھ آئیں۔" داخلی دروازے سے نکل کر پارکنگ کی سمت جاتے ہوئے اس نے صائبہ سے کہا۔

"ہو سکتا ہے، وہ کچھ دیر میں یہاں پہنچیں؟" صائبہ کو خیال آیا۔

"میں نے کہہ دیا ہے، ہمیں فوراً اطلاع مل جائے گی۔"

پھر تین گھنٹے گزر گئے مگر کوئی اطلاع ملی نہ ہاجرہ ملیں۔ گھر کے آس پاس دیکھا، رکشا اسٹینڈ پر جا کر تلاش کیا، اسپتال کے راستے میں ڈھونڈا مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ تایا جان کے گھر بھی سب کو خبر ہو گئی تھی۔ وہ اور ارباب بھی آ گئے۔ عبدالخالق نے اقبال چوہدری کو بھی فون کر کے بلا لیا تھا اور ان کے مشورے پر اب پولیس اسٹیشن جانے اور ان کی تصویر اور اعلان کی باتیں ہونے لگی تھیں۔ وہ مسلسل روئے جا رہی تھی تب ہی اسیر کے فون پر اسپتال سے کال آئی کہ وہ وہاں ہیں۔ عبدالخالق، اقبال چوہدری اور تایا جان اسیر کے ساتھ انھیں لینے اسپتال گئے۔ وہ ان کے ساتھ بے حال سی گھر پہنچیں۔ انھیں کھانا کھلایا، کپڑے تبدیل کروائے اور دوائیاں دیں تو وہ سو گئیں۔

ان سے پوچھنے پر کوئی تسلی بخش جواب نہیں مل رہا تھا۔ اسپتال سے ہی تفصیل کا علم ہوا۔ رکشا والا انھیں کسی اور پرائیویٹ اسپتال میں چھوڑ آیا تھا جہاں

pklibrary.com

وہ ڈاکٹر ثوبان کو پوچھتی رہیں۔ وہ نہ اپنا ایڈریس بتا رہی تھیں نہ کسی کا فون نمبر۔ ایک ہی رٹ تھی کہ ڈاکٹر ثوبان سے ملنا ہے۔

بہت دیر بعد کسی کو خیال آیا تو دیگر اسپتال اور کلینک میں فون کر کے ڈاکٹر ثوبان کا دریافت کرنے لگے اور آخر اسیر کے اسپتال سے جواب ملا کہ اس پیشنٹ کو یہاں بھیج دیں۔

جہاں انھیں دیکھ کر سکون ملا تھا وہیں ان کی اس نئی ضد اور حرکت نے حد درجہ تشویش بھی پیدا کر دی تھی۔ ارباب نے انھیں زیادہ دیر سلائے رکھنے کا مشورہ دیا۔

"وہ پہلے ہی انتہائی ڈوز پر ہیں، اس سے زیادہ نہیں کیا جا سکتا۔" اسیر نے کہا۔ وہ کچھ اور سوچ رہا تھا۔

"مجھے یہاں آئے کچھ دن ہی ہوئے ہیں اور فی الحال میرا قیام ہاسپٹل کی طرف سے دی گئی ٹیمپرری آکوموڈیشن میں ہے لیکن مجھے جلد اپنے لیے رہائش کا انتظام کرنا ہے۔ اگر یہاں آس پاس کہیں کوئی کرایے کا مکان مل جائے تو میں ان سے روز ملنے آسکتا ہوں، اس طرح وہ میری تلاش میں گھر سے باہر نہیں نکلیں گی۔"

"بیٹا! یہ آپ کا مسئلہ نہیں ہے آپ اتنا تردد نہ کریں۔" عبدالخالق نے کہا۔

"تردد کیسا انکل اور آنٹی کا یہ پرابلم میری وجہ سے ہی ہے۔"

"بالکل!" دروازے میں کھڑی صائبہ کے دل نے تائید کی۔ "سب کی طرح آپ بھی ہاتھ جھٹک دیتے تو یہ سب نہ ہوتا۔" اس نے سوچا۔

"باہر والا کمرہ کسی کے استعمال میں ہے؟" تایا جان نے پوچھا۔

"نہیں۔"

"اگر آپ مناسب سمجھیں تو یہیں اس کمرے میں رہ سکتے ہیں، کیوں عبدالخالق؟"

"یہاں؟" اس کا پیشہ، رتبہ، حلیہ اعلا کی اعلیٰ کار کچھ بھی اس متوسط طبقے کے گلی محلے میں رہنے لائق نہ تھا۔

"کوئی مسئلہ ہے؟" تایا جان نے پوچھا۔

"مسئلہ انھیں ہوگا۔ یہ عام سا کمرہ اور......"

"مجھے یہاں رہنے میں کوئی مسئلہ نہیں انکل! مجھے کہیں تو رہنا ہے اور میرا زیادہ وقت ہاسپٹل میں گزرتا ہے، صرف ایک دن آف ہوتا ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ وہ یہاں رہنے پر تیار تھا۔

تایا جان اور اسیر کے اصرار پر عبدالخالق کو ماننا پڑا۔

اور یوں وہ باورچی خانے کے سامنے والے کمرے میں منتقل ہو گیا۔ نورن خالہ سے وہ اس کی صفائی کروائی رہتی تھی اور فارن ریٹرن بیٹے اور شہری بٹی کا سوچ کر عبدالخالق نے پہلے ہی اس کمرے کو ان کی ضروریات کے مطابق کر رکھا تھا۔

ہاجرہ کی خوشی کی انتہا نہیں تھی۔ یوں تو وہ زیادہ تر دواؤں کے زیر اثر ہوتی تھیں۔ کم ہی بات کرتی تھیں پھر بھی بیٹے کی موجودگی نے ان پر اچھا اثر ڈالا تھا۔ جس رات وہ دیر سے آتا اس کی اگلی صبح ناشتہ ہاجرہ کے ساتھ کرتا تھا۔ دوپہر کا کھانا اس نے کبھی گھر پر نہیں کھایا۔ کبھی کبھی رات کے کھانے پر وہ چاروں میز پر ہوتے تھے۔ ہاجرہ اس سے زیادہ بات نہیں کرتی تھیں مگر اس کی پلیٹ میں اپنے ہاتھ سے کھانا ڈالنا، وہ نہ ہوتو اس کا پوچھنا اور اس سے کب آئے گا، زیادہ کام نہ کرنے کی تاکید اور جلدی گھر آئے جیسے جملے ہی بولا کرتی تھیں۔ صائبہ کو کئی بار لگتا تھا اکثر انھیں اس سچ کا احساس رہتا ہے کہ وہ ثوبان نہیں ہے۔ اس کا اور اسیر کا آمنا سامنا کم ہی ہوتا تھا۔ عموماً اس کی سرجریز اتوار کے علاوہ روز صبح صبح ہوتی تھیں۔ او پی ڈی کے اوقات ہفتے میں دو دن ہی تھے۔ کبھی وہ شام میں گھر آجاتا تو کبھی دیر رات کو۔

اسے ایک اطمینان تو تھا کہ اب ہاجرہ گھر سے باہر نہیں جائیں گی مگر اسیر کے یہاں رہنے سے بڑی

بے آرامی بھی تھی۔ حالاں کہ ان کی آپس میں کوئی خاص بات بھی نہیں ہوتی تھی۔ اسیر پورا خیال رکھتا تھا وہ اس کے آنے سے پہلے جیسے رہتی تھی اس کے معمول میں خلل نہ پڑے۔ وہ کمرے میں ہوتا بھی تو عبدالخالق کے آنے یا ان کے آواز دینے اور بلانے پر ہی باہر نکلتا تھا۔ اس کی سرجریز اتوار کے علاوہ روز صبح صبح ہوتی تھیں۔ او پی ڈی کے اوقات ہفتہ میں دو دن ہی تھے۔ کبھی وہ شام میں گھر آجا، تو کبھی دیر رات کو۔

اسے ایک اطمینان تو تھا کہ اب ہاجرہ گھر سے باہر نہیں جائیں گی مگر اسیر کے یہاں رہنے سے بڑی بے آرامی بھی تھی۔ حالانکہ ان میں آپس میں کوئی خاص بات بھی نہیں ہوتی تھی۔ اسیر پورا خیال رکھتا تھا کہ وہ اس کے آنے سے پہلے جیسے رہتی تھی۔ اس کے معمول میں خلل نہ پڑے۔ ان سب کے باوجود صائبہ کو ہر لمحہ اس کی موجودگی کا خیال رہتا تھا۔

☆☆☆

ایمرجنسی سرجری کے بعد وہ رات دو بجے گھر پہنچا تھا۔ صحن کا دروازہ کھول کر اندر جاتے ہوئے ہال میں نظر پڑی۔ کھڑکی سے صوفے کے پیچھے سے پیر دکھائی دے رہے تھے۔ کسی انہونی کے خیال سے وہ تیزی سے ہال میں آیا۔ صائبہ دروازے کی طرف چہرہ کیے فرش پر سو رہی تھی۔ اس کا بایاں ہاتھ سامنے فرش پر پھیلا تھا۔ اسیر نے بیگ صوفے پر رکھا اور چابی جیب میں رکھتا قریب آیا پھر چند لمحوں کے توقف کے بعد گھٹنے موڑ کر نیچے بیٹھ گیا۔ ہتھیلی کی پشت پر تخریب کاری کے نئے نشان دیکھ کر اس کا دل دکھ سے بھر گیا۔ سوتے ہوئے بھی اس کے چہرے پر اداسی غالب تھی۔ جانے یہ اس کا معمول تھا یا آج ہی وہ یہاں سو گئی تھی۔ کچھ دیر اسے جگائے یا نہیں کی کشمکش کے بعد وہ کھڑا ہو گیا۔ اس گہری نیند کو توڑنا کسی صورت درست نہیں تھا۔ لائٹ بند کر کے نائٹ بلب لگانے اور اسے چادر اوڑھانے کا خیال بھی اس نے رد کر دیا۔ اپنے کمرے کا آرام چھوڑ کر اس طرح یہاں وہ جانے کس جذبے کی تسکین کے لیے آئی تھی۔ جو بھی تھا، اسے لگا اس راز میں کوئی اور بھی شریک ہو چکا ہے، یہ بات اسے اچھی نہیں لگے گی۔ وہ سب کچھ یونہی چھوڑ کر کمرے میں چلا گیا۔ اسے جو سوال پریشان کرتا تھا، اگلے دن اس نے عبدالخالق سے اس کا جواب پوچھ ہی لیا جو عین اس کے اندازے کے مطابق تھا۔

☆☆☆

وہ رات کو گھر آیا تو دروازے پر ہی ہاجرہ کی تیز آواز سنائی دی۔

"آپ اس سے کہہ دیں شکل نہ دکھایا کرے مجھے۔" کھانے کے بعد وہ ان کی دواؤں کا ڈبہ لے کر آئی تو وہ اچانک بگڑ گئی تھیں۔

"تم ابھی چلو اندر۔" وہ انھیں اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

"آپ جانتے ہیں ناں یہی تھی وہ پھر کیوں اسے گھر میں رکھا ہے۔" وہ اٹھنے تیار نہیں تھیں۔

"ہاجرہ کمرے میں چلو، دیکھو دوائی کا وقت نکلا جا رہا ہے۔"

"پہلے آپ اسے کہیں یہاں سے جائے۔" عبدالخالق نے بے بسی سے بیٹی کو دیکھا۔ جان سے پیاری بیٹی کے لیے اپنی بے بسی انھیں بہت شرمندہ کرتی تھی۔ وہ آنسو پیتی سست قدم سے دروازے کی سمت جانے لگی۔ ہاجرہ اٹھ گئیں۔ وہ اسے لیے کمرے میں چلے گئے۔ دروازے سے باہر نکلتے ہی وہ اسے دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔

"تنہا ذلیل ہونا زیادہ آسان ہے۔" اس نے سوچا۔

اسیر کچھ کہتا اس سے پہلے وہ واپس دروازے سے اندر چلی گئی۔ ہال اب خالی تھا۔ وہ بھی اپنے کمرے میں چلا گیا۔

عبدالخالق فجر پڑھ کے آنے کے بعد پھر سو جاتے تھے۔ وہ ان کے کمرے میں جاتے ہی دبے پاؤں باہر نکل گئی۔ جب گھر میں دم گھٹنے لگتا تھا تو وہ

pklibrary.com

فیکٹری کے پیچھے والے پرانے راستے پر آتی تھی جو اب زیر استعمال نہیں تھا اس لیے سنسان ہوتا تھا۔ گلیوں کے بیچ اس نے یہاں کا شارٹ کٹ تلاش کر لیا تھا۔ گھر سے نکل کر کھلے آسمان کے نیچے کچھ دیر سانسیں بحال کر کے وہ آگے کا بوجھ ڈھونے کو تازہ دم ہو جاتی تھی۔ اس کے کچھ دیر بعد جاگنگ کے لیے باہر نکلے اسیر نے اسے پیچھے سے پہچان لیا تھا۔

"اتنی صبح کہاں؟" اسے گزشتہ رات کا واقعہ یاد آیا۔ وہ دبے قدموں سے اس کے پیچھے ہولیا۔ وہ تنگ سی گلیوں سے گزر کر قدرتے سنسان حصے میں ذرا دور چل کر اس راستے تک پہنچی تھی۔ آگے جانے کے بجائے دائیں مڑ کر وہ پیپل کے گھنے پیڑ کے نیچے پڑے پتھروں پر بیٹھ گئی۔ صبح کاذب کا اجالا پھیلا تھا۔ سب کچھ دھندلا سا تھا۔ فضا میں دن کی ابتدائی مہک بکھری تھی۔ وہ اس کی طرف سے کسی انتہائی قدم یا حرکت کا منتظر تھا مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ کچھ دیر کے بعد وہ وہاں سے اٹھ گئی۔ وہ اسے خبر کیے بغیر واپس گھر تک اس کے پیچھے آیا تھا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر چلی گئی تب وہ اپنے جاگنگ والے راستے پر ہولیا۔

☆☆☆

تائی امی اپنی بیٹی زینت کے ہمراہ ملنے آئی تھیں۔ وہ اس سے چند ماہ بڑی تھی۔ جب بھی میکے آتی، ملنے ضرور آتی تھی۔ آج وہ اپنے ڈھائی سالہ شرارتی بیٹے کو گھر ہی چھوڑ آئی تھی۔ اتوار تھا اس لیے عبدالخالق اور اسیر بھی گھر میں تھے۔

"چاچا جان! میری نند اپنے دیور کے لیے لڑکی کی تلاش میں ہے۔" کھانے کے بعد ہاجرہ کی دواؤں کا وقت ہو گیا تھا سو وہ انھیں لے کر کمرے میں جا رہی تھی تب پیچھے سے زینت کی آواز آئی۔

"آپ کی اجازت ہو تو میں انھیں صائبہ کے لیے یہاں بلاؤں۔" عبدالخالق کو اس قسم کے سوال کا جواب کا دینا ہمیشہ مشکل لگتا تھا۔

"جب تک صائبہ شادی کے لیے رضامند نہیں ہو جاتی کسی کا بھی آنا سودمند نہیں ہوگا زینت بیٹا۔"

"کب تک اس پر چھوڑے رہیں گے؟ آپ خود ہی فیصلہ سنا دیں کہ اس سال یا آئندہ سال شادی کرنا ہے پھر آنے والے رشتوں میں جو اسے پسند ہو وہاں کر دیں۔"

"میں اس پر کسی قسم کا دباؤ نہیں ڈالنا چاہتا نہ ہی چاہتا ہوں، وہ میرے زور دینے پر زبردستی کوئی فیصلہ کرے۔"

"چاچا جان! میں آپ کی بات سمجھ رہی ہوں مگر آپ یہ بھی تو سوچیں، وقت ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔"

"وہ شاید ہاجرہ اور آپ کے تنہا رہ جانے کی وجہ سے کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی ہو۔"

تائی نے کہا تو خیر خواہی کی یہ کوشش عبدالخالق کے شانے مزید جھکا گئی۔ بیٹی کو ہنستے مسکراتے دیکھنے کا خواہش مند باپ اس کی اداسی کے پیچھے اپنا چہرہ دیکھ کر کس خارزار سے گزرتا ہے، یہ دوسرے نہیں سمجھ سکتے۔

"آپ کہیں تو میں بات کروں اس سے؟"

"ہمم۔" پرسوچ انداز میں انہوں نے سر ہلایا۔

وہ ہاجرہ کے سو جانے کے بعد واپس آئی تو زینت اسے لے کر صحن میں آ گئی۔ اسے اندازہ تھا، وہ اسے کیوں باہر لائی ہے۔

"کچن میں چلو، وہاں بات کرتے ہیں، میرا کام بھی ہو جائے گا۔" اسے اسیر کی موجودگی کا خیال تھا۔ زینت کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ باورچی خانے میں چلی گئی۔ اسے بھی پیچھے جانا پڑا۔

"میں گول مول بات نہیں کروں گی صائبہ۔" زینت اکلوتا اسٹول کھینچ کر اس پر بیٹھ گئی۔

"تم کچھ مہینے ہی چھوٹی ہو مجھ سے اور ساری کزنز میں تم ہی بچی ہو، شادی کے لیے چاچا جان تمہاری رضامندی کے لیے رکے ہیں تو بتاؤ، تم کیوں اب تک نا کر رہی ہو؟" وہ اس کی سمت پشت کیے تھی۔

pklibrary.com

"کچھ بھی چھپا نہیں ہے تم سے، امی کی حالت سامنے ہے، ابو ظاہر نہیں کرتے مگر وہ جسمانی، جذباتی اور ذہنی طور پر بہت کمزور ہو گئے ہیں، ایسے میں انھیں کیسے چھوڑ دوں؟"

"چھوڑنے کا کون کہہ رہا ہے، چاچا جان اور چاچی جان نعمان بھائی یا لائبہ باجی کے پاس کراچی چلے جائیں گے۔"

"وہ یہ گھر اور شہر کبھی نہیں چھوڑیں گے۔" وہ جانتی تھی وہ دونوں یہ گھر کبھی نہیں چھوڑیں گے کہ کسی دن ثوبان لوٹا تو اسے یہ در کھلا ملنا چاہیے۔

"حالات کے ساتھ سب کو سمجھوتا کرنا پڑتا ہے۔"

"میں نے بھی وہی کیا ہے زینت! اس لیے تم میری شادی پر زور نہ دو۔" اس نے پلٹ کر مضبوط لہجے میں کہا۔

"صائبہ! تم کب تک اس واقعے کو دل سے لگائے بیٹھی رہو گی؟ سب آگے بڑھ گئے ہیں، تم بھی سب بھول کر آگے بڑھو، لائبہ باجی اور نعمان بھائی نے کیسے اپنی زندگی سنوار لی، تم بھی کرو، تم بچی تھیں اس وقت۔ ناسمجھ نادان، وہ سب انجانے میں ہوا تھا۔"

یہ الزام لوگوں کو تسلی لگتا تھا اور وہ چاہتے تھے کی ان کی تسلیاں اسے سکون دیں، وہ یہ سن کر آگے بڑھ جائے مگر ہر بار ان کے الفاظ اس کی اذیت میں اضافہ ہی کرتے تھے جیسے اس وقت زینت کے جملے کٹ کٹ کر کے اس کے ٹانکے ادھیڑ گئے تھے۔ اس نے اداس مسکراہٹ کے ساتھ رخ موڑ لیا۔

اس نے چائے چڑھائی، تب تک زینت اس کی خاموشی کو 'بات اثر کر رہی' والی چپ سمجھ کر مزید سمجھاتی رہی اور اس کی باتیں صائبہ کے ناخنوں کا کام انجام دیتی رہیں۔ وہ خالی کپ ٹرے میں رکھ رہی تھی تب تائی نے ہال کے دروازے سے گھبرائی سی آواز لگائی۔

"زینت! معیز سیڑھیوں سے گر گیا ہے۔"

زینت جملہ ادھورا چھوڑ باہر بھاگی۔

فون پر بات کرتے ہی وہ دونوں فوراً گھر جانے تیار ہو گئیں۔ ارباب بھائی اسے قریبی کلینک لے جا رہے تھے۔

"میں بھی چلتا ہوں۔" عبدالخالق کو گھبرائی پریشان دو خواتین کو تنہا بھیجنا مناسب نہیں لگا۔

ان کے جانے کے بعد وہ واپس باورچی خانے میں آئی۔ وہ چولہا بند کرنا بھول گئی تھی اور اب پک پک کر چائے نصف رہ گئی تھی۔ زینت کے جملے اب بھی اس کے آس پاس گونج رہے تھے۔ وہ سلیب کے کنارے پر ہاتھ رکھے کھول کھول کر رنگت بدل چکی چائے پر نظر جمائے کھڑی تھی۔ کمرے سے باہر نکل رہا اسیر ٹھٹک کر دروازے میں ہی رک گیا۔ وہ پھر بے خیالی میں بائیں ہتھیلی کی پشت کرید رہی تھی۔ اچانک اس نے ہاتھ روکا اور چائے کے برتن کا ہینڈل تھاما۔ اسیر کا دل چاہا آواز دے کر اسے متوجہ کرے مگر وہ کچھ کرتا، اس سے پہلے وہ ساس پین کا ہینڈل اٹھا کر سنک کی طرف بڑھی اور اس کا اگلا عمل ذہن میں آتے ہی اسیر پلک جھپکتے ہی باورچی خانے میں آ کر چیخا۔

"اسٹاپ!" مگر دیر ہو چکی تھی۔ وہ کھولتی چائے بائیں ہاتھ پر انڈیل رہی تھی۔ اسیر نے ساس پین چھین کر سنک میں پھینکا اور کلائی پکڑ کر ہاتھ نلکے کے نیچے کر کے پانی ڈالنا شروع کیا۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار نہیں تھے لیکن آنسو بہہ رہے تھے۔ اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔

"یہ ہاتھ ڈاکٹر کے ہاتھ میں ہے۔" اسیر نے سنجیدگی سے کہا۔ نلکا اور چولہا بند کیا اور یونہی اس کی کلائی تھامے اپنے کمرے میں آیا۔

"بیٹھیں۔" کمرے کی اکلوتی کرسی کے قریب لا کر اسے حکم دیا۔ وہ بیٹھ گئی۔

اسیر نے اس کا ہاتھ اب بھی نہیں چھوڑا تھا۔ اسے ڈر تھا وہ پھر کھرچنے لگے گی۔ میز پر ہی فرسٹ ایڈ باکس رکھا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے باکس اٹھایا

pklibrary.com

اور پنجے موڑ کر فرش پر بیٹھ گیا۔ وہ سر جھکائے آنسو بہاتی خاموشی سے اس طبیب کی حرکتیں دیکھ رہی تھی۔ زخم خشک کرنے کے بعد اس نے ہتھیلی اسی کے زانو پر رکھی پھر کوئی آئنمینٹ سرخ جلے حصے پر پھیلایا۔ وہ زخم ہی نہیں پوری ہتھیلی کی پشت متاثر ہوئی تھی۔ شکر تھا اس وقت اس کے پاس سلور سلفاڈائزین آئنمنٹ تھا مگر فائن میش گاز نہیں تھا۔ زخم پر ویسے اس کی ضرورت نہیں تھی لیکن کچھ بعید نہ تھا اس کا ہاتھ پھر وہاں تک پہنچ جاتا۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر سر جھکائے بیٹھی صائبہ دیکھا۔

"آپ مجھے یقین دلائیں اس زخم کو چھوئیں گی نہیں۔"

اس نے جواب دینے کے بجائے دائیں ہاتھ سے گال خشک کیے اور بایاں ہاتھ زانو سے اٹھانا چاہا۔ اسیر نے پھر اس کی کلائی پر ہاتھ رکھا۔

"ورنہ مجھے ابھی آپ کو ہاسپٹل لے جا کر اس کے ٹھیک ہونے تک وہاں ایڈمٹ کرنا پڑے گا۔" وہ سنجیدہ تھا۔ وہ اب بھی چپ رہی۔ خود کو روکتے روکتے بھی وہ پوچھ بیٹھا۔

"کیوں کیا آپ نے ایسا؟" وہ چند ثانیے اسے دیکھتی رہی پھر اچانک آنکھوں پر ہتھیلی رکھ کر رونے لگی۔ کچھ دیر بعد اس نے پکارا۔

"صائبہ!" اس نے سنبھل کر آنسو روکے اور ہتھیلی آنکھوں سے ہٹائی۔ وہ اس سے کھل کر بات کرنے کا ارادہ کر چکا تھا۔

"ابو سے مت کہیے گا پلیز۔" اس نے التجا کی۔

"یہ ان سے چھپ نہیں سکے گا۔" اسیر نے اس کی کلائی سے ہاتھ ہٹا لیا۔ "آپ کچھ دن کام بھی نہیں کر سکیں گی۔"

اس نے زانو پر دھری ہتھیلی کی پشت کو دیکھا۔

"میں کہوں گی، غلطی سے گرم پانی گر گیا تھا، آپ بھی یہ ہی یاد رکھیں۔" اس کی نئی فکر بھانپ کر اسیر نے بات کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ وہ کھڑا ہو گیا۔

"ایک شرط پر۔" اس نے میز پر رکھے بیگ سے دوائی کی اسٹریپ نکالی۔ "آپ کو آئنمنٹ کے ساتھ دو وقت میڈیسن لینا ہو گی۔ ایک یہ ٹیبلیٹ اور مزید دو ٹیبلیٹس جو فی الحال میرے پاس نہیں ہیں، میں بعد میں دیتا ہوں۔"

اس نے اسٹریپ اس کے سامنے کی مگر وہ فوراً ہاتھ بڑھا کر لے نہیں سکی۔ وہ اس توجہ اور خیال کے قابل تو نہیں تھی۔ درد اور تکلیف میں تخفیف بھی اس کا مقصد نہیں رہا تھا۔ یہ تو اسے زندہ ہونے کا احساس دلاتے تھے، سزا جاری رہنے کا احساس۔

"پھر میں انکل سے سچ کہہ دیتا ہوں۔" اس نے ہاتھ پیچھے کیا۔

"نہیں......" صائبہ نے ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھ سے اسٹریپ لے لی۔

"میں ساری میڈیسن لوں گی۔" وہ کرسی چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

"گڈ۔" اسیر نے آئنمنٹ اٹھا کر اس کی سمت بڑھایا۔ اس نے لے لیا اور کچھ کہے بغیر چلی گئی۔ وہ پیچھے میز سے ٹیک لگائے اسے جاتے دیکھتا رہا۔ اس کا پہلے والی غلطی دہرانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

☆☆☆

عبدالخالق دو ڈھائی گھنٹے بعد واپس آئے۔ معیز کو سر میں دو ٹانکے لگے تھے۔ اسے ایک ہاتھ سے کام کرتے دیکھ کر انہوں نے پوچھا اور اس نے طے شدہ جھوٹی وجہ بیان کر دی۔

کچھ لگایا اس پر؟

"جی! ڈاکٹر صاحب نے دوائی اور آئنمنٹ دیا ہے۔"

رات کھانے کی میز پر اس نے قصداً بقیہ دوائیاں عبدالخالق کے سامنے اسے دیں۔

"تینوں ٹیبلیٹس دو ٹائم لینا ہیں اور آئنمنٹ چار پانچ بار لگائیں، اسے گیلا کریں نہ اس ہاتھ سے کوئی کام کریں۔"

"دھیان سے کام کیا کرو۔" ہاجرہ نے کہا۔

pklibrary.com

آپ نورن کو فون کر دیں، اس کا ہاتھ ٹھیک ہوتا ہے تب تک وہ کھانا بھی بنا دیا کرے گی۔" انھیں بیٹے کی فکر لاحق ہوئی تھی۔ صائبہ کام نہیں کرے گی تو اسے وقت پر سب کچھ کیسے ملے گا۔

"میں نے کر دیا ہے انھیں فون۔" صائبہ نے کہا۔

"ہمم۔ توجہ سے کام کیا کرو۔"

"جی۔" اس کے لیے یہ ہی خوشی کی بات تھی کہ اسیر کی آمد کے بعد سے وہ اس سے بھی کبھار ایسے معمول کے انداز میں بات کر لیا کرتی تھیں۔

☆☆☆

نورن خالہ اسیر کے کمرے کی صفائی کے بعد ہر دو دن میں مشین میں اس کے کپڑے دھویا کرتی اور وہی اس کے کمرے میں رکھ بھی آتی تھی۔ روز کی طرح تو ان خالہ بقیہ دھلے کپڑے تار سے اتار کر صوفے پر ڈھیر کر گئی تھیں۔ سہ پہر کو کپڑے تہہ کرتے ہوئے ان میں اسے اسیر کے کمرے کے دونوں تولیے بھی ملے۔

"نورن خالہ یہ بھول گئیں۔" اس نے کھڑکی سے اس کے کمرے کے کھلے دروازے کی سمت دیکھا۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی آیا تھا۔

"ہو سکتا ہے انھیں اس وقت ان کی ضرورت ہو۔" وہ دونوں تولیے لیے اس کے دروازے تک آئی۔ وہ پلنگ پر بیٹھا فون پر کسی سے انگریزی میں بات کر رہا تھا، جوتے بھی نہیں اتارے تھے۔

"مجھے آپی نے بتایا تھا، مبارک ہو!" وہ دروازے میں ہی رک گئی۔ وہ دوسری طرف کی سن کر بہت نرمی سے جواب دے رہا تھا۔

"نہیں۔" وہ ہلکے سے ہنسا۔ "کارڈ کے بنا بھی شادی میں شریک ہو سکتا ہوں، ویسے کہاں جا رہی ہیں شادی کے بعد؟"

"بہت دور جا رہی ہیں۔"

"اگر مصروفیت نے اجازت دی تو ضرور شریک ہوں گا۔"

"نہیں، ایسی بات نہیں۔ میرے مینٹور محسن ڈاکٹر ربانی نے کہا تھا یہاں جنرل سرجن کی اشد ضرورت ہے، کچھ مہینے کی بات ہے۔"

"میں ناراض نہیں سبرینہ! میں چاہتا ہوں آپ، میں اور ہم سب ماضی بھول کر خوش رہیں۔"

"کچھ تعلقات کی عمر بہت مختصر ہوتی ہے، یہ بھی ایسا ہی تعلق تھا۔"

"میں واقعی خوش ہوں کہ آپ نے شادی کا فیصلہ کیا۔"

"بہت دعائیں اور نیک تمنائیں۔" وہ اچانک کھڑا ہو کر پلٹا۔ صائبہ کو وہاں سے ہٹنے اور چھپنے کا موقع نہیں ملا۔

"خیال رکھیے گا، بائے۔" اس نے فون بند کیا اور دروازے کے پاس آیا۔

"نورن خالہ یہ بھول گئی تھیں۔" اس نے دونوں ہاتھوں کے درمیان رکھے تولیے آگے کیے۔

"آپ کا ہاتھ کیسا ہے اب؟" اس کی بائیں ہتھیلی اوپر تھی۔ اسیر نے تولیے لے لیے۔

"ٹھیک ہے۔"

"میڈیسن پابندی سے لے رہی ہیں؟"

"کل بھول گئی تھی۔" اس نے جھوٹ نہیں بولا۔

"میں سخت قسم کا ڈاکٹر نہیں اور آپ بہت لاپروا پیشنٹ، کیسے مینج ہو گا ٹریٹمنٹ؟"

"یہ اچھا ہو گیا ہے۔" اس نے ہتھیلی دوپٹے میں چھپائی۔

"یہ ڈاکٹر طے کرتا ہے، پیشنٹ نہیں۔" وہ پہلی بار نروس لگ رہی تھی۔

"دکھائیں۔" اس نے حکم دیا۔ صائبہ نے ذرا سے تعرض کے بعد ہاتھ آگے کیا۔ بے ترتیب اور ناہموار کناروں والا دو ڈھائی انچ کا وہ دائرہ نما سا حصہ اس کے صاف گندمی رنگ سے زیادہ گہرا تھا۔ ہتھیلی کی پشت کا یہ حصہ ناخن سے بار بار کھرچنے، کریدنے اور خون رسنے والے زخم کو ہمیشہ ہرا رکھنے کی ساری کوششوں کا کامیاب ثبوت تھا۔ جس پر گرم

pklibrary.com

چائے نے مزید ستم ڈھایا تھا۔ آبلے نہیں بنے تھے مگر زخم ابھی بھی مکمل خشک نہیں ہوا تھا۔
"یہ ابھی ٹھیک نہیں ہوا ہے۔" اس نے ہاتھ نیچے کرلیا۔
"میں میڈیسن کا وقت یاد دلانے آپ کو کال کروں یا آپ صبح شام میرے سامنے میڈیسن لیں گی؟" وہ سر اونچا کر کے اسے دیکھنے لگی۔ یہ سب اتنا ضروری کب سے ہوگیا تھا؟ پھر اسے یاد آیا اس نے کہا تھا یہ ہاتھ ڈاکٹر کے ہاتھ میں ہے۔
"میں خود ہی وقت پر لے لوں گی۔"
اسے اس یقین، دہانی پر یقین نہیں آیا تھا مگر اس نے مزید کچھ نہیں کہا۔
"اوکے۔"
وہ پلٹ کر ہال میں آگئی۔ "سبرینہ۔" اس نے دل میں دہرایا۔ "خوبصورت نام ہے۔"
☆☆☆
صبح ہال میں آئی تو وہ میز پر اخبار پھیلائے بیٹھا تھا۔ اس نے کافی کا مگ میز پر رکھا۔
"تھینک یو۔" اس نے اخبار ایک طرف کر کے مگ اٹھالیا۔ وہ جانے لگی تھی کہ اس نے پکارا۔
"صابئہ!" وہ انگلیاں مروڑتی اسے دیکھنے لگی۔
"بیٹھیں۔" وہ جھجکتے ہوئے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔
"باقی باتوں کے لیے میں آپ سے گزارش ہی کرسکتا ہوں مگر ایز اے ڈاکٹر اس ہاتھ کے لیے آپ کو حکم دینے کا اختیار رکھتا ہوں۔" اس نے ہاتھ پھر دوپٹے کے اندر کر لیا۔ وہ پابندی سے ہاتھ کی پروگریس دیکھتا تھا اس لیے وہ بھی خیال رکھنے لگی تھی۔
"اب یہ ٹھیک ہے۔"
"جب تک یہ ڈارک سپاٹ باقی ہاتھ جیسا نہیں ہو جاتا، اسے ٹھیک نہیں کہا جا سکتا۔" وہ جو کہہ رہا تھا، وہ ناممکن تھا۔
"ڈاکٹرز کو وعدہ لے کر ٹریٹمنٹ کی اجازت ہوتی تو میں آپ سے وعدہ لے لیتا۔" وہ سر جھکا گئی۔
"یہ میڈیسن اور آئنمنٹ سے نہیں آپ کی قوت ارادی سے ہی مٹ سکتا ہے۔"
"اور مجھے اپنی قوت ارادی پر بھروسا نہیں۔" وہ اسے ایک ناکام مشقت سے باز رکھنا چاہ رہی تھی۔
"پھر آپ وعدہ کرلیں۔" وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر آہستہ سے کہا۔
"میں کوشش کروں گی۔"
"گڈ۔" وہ اٹھ کر جانے لگی تھی کہ اسیر نے کہا۔
"آپ کافی اچھی بناتی ہیں۔" اس بالکل نئی بات پر وہ اسے دیکھنے لگی۔ وہ مسکرا رہا تھا اور اس دل فریب مسکراہٹ میں کوئی نئی بات تھی۔
☆☆☆
صبح والی دو سرجریز انیستھیسٹ کی عدم دستیابی کی وجہ سے کینسل ہو گئی تھیں، اس لیے وہ صبح سے ہاجرہ کے ساتھ ناشتے کی میز پر موجود تھا اور وہ بے انتہا خوش تھیں۔ وہ روز صبح صرف کافی پی کر جاتا تھا اور اس وقت اسے گھی والا پراٹھا اور آملیٹ کھلانے کے بعد ہاجرہ نے چائے کے مگ کے ساتھ دوسرا پراٹھا بھی اس کے آگے کیا تو اسے اس پر ترس آگیا۔
"امی! انھیں پراٹھے نہیں پسند۔" وہ مدد کو آگے آئی۔ ایک پراٹھا اس نے مروت میں کھا لیا ہوگا مگر اب دوسرا ظلم ہوگا۔
"تمھیں کہاں ثوبان کی پسند کا علم ہے۔" انہوں نے برہمی سے گھورا پھر اس کی سمت دیکھ کر بڑے پیار سے کہا۔ "تم کھاؤ بیٹا۔"
وہ ایک اجنبی کو اپنا بیٹا مان چکی تھیں پھر بھی انھیں اس کا قصور، اس کا گناہ کیوں نہیں بھولتا تھا؟ اس سے لگاوٹ اور شفقت سے بات کرتے ہوئے جب وہ اس سے لاتعلقی اور ناگواری سے بات کرتیں تو اسے بہت دکھ ہوتا تھا اور یہ اذیت پچھلی ساری تکالیف پر بھاری محسوس ہوتی تھی۔

pklibrary.com

"امی یہ......"

"تم جاؤ کچن دیکھو۔" انہوں نے اسے بری طرح جھڑک دیا۔ اسیر نے بے بسی سے اسے دیکھا جس کی آنکھیں ایک دم لبالب ہوگئی تھیں۔ وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ یہاں رہنے کے فیصلے کے پیچھے اس گھر کے مکینوں کو تھوڑی آسانیاں اور کچھ سکون دینا اس کا مقصد تھا۔ ذرا دیر پہلے والی صورت حال کا اس نے تصور نہیں کیا تھا۔ اس نے بمشکل چائے اور پراٹھا ختم کیا اور ان سے اجازت لے کر کھڑا ہوگیا۔

"آج پھر شام میں دیر مت کرنا۔" انہوں نے ماؤں والے حق سے تنبیہہ کی۔

"جی کوشش کروں گا۔" اس نے سعادت مندی سے کہا۔ ہال سے نکلتے ہوئے اس نے دائیں طرف دیکھا۔ وہ سنک کے قریب کھڑی برتن دھو رہی تھی۔ حالاں کہ اس کام کے لیے کچھ دیر بعد نورن خالہ آنے والی تھیں۔

پورا دن اس کی بھری آنکھیں اس کے ساتھ تھیں۔

شام میں عبدالخالق کے آنے کے بعد وہ ضروری سامان لینے کے بہانے گھر سے باہر نکلی۔ گھر سے دو تین گلیاں پار کرنے کے بعد اس کا رخ فیکٹری کے پیچھے والے راستے کی طرف تھا۔ اسے دل کھول کر رونے کے لیے بھی اتنی مشقت کرنا پڑتی تھی۔ دائیں طرف اپنے مخصوص پیڑ کی سمت بڑھتے ہوئے وہ ٹھٹھک کر رک گئی۔ سامنے دیکھی بھالی سفید کار کھڑی تھی اور قریب ہی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اسیر ٹہل رہا تھا۔ اس کا دل کیا فوراً پلٹ جائے مگر تب تک وہ اسے دیکھ چکا تھا۔ اسیر نے سیاہ چشمہ آنکھوں سے ہٹایا۔ دونوں اپنی جگہ خاموش کھڑے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

"گرمی بہت ہے، اندر بیٹھے؟" فاصلہ زیادہ تھا بالآخر اسیر نے اونچی آواز میں کہا اور اگلا دروازہ کھولا۔

یہ اتفاق نہیں تھا، وہ کس ارادے سے آیا تھا۔

صائبہ سوچتے ہوئے آگے آئی اور اگلی نشست پر بیٹھ گئی۔ دروازہ بند کرکے دوسری سمت سے وہ بھی اندر آیا۔ وہ ہینڈ بیگ گود میں رکھے ہاتھ اس پر جمائے بیٹھی تھی۔

"صبح کے لیے سوری۔ آپ اتنا نہ سوچا کریں، دو پراٹھے بھی کبھار کھا سکتا ہوں۔" اس نے ماحول بدلنے کے لیے بشاشت سے کہا۔

"آپ بھی اتنا نہ سوچیں۔" اس نے سر جھکا کے کہا۔

"آپ کیوں اب تک خود کو بلیم کرتی ہیں؟" اس کی خاموشی پر کچھ دیر چپ رہنے کے بعد اسیر نے پوچھا۔ سب کی طرح اس نے 'اس میں تمہاری کوئی غلطی نہیں۔' جیسی تسلی سے ابتدا نہیں کی تھی۔ غیر ارادتاً ہی اوپر رکھے دائیں ہاتھ کے ناخن بائیں ہتھیلی پر متحرک ہوئے اور اسیر نے اسے روکنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

"پلیز......" اس کے ہاتھ کے قریب پہنچ کر اس نے اپنا ہاتھ روکا۔ صائبہ نے دونوں ہاتھ دوپٹے کے اندر کر لیے۔

اسے سخت جواب دے کر وہاں سے چلے جانے کا خیال آیا، اس کی ان کے گھریلو معاملات میں دخل اندازی اور دلچسپی کی وجہ پوچھنے کا دل کیا، وہ اسے اس کے حال پر کیوں نہیں چھوڑ دیتا سوال ابھرا، غصہ آنے لگا، کوفت نے گھیرا، جھنجلاہٹ سوار ہوئی۔ سوچ کے ساتھ ساتھ بدلتے تاثرات کے ساتھ وہ اسے یک ٹک دیکھ رہی تھی۔

"صائبہ!" اسیر نے دھیرے سے پکار کر اس کی محویت توڑنا چاہی اور وہ ایک دم رونے لگی۔ گھر سے یہاں پہنچنے تک وہ ان کو بہلاتی آرہی تھی کہ اپنے مقام پر پہنچ کر بہنا اور یہ ان کے بے قابو ہونے کا ہی مقام تھا۔

"کیوں خود کو بلیم نہ کروں؟ میں نے اس کا ہاتھ چھوڑا تھا، میری نہیں تو کس کی غلطی ہے؟ اس نے نہیں کہا تھا میں لے گئی اسے وہاں، میری ذمہ داری

pklibrary.com

تھا وہ، اس بھیڑ میں، میں نے تنہا چھوڑا تھا اسے اور آپ پوچھ رہے ہیں، کیوں خود کو بلیم کرتی ہوں، کیوں نہ کروں؟ میرا نہیں تو کس کا قصور ہے؟" وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

" کسی کا نہیں، کسی کی غلطی نہیں تھی، کسی کا قصور نہیں ہے۔"

" یہ ہاتھ میں نے کھینچا تھا...... "اس نے اپنا ہاتھ سامنے کیا۔ "اس نے نہیں چھڑایا تھا، مجھے اس کے ساتھ سے زیادہ اپنی سہیلیوں کی پروا تھی، مجھے اس کی فکر کے بجائے کھانے کا لالچ تھا، غافل میں ہوئی تھی، امی کی جتائی بات میں بھول گئی تھی......"

" آپ چھ سال کی بچی تھیں، آپ کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو شاید یہی سب کرتا، میں بھی وہی سب کرتا جو آپ نے کیا، ہونی کو کوئی نہیں ٹال سکتا۔ ثوبان اور آپ سب کا ساتھ اتنا ہی تھا تو کوئی اور حادثہ بھی بہانا بن سکتا تھا۔"

" کوئی اور نہیں ناں، وہ میں ہوں......" اس نے اس درد بھری عاجزی سے کہا کہ اسیر کا دل لرزا۔

" آپ بس بہانا تھیں جو کوئی بھی ہو سکتا تھا، آپ اس حادثے کی مجرم نہیں اس لیے یہ خود ساختہ سزا ختم کریں۔" اس نے نرم لہجے میں کہا۔

" کیسے؟" آنسوؤں کے درمیان اس نے مشکل سے ایک لفظ کہا۔

" خود کو یقین دلائیں کہ آپ بھی اس حادثے کی وکٹم ہیں، پیچھے رہ جانے والے بچھڑ جانے والوں جتنا — ہی سہتے ہیں، بچھڑنے والے سب چھوڑ جاتے ہیں اور رہ جانے والوں کے لیے ان کے بنا سب چھوٹ جاتا ہے۔" اتنے سالوں میں یہ اس نے پہلی بار سنا تھا۔

" میں خود کو یقین دلا بھی دوں تو ثوبان...... ثوبان کا خیال...... "اس نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ "میری بے قراری، میری بے چینی کا آپ اندازہ بھی نہیں لگا سکتے، کیا کیا خیال آتے ہیں اور پھر یہ خیال کہ ایسا ہی سب کچھ امی ابو بھی سوچ رہے ہوں گے، ہر جانے کا دل کرتا ہے لیکن انھیں تنہا کرنے کا خیال مرنے نہیں دیتا"

اس کی آواز حلق اور آنکھوں میں، آنسوؤں کی زیادتی کے سبب پھنس سی گئی تھی۔ وہ رک کر ذرا سنبھلی۔

" اس لیے آپ ہمارے حالات اور اذیت کو سمجھتے ہیں، یہ غلط فہمی دور کر لیں۔" اس نے زندگی میں پہلی بار اتنی سخت اور دوٹوک بات کی تھی۔

دونوں ہاتھ چہرے پر پھیر کر اس نے رخ کھڑکی کی سمت کر لیا۔ اسیر بھی ایک گہری سانس خارج کر کے بند کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ ایک لمبی خاموشی کے بعد اسیر نے پھر اس کی سمت دیکھا۔

" کیسے خیال آتے ہیں؟"

اس نے فوراً کچھ نہیں کہا لیکن کچھ دیر بعد کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے خود کلامی کے انداز میں کہنا شروع کیا۔

" کہاں ہوگا اس وقت ثوبان، اس کے ساتھ کیا ہوا ہوگا، پانچ سال کا وہ معصوم کس کے ہتھے چڑھا ہوگا، کتنا رویا ہوگا وہ، جانے کب تک بھٹکتا رہا ہوگا، کتنا ڈرا ہوا ہوگا وہ، کتنا یاد کیا ہوگا اس نے ہم سب کو، بہت چیخا چلایا ہوگا، کسی نے اس کی آواز سنی بھی ہوگی یا نہیں، اسے بھی اندھیرے سے ڈر لگتا تھا، کسی نے اس کی مدد کی ہوگی یا نہیں، ہماری طرح پھر کس نے پیار کیا ہوگا اس سے......" وہ پھر رونے لگی تھی۔

" چلتے چلتے اس کی چپلیں ٹوٹ گئی ہوں گی، ہمت جواب دے گئی ہوگی، جانے کتنے دن تک وہ بھوکا ہوگا، اسے کسی نے پانی بھی دیا ہوگا یا نہیں، اسے غلط لوگوں نے پکڑا ہوگا تو کیسے ظلم ڈھائے ہوں گے اس پر، کیا وہ اس سے بھیک منگوا رہے ہوں گے...... اس کے لیے تو وہ ہاتھ پیر توڑ دیتے ہیں، اندھا بہرا بنا دیتے ہیں...... وہ کسی سگنل یا فٹ پاتھ پر کھلے آسمان تلے زندگی گزار رہا ہوگا تو......"

اس کی آواز میں درد سے دراڑیں پڑ رہی تھیں، آنسو بار بار راستہ روک رہے تھے مگر وہ رک نہیں رہی

pklibrary.com

تھی۔

"کچھ مزدوری کے لیے بیچ دیتے ہیں، کتنے دام لگے ہوں گے امی ابو کے جگر کے ٹکڑے کے، اس کے معصوم اور ننھے ننھے ہاتھ بوجھ اٹھانے کے لیے تو نہیں تھے، کیا اب بھی وہ کسی کا غلام ہوگا، مالک کی مرضی سے اٹھنے بیٹھنے والا نوکر ہوگا...... یا اسے چائلڈ ٹرافکنگ والوں نے اٹھایا تھا وہ تو بچوں سے......" اس نے گردن موڑ کر اسیر کو دیکھا۔

"جب خیال آتا ہے کہیں وہ جنسی جرائم میں ملوث افراد کے پاس تو نہیں پہنچا تب دوسرا خیال یہ آتا ہے اللہ کرے اس سے پہلے اس کی زندگی پوری ہوگئی ہو وہ مر گیا ہو......" وہ زار زار رو رہی تھی۔

"گوگل پر سرچ کرنے کی غلطی میں نے بہت پہلے کرلی تھی اور تب سے میری سمجھ میں نہیں آتا اس کی زندگی کی دعا مانگوں یا اس کی موت کی...... وہ سب پڑھ کر میرا دل کرتا تھا جنگلوں میں نکل جاؤں، کسی طرح ہوش و خرد سے بے گانہ ہوجاؤں، مجھے یہ سب بھول جائے، میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفلوج ہو جائے،...... جب یہ خیالات ایک بار شروع ہوتے ہیں تو پھر میرے قابو میں نہیں رہتے، جب یہ تواتر سے ذہن میں اترتے ہیں تو...... سانس بھی نہیں لی جاتی، دم گھٹتا ہے، پھر بھی موت نہیں آتی، یہ ایسی سزا ہے کہ تکلیف موت کے دہانے تک لے جاتی ہے پھر کھینچ کر واپس لاتی ہے اور پھر وہی سب نئے سرے سے شروع ہوتا ہے، یہ اذیت میں اکیلی نہیں جھیل رہی میرے ابو...... ابو کو بھی تو گوگل نے وہی جواب دیے ہوں گے اور میرے ابو......"

آنسوؤں کے سیلاب نے اس کی آواز سلب کرلی۔

"صائبہ! ہوسکتا ہے وہ بھٹک کر کسی نیک آدمی سے ٹکرایا ہو، کسی بے اولاد جوڑے نے اسے اپنا بنالیا ہو، وہ پڑھ لکھ کر ایک کام یاب اور خوش حال زندگی گزار رہا ہو، کسی نامناسب جگہ سے اسے بچالیا گیا ہو یا وہ خود وہاں سے بھاگنے میں کام یاب ہوگیا ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے دنیا میں اس کی عمر پوری ہوگئی ہو، وہ دنیا کے جھمیلوں سے آزاد اپنے دائمی سفر پر روانہ ہوگیا ہو۔ اگر ایسا نہیں ہوا ہے تو بھی یہ دنیا ہے، وقت کے ساتھ یہاں سب سروائیو کرنا سیکھ جاتے ہیں، حالات نے اسے بھی مضبوط بنا دیا ہوگا، اچھا برا اس کے ساتھ جو بھی ہوا ہو، وہ اس کے ساتھ جینا سیکھ گیا ہوگا۔ اس کی اپنی دنیا ہوگی، عام لوگوں کی دنیا جیسی جس میں دکھ سکھ، آنسو ہنسی سب ہوتا ہے، شاید اسے پچھلا کچھ یاد بھی نہ ہو، وہ آپ سب کو بھول گیا ہو، جہاں بھی ہے خوش اور مطمئن ہے۔ سوچنا ہی ہے تو سب کچھ اچھا کیوں نہ سوچیں تصور ہی کرنا ہے تو خوش کن تصور کیوں نہ کریں؟"

"اس سے حقیقت تو نہیں بدلے گی۔"

"کیا ہے حقیقت؟ آپ جانتی ہیں؟ نہیں نا، کوئی نہیں جانتا سوائے ثوبان اور مالک مطلق کے۔ باقی ہم فرض اور گمان ہی کر سکتے ہیں، یہی ہمارے اختیار میں ہے تو سارے گمان اور خیال دل خوش کرنے والے اور سکون دینے والے کیوں نہ رکھیں؟"

وہ اس نئی بات پر چپ رہی۔ پہلی بار کوئی ایسا انوکھا کچھ کہہ رہا تھا۔

"برا اور دکھ دینے والا ہی کیوں سوچیں؟ وہموں اور وسوسوں کو اچھے خیالات سے بدلنے کی کوشش تو کر ہی سکتے ہیں۔ زندگی بھی تو ہماری ذمہ داری ہے، درد اور اداسی خود سے دور کرنے والی مشقت ہمیں ہی کرنا ہوتی ہے، اس کے آگے ہتھیار نہیں ڈالتے، جنگ کرتے ہیں، انھیں شکست دیتے ہیں۔ زندگی اس لیے تو نہیں ملی ہے کہ ایک حادثے کی نذر کرتے ہوئے باقی تقاضوں سے منہ موڑ لیں اور خوش رہنے کی کوشش بھی نہ کریں۔"

"صرف حادثہ نہیں تھا وہ، میری وجہ سے......"

"نہیں۔" اس نے دھیمے مگر مگر حتمی لہجے میں کہا۔ "اس حادثے کی وجہ کوئی نہیں ہے، یہ کسی کی غلطی، کسی کا قصور، کسی کا گناہ نہیں ہے، آپ نے کچھ غلط نہیں کیا سب سے پہلے یہ قبول کریں، خود کو اس کی

pklibrary.com

وجہ سمجھنا ترک کریں۔"
اس کی آواز میں ایسی سچی التجا تھی کہ وہ پھر رونے لگی۔ آج کسی نے واقعی اس کے خار خار وجود کو سمیٹنے کے لیے ریشم بچھایا تھا۔ اس کے الفاظ ہی نہیں، فکر سے چور آواز اور دل تک پہنچتا تریاق سا لہجہ کسی مہربان ابر سا اس پر برس رہا تھا۔
تب ہی بیگ میں رکھا اس کا فون بجنے لگا۔ وہ فون ریسیو کرنے کے قابل نہیں تھی اور اسیر کو اندازہ تھا اسے عبدالخالق کے علاوہ کوئی اور فون نہیں کرے گا۔ اس نے آہستہ سے اس کی گود سے بیگ کھینچا، وہ بنا زپ والا بیگ تھا۔ اندر فون کی اسکرین — روشن تھی۔ اس نے فون باہر نکالا۔
اسکرین پر 'ابو کالنگ' جگمگا رہا تھا۔ وہ فون لے کر کار سے باہر نکلا اور دروازہ بند کر دیا۔
"السلام علیکم انکل۔"
"وعلیکم السلام۔" وہ حسب توقع حیران ہوئے۔ "آپ کے پاس صائبہ کا فون؟"
وہ مجھے راستے میں ملیں، شاپ پر کچھ بھول گئی تھیں، وہ لینے گئی ہیں۔"
"اچھا اچھا...... مجھے باہر جانا ہے، اس لیے اسے کال کی تھی کہ ذرا جلدی آجائے۔"
"بس کچھ منٹ میں پہنچ رہے ہیں۔"
فون بند کر کے وہ پھر اندر آیا۔
"انکل کو کہیں جانا ہے۔ میں نے کہا آپ راستے میں مل گئی تھیں۔" اس نے فون اس کی طرف بڑھا کر کہا۔ اس نے فون لے کر واپس بیگ میں ڈال لیا۔ دوپٹے سے چہرہ خشک کیا اور اس کی سمت دیکھے بغیر کہا۔
"گھر چلیں۔"
اسے جو کہنا تھا وہ ابھی باقی تھا مگر عبدالخالق کے فون کے بعد مناسب نہیں تھا کہ وہ مزید وہاں رکتے۔ اسیر نے کار اسٹارٹ کی اور ناہموار راستے پر آگے بڑھا دی۔ بیچ میں ایک دکان پر رک کر صائبہ نے کچھ چیزیں خریدیں۔ کار رکتے ہی وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئی تھی۔ عبدالخالق کے کسی دوست کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا، وہ اسے دیکھنے اسپتال جا رہے تھے۔ وہ سامان باورچی خانے میں رکھنے آئی تب تک وہ صحن سے ہی اسے کہتے باہر نکل گئے۔ اس نے شکر کا سانس لیا ورنہ اس کا رویا چہرہ دیکھ کر وہ اس سے پوچھتے تو کچھ نہیں تھے مگر چپ ہو جاتے تھے۔ اسیر اندر نہیں آیا تھا۔ باہر عبدالخالق سے بات کرنے پر پتا چلا ان کے دوست اسی کے اسپتال میں ایڈمٹ تھے۔ اسے بھی واپس جانا تھا سو وہ دونوں ایک ساتھ اسپتال روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

لائبہ کا فون آیا تھا۔ زینت نے شاید اس سے بھی بات کی تھی کیوں کہ وہ اسے شادی کے لیے رضامند کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔
"میں نے بھائی سے بات کی ہے، وہ امی ابو کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ وہاں نفسیاتی مریضوں کا بہت اچھے سے خیال رکھا جاتا ہے۔ امی کی دیکھ بھال ایسے اسپتال یا سینٹر میں یہاں سے زیادہ بہتر ہو گی۔ ابو اگر وہاں نہ جانا چاہیں تو وہ میرے پاس آجائیں گے۔ تم ان کے لیے اپنی زندگی کو آگے بڑھنے سے کیوں روک رہی ہو؟ ابو کو بھی یہ اچھا کہاں لگتا ہو گا کہ تم ان کی وجہ سے انکار کر رہی ہو۔ وہ زور زبردستی نہیں کرنا چاہتے تو تم بھی تو سمجھو۔ پائیس سال کم نہیں ہوتے اس فیز سے باہر نکلو۔ زندگی میں رنگ بھرو، اسے انجوائے کرو، ایسا کرو کچھ دن کے لیے میرے پاس آجاؤ۔ تمہارا اس گھر سے نکلنا ضروری ہے، تم نے خود کو اس گھر میں قید کر رکھا ہے جہاں صرف اداسی اور مایوسی کا بسیرا ہے اور وہاں رہ کر تمہاری سوچ بھی ایسی ہی ہو گئی ہے۔ تم امی ابو کی وجہ سے شادی سے انکار نہ کرو، امی ابو کا کوئی نہ کوئی انتظام ہو جائے گا۔"
تب سے وہ ہال کے فرش پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اسے لائبہ کی باتوں پر کبھی غصہ آرہا تھا، کبھی وہ درست لگ رہی تھی تو کبھی انتہائی خود غرض

pklibrary.com

جسے والدین کی قطعی فکر نہ تھی۔ پہلے اسے اس قسم کی باتوں پر بس دکھ ہوتا تھا، وہ روتی رہتی تھی۔ دفعہ تھا کہ اسے غصہ بھی آرہا تھا اور وہ ٹھیک بھی لگ رہی تھی۔ صحن کا دروازہ کھول کر اندر آئے اسیر کو کھڑکی سے وہ دکھائی دے گئی تھی۔ کل سے اب تک ان کے مابین کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ کچھ سوچتے ہوئے وہ کمرے میں جانے کے بجائے ہال میں چلا آیا۔ اسے دیکھتے ہی صائبہ نے سامنے پھیلے پیر سمیٹے۔ وہ اٹھتی اس سے پہلے اسیر نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔

"بیٹھی رہیں۔" جوتے اتار کر وہ بھی اس سے فاصلے پر دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھ گیا۔ وہ بھی اس کی طرح دوزانو بیٹھا تھا۔ بیگ اس نے بازو میں رکھ دیا تھا۔

"آج آپ سوئیں نہیں؟" اس نے گردن موڑ کر اسے دیکھا اور صائبہ کا منہ کھلا رہ گیا۔"

"اس کھڑکی سے یہ دیوار نظر آتی ہے۔" وہ اندر آنے والی بات گول کر گیا۔ وہ کیا جواب دے سکتی تھی سو سر جھکا لیا۔

کل ہماری بات مکمل نہیں ہوئی تھی......"

"آپ کیوں ہم سب میں اتنی دلچسپی لیتے ہیں

اس کا جملہ کاٹ کر پوچھے گئے اس سوال کے لیے وہ تیار نہیں تھا۔

"میں کیا کوئی بھی انسان......"

"سچ کہیں۔" اس نے پھر قطع کلامی کی۔ اس کے پاس بیس سالہ تجربہ تھا اور یہ واحد شخص تھا جس نے علامتوں کی ملامت اور مرمت کے بجائے نبض پر ہاتھ رکھا تھا۔ وہ دونوں کچھ پل گردن موڑے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر اسیر نے سر سیدھا کرتے ہوئے نظر کا زاویہ بدلا۔

"میں بھی ان لوگوں میں سے ہوں جو پیچھے رہ جاتے ہیں مگر میری کہانی آپ سے بہت مختلف ہے۔ اس دن بھائی بارہ گھنٹے کی ڈیوٹی کر کے آئے تھے مگر پاپا کے پیر درد کی وجہ سے انھیں ڈرائیونگ سے روکنے کے لیے وہ خود ڈرائیو کر کے انھیں ایک ریلیٹیو کی شادی میں لے گئے۔ واپسی میں دیر ہوگئی اور پاپا کے اصرار کے باوجود انہوں نے پھر انھیں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے نہیں دیا۔ راستے میں شاید کچھ سیکنڈ کے لیے انھیں نیند کا جھونکا آیا اور جب موت تاک میں ہو تو پلک جھپکنے اتنا وقت بھی بہت زیادہ ہوتا ہے۔ ڈیوائڈر سے ٹکرا کر بے قابو ہوئی کار نے مما، پاپا کے اس سفر کو آخری سفر بنا دیا۔ ہفتہ بھر زندگی اور موت کی جنگ جیت کر بھائی کو جب ہوش آیا تو......" اس نے ایک گہری سانس آزاد کی۔

"دنیا بدل گئی تھی، ہماری ہفتہ بھر پہلے ہی اور ان کی ہفتہ بھر بعد۔ پہلے وہ بے یقین سے تھے پھر اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑا، وہ ٹوٹ گئے، بکھر گئے، پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ ہماری پانچ افراد کی فیملی ایک دوسرے سے بہت قریب تھی۔ مصروفیت کے باجود مما پاپا ہم تینوں کے ساتھ وقت گزارنے اور ہنسنے مسکرانے کی اہمیت سمجھتے تھے اور اچانک وہ ہم سب سے دور ہو گئے تھے۔" اسے محسوس ہوا غیر مرئی نقطے پر نظر جمائے اسیر اسی وقت میں کھڑا ہے۔

"آپی اور میں بھائی سے چھوٹے تھے، ہم تینوں کے لیے یہ حادثہ اور نقصان سنبھالنا مشکل تھا مگر وہ بڑے تھے، سب ان سے کہتے تم بڑے ہو، بھائی بہن اب تمہاری ذمہ داری ہے، اب والدین کی جگہ تمھیں سنبھالنی ہے اور جانے کیا کیا۔ سو وہ ہمارے سامنے نارمل بی ہیو کرتے رہے، ہمیں سمجھاتے، حوصلہ دیتے، ہمارے لیے پیرنٹس کا رول ادا کرتے، ہمیں کبھی محسوس نہیں ہوا کہ وہ ہم سے الگ ایک مختلف اذیت سے گزر رہے ہیں۔ ہمارے لیے وہ بہت سمجھ دار انسان، قابل بھائی اور ایکسیلنٹ ڈاکٹر تھے۔ آپی کی شادی طے تھی، سو وقت پر ان کی شادی کر دی اور میں اپنے فائنل اور پی جی کی تیاری میں بے انتہا مصروف ہوتا گیا۔ ہم سب میڈیکل فیلڈ سے ہیں، مما پاپا بھی ڈاکٹر تھے۔ بھائی کو ہر طرح کی پروفیشنل ہیلپ کا علم تھا، ایسی ہیلپ ان کی دسترس میں بھی تھی مگر وہی سوسائٹی کا دباؤ اور توقعات......

pklibrary.com

انھیں ایک غم گسار کی ضرورت تھی جس کے آگے وہ کچھ بھی چھپائے بنا دل کھول کر رکھ سکتے، اندر کی گھٹن باہر انڈیل سکتے، جو انھیں نہیں ملا۔

پریشان کرنے والی سوچوں اور اپنے بچ جانے کے گلٹ سے بچنے کے لیے وہ پرسکرپشن میڈیسن کے عادی ہوتے گئے۔ ذہن بیدار ہو تب ہی خیالات تنگ کرتے ہیں سو انہوں نے اس کا راستہ یہ نکالا تھا کہ خالی وقت میں ذہن کو سلائے رکھتے۔ ایک رات ان ہی میڈیسنز کے رانگ کامبینیشن نے انھیں ابدی نیند سلا دیا۔ یہ سب ہمیں ان کے جانے کے بعد پتا چلا۔ ان کے اصل حالات کسی حد تک ہماری کزن اور ان کی فیانسی سبرینہ جانتی تھیں مگر وہ بھی اپنی انٹرن شپ میں بے انتہا بزی رہتی تھیں پھر بھائی نے ہمیں کچھ بھی نہ بتانے کا وعدہ لے رکھا تھا۔"

اس کے صبیح چہرے پر صائبہ نے پہلی بار تکلیف کے آثار دیکھے۔

"وقت گزر جانے کے بعد احساس ہوا کہ ہم نے اور بھائی نے بھی خود کو زیادہ ہی مضبوط سمجھ لیا تھا۔ کسی نے انھیں الزام نہیں دیا تھا نہ کبھی قصوروار گردانا تھا، انہوں نے بھی ابتدائی دنوں کے علاوہ اس قسم کی بات کبھی نہیں کی تھی لیکن اتنے بڑے حادثے میں بچ جانے اور اسی حادثے میں سب سے قریبی دو پیاروں کو کھودینے کا بوجھ ان پر بھی تھا اور وہ یہ تنہا سہہ رہے تھے۔ ذہنی اور نفسیاتی مسائل میں پچھلے سالوں میں اتنی ہی ترقی ہوئی ہے کہ ہم ڈپریشن اور اینگزائٹی جیسی ٹرمز سننے اور سمجھنے لگے ہیں اور ہم نے انھیں ہی کل نفسیاتی مسائل سمجھ لیا ہے۔ اس کے آگے پیچھے ہم کچھ اور دیکھتے ہیں نہ سوچتے ہیں۔ 'سروائورز گلٹ' بھی ایسی ہی نفسیاتی ہوئی ہے جس میں بچ جانے والا خود کو مجرم سمجھنے لگتا ہے۔ ایک پڑھا لکھا، ہنسنے مسکرانے والا، قابل ڈاکٹر بھی وہی سب سوچ سکتا ہے جو ایک عام انسان، اسے بھی وہی سب کاش اور اگر مگر تنگ کرتے ہیں جو کسی عام انسان کو، ہم یہ نہیں سمجھ سکے۔

پتا نہیں ہم کیوں نہیں سمجھتے کہ انسان عمر، عہدے، ذہانت اور سمجھ داری سے قطع نظر اس قدر کمزور اور مایوس بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے لیے تنہا خود کو سنبھالنا ممکن نہیں رہتا۔

ہم ایسے افراد کو پریشان کرنے والے تاریک پہلو اور خیالات کے اظہار کا حق اور موقع تک نہیں دیتے۔ ہماری ان سے مضبوط شخصیت اور میچورٹی کی توقعات انھیں بہت اکیلا کر دیتی ہیں۔ کاش وہ ہم سے کہتے، سب اکیلے نہ سہتے، کاش ہم نے توجہ دی ہوتی، انھیں بہادر نہ سمجھا ہوتا!" وہ خلا میں دیکھتے ہوئے کہیں کھویا سا لگ رہا تھا۔

"پھر میں نے اور آپی نے طے کیا، ہم ایک دوسرے کو تنہا نہیں کریں گے، سب دکھ بانٹیں گے، سب بتائیں گے۔ مضبوط اور میچور ہونے کا ڈرامہ کم سے کم ایک دوسرے کے ساتھ نہیں کریں گے۔ ٹریجڈیز سے مزید ٹریجڈیز پیدا نہ ہوں، ہم نے یہ ہی سیکھا۔"

"وہ اپنے بھائی کو نہیں بچا سکے اس لیے تمھیں بچانا چاہتے ہیں۔" اس کے اندر سرگوشی ابھر کر ڈوبی۔

"کیا آپ بھی بھائی کے لیے خود کو بلیم نہیں کرتے؟"

"نہیں۔ کسی کو قتل کرنے یا خودکشی کے دہانے تک لے جانے والا ہی اس موت کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اگر انہوں نے یہ قصداً کیا ہوتا یعنی سوسائیڈ کی کوشش تو پتا نہیں تب میرے خیالات کیا ہوتے۔ انہوں نے غنودگی یا نیم بے ہوشی کی حالت میں اینٹاسڈ سمجھ کر ایک ایسی میڈیسن لے لی تھی جو دیگر پین کلرز اور ٹرنکولائزرز کے ساتھ مل کر مہلک ثابت ہوئی۔ انھیں ایسیڈیٹی کا پرانا مسئلہ تھا۔ یہ حادثہ تھا، ایک ایکسیڈنٹ۔ آپی نے اور میں نے اکیلے سہنے کے بجائے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر اس فیز کو پار کیا۔ اچھا، برا، بہت برا، بدترین، شرمندہ کرنے والا، رُلانے والا، دل دکھانے والا، ہر خیال ہم نے بلا جھجک

ایک دوسرے کو سنایا، ہر احساس شیئر کیا۔ اگر ہم سارے داغ اور زخم دوسرے کے سامنے مکمل عیاں کرنے والا مشکل کام کرلیں تو خود کو بچا سکتے ہیں۔"

وہ خاموش ہو گیا مگر اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ صائبہ نے نظر چرالی۔ یہی تو اس کے گھر کے لوگ نہیں کر سکے تھے۔ ایک سا درد تھا مگر بانٹنے اور سہارا دینے کے بجائے سب اکیلے اس سے لڑ رہے تھے۔ سر جھکا کر اس نے گود میں دھرا بایاں ہاتھ پلٹا۔ اس کی زندگی کا گرہن ہتھیلی کی پشت پر بیٹھا تھا۔

"میں نے آپ کی خواہش پر سب سچ کہہ دیا۔" اس کی ہتھیلی پر ایک نظر ڈال کر وہ پھر اسے دیکھتے ہوئے گویا ہوا تھا۔" اب آپ بھی سچ کہیں، کیوں یہ ظلم کرتی ہیں؟"

"پتا نہیں۔ اس میں میرے چاہنے نہ چاہنے کا کوئی دخل نہیں ہوتا ہے، میری انگلیاں میری نہیں سنتیں۔"

"آپ کے یقین نے انہیں اتنا خود مختار کر دیا ہے؟" اس کے انوکھے سوال پر وہ اسے الجھ کر دیکھنے لگی۔"

"آپ قصور وار اور گناہ گار نہیں، یہ یقین کرلیں تو انگلیاں پھر ایسا ظلم نہیں کریں گی۔" اس نے آسان لفظوں میں وہی بات دہرائی۔ وہ پھر سر جھکا کر ہاتھ کو تکنے لگی۔

"بیس سال سے آپ اپنے ساتھ زیادتی کر رہی ہیں اور دنیا کی رنگینیاں بڑی حسرت سے آپ کو تک رہی ہیں۔ آگے ایک خوبصورت راہ گزر آپ کی منتظر ہے صائبہ، آپ نے یہ ہاتھ کسی کے ہاتھ میں دے کر ایک خوب صورت سفر طے کرنا ہے۔" لفظوں سے چھلکتی کسی تمنا کی آنچ تھی یا اس کی آنکھوں میں امڈا نیا احساس، صائبہ کی دھڑکنوں کی لے بدل گئی۔ اندر کی ماتمی سی مجلس میں آگے اونگھتے احساسات اس نئی طرز کے ظہور پر ہڑبڑا گئے۔

"کسی کی امانت جان کر اس کی حفاظت کریں۔" اسیر نے اس کے چہرے کے بدلے رنگ محسوس کیے۔ کچھ گلال سا اس کے اندر کب سے اڑ رہا تھا جو آج اُدھر تک پھیل گیا تھا۔ کچھ جذبے دبے پاؤں دل میں داخل ہوتے ہیں اور آپ کو خبر اس وقت ہوتی ہے جب وہ مالک بن بیٹھتے ہیں۔

"آپ کافی لیں گے؟" وہ ایک دم کھڑی ہو گئی۔ "میں بناتی ہوں۔" اسیر بھی مسکراتے ہوئے بیگ اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ کافی بنا رہی تھی اسی دوران عبدالخالق بھی آگئے۔ اس نے شکر ادا کیا۔ فی الحال اسے تنہا اس کا سامنا نہیں کرنا تھا۔

☆☆☆

موسم نے کروٹ لی تھی۔ گرمی کہیں چھپ کر اونگھنے لگی تھی اور سرد ہوائیں انگڑائی لے کر بیدار ہوئی تھیں۔ ارباب کی چھوٹی بیٹی کی سالگرہ تھی۔ وہ ایسی خاندانی تقاریب میں جانے سے کتراتی تھی۔ جہاں اسے دیکھتے ہی سب کو ہمدردی، تسلی، فکرمندی اور شادی کی خبر سننے کا بخار چڑھ جاتا تھا مگر آج ہاجرہ جانے پر بضد تھیں۔ صبح ان کے سامنے ہی شفیقہ بھابھی کا فون آیا تھا۔ چار و ناچار اسے بھی تیار ہونا پڑا۔ ان دنوں ان کا مزاج بھی اچھا تھا۔ اس رضامندی کی وجہ اس وقت سمجھ آئی جب ابو کے ساتھ صحن میں اسیر بھی تیار کھڑا نظر آیا۔

"سالگرہ بھی سنڈے کو ہی آنا تھی!" اس نے سوچا۔

وہ اس کی کار سے ہی تایا کے گھر پہنچے تھے۔ وہ بچوں اور کزنز کے درمیان بیٹھنے کے بجائے شفیقہ کا ہاتھ بٹانے باورچی خانے میں آگئی اور پھر ذرا دیر میں اسے بھی بیٹی کی سالگرہ انجوائے کرنے باہر بھیج دیا کہ ادھر کی فکر نہ کریں میں ہوں یہاں۔

کیک کٹا سب نے کھایا پھر کھانا ہوا اور سب خوش گپیوں میں مصروف ہو گئے۔ آس پڑوس کے بچے بھی گھروں کو لوٹ گئے تھے۔ ہاجرہ کی دوائی کا وقت کب کا گزر چکا تھا۔ وہ دینے لگی تھی مگر عبدالخالق نے منع کر دیا۔ وہ بڑے دنوں بعد ہوش و حواس میں سب کے ساتھ شامل تھیں۔ تایا تائی ارباب اور بچوں

pklibrary.com

کے علاوہ باقی سب شفیقہ کے میکے والے تھے۔ سب کو چائے دینے کے بعد وہ اپنا کپ لے کر چھت پر آگئی۔ اوپر آتے ہی اسے خنکی کا احساس ہوا۔
نکلتے وقت وہ ہاتھ میں لی شال گاڑی میں ہی بھول گئی تھی۔
اس نے ذرا سا سر اونچا کر کے سرمئی رنگ دھارے آسمان کو دیکھا چاند روشن تھا۔ اس نے چائے کا گھونٹ لے کر کپ دیوار پر رکھا۔
"اف۔" اس نے پھر دوپٹا لپیٹا جو اس ٹھنڈ میں ناکافی تھا۔ اس کا دل نیچے جانے بھی تیار نہیں تھا۔ تب ہی عقب میں آہٹ ابھری۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اسیر آخری زینے پر تھا۔ قریب آ کر اس نے شال اس کی سمت بڑھائی۔
"آپ یہ کار میں ہی بھول گئی تھیں۔"
"تھینک یو۔" اس نے شال لیتے ہوئے کہا۔ اسے اس وقت اس کی اشد ضرورت تھی۔
سرد ہواؤں کے لمس نے اس کا چہرہ گلابی کر دیا تھا، کاجل سے سجی سیاہ آنکھوں میں قدرت کی سنگت سے پھوٹی نئی روشنی تھی، بے خوف اور سرکش خواہشوں کی طرح اس کے چہرے اور گردن کو چھو کر دور ہوتی پھر پاس آتی آوارہ لٹیں اور...... وہ خود کو روک نہیں سکا۔
"آپ واقعی اتنی خوبصورت ہیں یا مجھے لگنے لگی ہیں؟" اس وارفتگی بھری سرگوشی پر اندر وہ ہلچل مچی کہ شال اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ چاروں طرف یخ ہواؤں کے باوجود پہلو میں بڑی خفیف اور لطیف سی تپش جاگی تھی۔
"اتنا نہ سوچیں......" وہ مسکرایا۔ "اس حقیقت کے بعد جواب اتنا ضروری نہیں کہ آپ جیسی بھی ہیں مجھے اچھی لگتی ہیں۔" وہ جیب میں ہاتھ ڈالے سامنے دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا تھا۔
اس کی پلکیں اور لب اس افتاد کا بار سنبھال نہیں پائے تھے۔
"گھبرائیں نہیں، میں نہیں پوچھوں گا، میں کیسا لگتا ہوں...... کم از کم اس وقت نہیں۔"
"آ...... آ...... آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟" وہ منمنائی۔
"سچی باتیں!" اس کی نگاہیں مرکز پر جمی تھیں۔ "جو محسوس ہو، وہ کہہ دینا چاہیے۔" وہ ایسی نامہ بر نگاہوں کی عادی نہیں تھی۔ خود بخود اس کا سر جھک گیا تھا۔
"آپ کی وجہ سے میری زندگی میں تبدیلیاں آ رہی ہیں، یہ جاننا آپ کا حق ہے اور بتانا میرا فرض۔" اس کا چہرہ ہی نہیں لہجہ بھی متبسم تھا۔ "آپ بس سن لیا کریں۔"
اس نے اچھی طرح خود کو شال میں چھپایا اور دیوار سے کپ اٹھایا۔
"چلیں، آپ کو صبح ہاسپٹل بھی جانا ہے۔" اس نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے خود کو پُراعتماد ثابت کرنے کی کوشش کی۔
"آپ سنیں گی ناں؟" اس کا انداز بتا رہا تھا وہ جواب سن کر ہی ہلے گا۔
اس کا دل کیا پوچھے، آپ مجھے کیوں سنانا چاہتے ہیں؟ کچھ دیر کی شش و پنج کے بعد اس نے پوچھ بھی لیا۔
"میرے خیال، خواب اور خواہشیں سب کسی کے تصرف میں ہیں اور یہ خبر دنیا سے پہلے آپ کو ہونا چاہیے کیوں کہ وہ 'کسی' آپ ہیں۔"
وہ مقابل کو خاص، بہت خاص محسوس کرانے کے ہنر میں تاک تھا۔ اچانک اسے نہ جانے کب کہاں سنا یا پڑھا 'ہیپی ہارمون ڈوپامائن' یاد آ گیا۔ اس سے جڑی ساری معلومات جان لینے کے بعد بھی وہ سمجھ نہیں پائی تھی کہ خوشی کا احساس کیسا ہوتا ہے اور اس وقت اس نے سوچا۔
"ڈوپامائن ریلیز ہونے پر ایسا ہی لگتا ہو گا جیسا مجھے اس وقت محسوس ہو رہا ہے۔" یہ اس کے لیے کوئی نیا احساس تھا۔ دنیا کے کروڑوں لوگ جو روز محسوس کرتے تھے وہ پہلی بار محسوس کر رہی تھی۔

"میں نے کب کان بند کیے!" اس نے دھیرے سے کہا اور پھر اپنے ہی جملے پر حیران سی کر شال سنبھالتی زینے کی طرف بڑھ گئی۔
"یہ شاید ڈوپامائن کا ہی اثر ہے۔" اپنے جملے کے لیے اس نے اسے ہی دوشی ٹھہرایا۔ کسی کے لیے خاص ہونے کا خاص احساس بڑا اچھا لگ رہا تھا۔
اسیر بھی مسکراتے ہوئے اس کے پیچھے چل پڑا۔
گھر پہنچ کر بستر پر جانے سے پہلے وہ آئینے کے سامنے ٹھہر گئی۔
"آپ واقعی اتنی خوبصورت ہیں یا مجھے لگنے لگی ہیں؟" دل کو گدگدانے والا انوکھا اچھوتا احساس تھا۔ اس پر سولہواں برس بھی ویسا ہی گزرا تھا جیسا چھٹا اور چھبیسواں سال تھا۔ اداس، پُرآزار، تنہا، اذیت بھرا، آنسوؤں میں ڈوبا۔
اسکول کالج بھی بوجھ کی طرح اس نے مکمل کیے تھے۔ اس کے لیے سب کچھ ہی بوجھ تھا، سانس لینا، زندہ رہنا، روز ہاتھ پیر ہلانا اور وہ یہ بوجھ پوری دیانت داری اور ذمہ داری سے اٹھاتی تھی کہ اس قید بامشقت میں کوتاہی اور سستی اس کے لیے گناہ تھی۔
اس کے اندر اس قید سے آزاد ہونے کی خواہش کبھی نہیں جاگتی تھی۔ مگر اب کوئی اسے دوسری نہج پر لے جانے میں کامیاب ہوا تھا۔ اس کی محبوس دنیا کی دیوار میں کسی کی موجودگی اور اس کے الفاظ ایک دریچہ تراش گئے تھے۔ اس نے جانا تھا کہ اس زنداں کے باہر بھی ایک دنیا ہے اور وہ دلکش ہے۔ اندر کی محفل میں وہ پہلی بار پچھلی قطار سے آشنا ہوئی تھی۔ وہاں ستائش کی خوشی سے لے کر چاہے جانے کی آرزو اور ایک سامع اور ساتھی کی چاہت نے اپنی موجودگی کا احساس کرایا تھا۔
اب تک پہلی قطار میں نمایاں اداسی، اذیت، پچھتاوے، کاش اور قصور کے درمیان محبت، خواب اور خواہش نے خود کو آشکار اکیا تھا۔ پہلی بار ملے التفات، کسی کی آنکھوں میں اپنا عکس، کسی کی سحرانگیز باتیں اور ایک مہرباں قربت، اس کی دنیا بدل رہی تھی، کچھ اچھا ہو رہا تھا اور اس پر پہلی بار اسے ندامت نہیں تھی۔
"میں نہیں پوچھوں گا میں کیسا لگتا ہوں......"
اسے تصور کرنے کے لیے اس نے آنکھیں بند کیں اور پہلی تصویر وہی تھی جب اس نے پہلی بار اسے ہاجرہ کے بازو میں بینچ پر دیکھا تھا۔ یادداشت میں رقم اس تصور پر اسے حیرانی ہوئی اور پھر کچھ دیر بند رہی آنکھوں نے واضح کیا کہ پہلا نقش ہی نہیں اس کے اندر اس اجنبی مسیحا کے سارے نقوش پوری جزئیات کے ساتھ محفوظ تھے۔
آج وہ بستر پر لیٹی تو کمرے کی دیواروں سے وحشت اور افسردگی کے بجائے کچھ رنگ برنگے سانس لیتے خواب جھانک رہے تھے۔ ناقابلِ تسخیر لگنے والی فصیلِ الم پر کسی نے محبت کی کمند ڈال دی تھی۔

☆☆☆

اس کے چند جملوں کا اثر تھا کہ اب وہ اس کی سمت دیکھنے سے کترانے لگی تھی پھر بھی طواف کرتی نظریں اور ان کی سرگوشیوں سے انجان نہیں تھی۔ جانے اس طرف یہ تغیر کب سے رونما ہوا تھا مگر صائبہ کو اس کی خبر اب ہوئی تھی۔
آپی نے اس کی کھنکتی آواز سے جانا یا شاید اس کے مزاج اور گفتگو میں شگفتگی اور ظرافت کی آمیزش انہیں باخبر کر گئی اور انہوں نے اس کی وجہ دریافت کی۔ اسیر نے انہیں بتا دیا۔ اب انہیں اس لڑکی سے ملنے کی جلدی تھی جس نے اسیر کو اسیر کیا تھا۔ وہ وہاں آنا چاہ رہی تھیں مگر اس سے پہلے اسے عبدالخالق سے بات کرنا ضروری لگا۔
اس کا مدعا سن کر کتنی دیر انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ اسیر کو بات کرنے سے پہلے یا بات کرتے وقت ڈر نہیں لگا مگر اب ان کی چپ اسے ہولا رہی تھی۔
"میری بچی عام لڑکیوں سی نہیں، اس نے اب تک بہت مشکل زندگی گزاری ہے۔ ہر باپ کی طرح میں بھی اسے خوش دیکھنا چاہتا ہوں، اس کے

pklibrary.com

فرض سے سبکدوش ہونا چاہتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ میری بیٹی مختلف ہے۔ آپ کے فیصلے کے پیچھے صرف پسند ہے تو یہ اس کے حق میں شاید بہتر نہ ہو۔ ہاں، ہمارے حالات، گھر کا ماحول، اس کی ذہنی کیفیت، اس کی خاموشی اور درد کو سمجھنے کے بعد آپ نے یہ طے کیا ہے تو میں اس فیصلے سے خوش ہوں لیکن آخری فیصلہ اب بھی صائبہ کا ہوگا۔ خوش گوار اور مطمئن زندگی کے لیے صائبہ کا دل سے راضی ہونا ضروری تھا۔"

عبدالخالق کو یہ رشتہ بیٹی کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں لگا تھا اور صائبہ سے بات کرتے ہوئے انہوں نے ــــ اسے سوچنے کا وقت دیا۔ اس کے چپ چاپ سن لینے اور فوراً انکار نہ کرنے پر انہیں اس کی طرف سے مثبت جواب کی امید بندھ گئی تھی۔

☆☆☆

آج اتوار تھا پھر بھی وہ صبح صبح اسپتال گیا تھا۔ پچھلے دن ہوئی کریٹیکل سرجری کے مریض کو دیکھنا ضروری تھا۔ کھانے کے بعد ہاجرہ اور عبدالخالق کمرے میں چلے گئے تھے۔ وہ کھانے کی میز پر اخبار پھیلائے اپنے خیالوں میں اس قدر گم تھی کہ اسیر کی واپسی کا بھی پتا نہیں چلا۔ اسیر اور عبدالخالق کی باتیں اور آگے کا منصوبہ پہلی بار دل نے سنتے ہی رد نہیں کیا تھا بلکہ وہ ہاجرہ اور عبدالخالق کہاں، کیسے، کس کے ساتھ رہیں گے، کیا وہ یہ شہر اور گھر چھوڑ کر اس کے ساتھ رہنے پر تیار ہوں گے، سوچ رہی تھی۔ اتنا تو اسے اندازہ تھا، اسیر یہاں کے اسپتال میں عارضی طور پر ہے اور اس چھوٹے سے شہر کو وہ اپنا مستقل ٹھکانا نہیں بنائے گا۔

"کیا سوچ رہی ہیں؟" اسیر کی آواز پر وہ بری طرح چونکی۔ وہ جانے کب سے صوفے پر بیٹھا تھا۔

"

"کچھ نہیں۔" اس نے پھر اخبار پر چہرہ جھکا لیا۔

"میں نے آپ سے اجازت لیے بنا انکل سے بات کر لی، آپ نے مائنڈ تو نہیں کیا؟" وہ واقعی سنجیدہ سوال تھا یا وہ دل لگی کے موڈ میں تھا، صائبہ پرکھنے کے لیے اسے دیکھنے کی جسارت نہ کر سکی۔

"اگر آپ اسی کے متعلق سوچ رہی ہیں تو مجھ سے ڈسکس کر سکتی ہیں۔" اس کے ملائم لہجے پر اس نے گردن گھمائی۔

وہ بہت اچھا طبیب ہی نہیں، ایک ماہر نباض بھی تھا۔ اتنے دنوں بعد بھی ان کی بے تکلفی اور دوستی میں اس کی طرف سے تکریم اور صائبہ کی طرف سے جھجک کا زرتاری پردہ حائل تھا۔ کسی تقرب کے بنا بھی اس کے پاس اور ساتھ ہونے کا احساس اسے حوصلہ دیتا تھا۔ وہ اس کے لیے سراپا مرہم اور درماں تھا۔ جس کا امکان نہ تھا۔ وہ اس نے بڑے سہل انداز میں ممکن کر دکھایا تھا۔ وہ اس کے سامنے ڈھے گئی تھی، ٹوٹ گئی تھی اور پھر سمیٹ لی گئی تھی، سنبھال لی گئی تھی۔ اس نے کہیں کسی کا قول پڑھا تھا، محبت یہ ہے کہ کوئی روح کے زخموں تک رسائی حاصل کرلے اور پھر انہیں چوم لے، اسیر کی محبت ایسی ہی تھی۔

"بلند آواز میں سوچیں تو میں بھی سن لوں۔" اس نے یک ٹک اسے دیکھتی صائبہ کا ارتکاز توڑا۔ اسی وقت ہاجرہ کے کمرے سے کچھ گرنے کی زوردار آواز آئی۔ صائبہ ادھر دوڑی۔ اس کے پیچھے اسیر بھی اٹھا۔ ادھ کھلے دروازے کے باہر اس کے قدم اندر سے آتی ہاجرہ کی آواز نے منجمد کر دیے۔

"اس نے پہلے بھی میرا شوہر چھین لیا تھا، گم کر دیا تھا اور اب پھر مجھ سے میرا بیٹا چھیننا چاہ رہی ہے، کیوں میں نے اسے اپنی کوکھ سے جنم دیا تھا کیوں...... اسے پیدا کرنے کی سزا ہی بھگت رہی ہوں میں، مجھے سکون سے جینے دے گی نہ مرنے دے گی یہ لڑکی، کیوں گھر میں رکھا ہوا ہے آپ نے اسے؟ نکالیں یہاں سے اسے، سن لیں آپ ایسا ہونے نہیں دوں گی میں......"

صائبہ کا ہاتھ میکانیکی انداز میں بائیں ہتھیلی کی پشت کی سمت جانے لگا تھا کہ پیچھے سے اسیر نے کلائی

pklibrary.com

تھام کر روکا۔

"ہاجرہ!" عبدالخالق کی آواز اونچی تھی۔ "تم دونوں کی ماں ہو، ثوبان چلا گیا صائبہ موجود ہے اس کا سوچو، یہ سب......"

"ثوبان کہیں نہیں گیا وہ اس گھر میں موجود ہے اور اب یہ بے شرم، بے غیرت لڑکی ایسے......"

"خدا کے لیے چپ ہو جاؤ ہاجرہ۔"

اسیر اس کا ہاتھ کھینچتا ہوا ہال کے درمیان آیا۔ اس کی ٹانگیں کانپنے لگی تھیں۔ اس نے ہاتھ چھڑا کر کرسی کی پشت کو تھاما پھر اس پر بیٹھ گئی اور اس کی سمت دیکھے بنا کہا۔

"آپ چلے جائیں پلیز۔" اس کی آواز میں سارے زمانے کی درماندگی تھی۔ اسیر کے لیے ہاجرہ کا ردعمل نئی صورت حال تھا۔ اس بات پر ایسا کچھ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا۔ وہ کشمکش میں تھا صائبہ کے پاس ٹھہرے یا اندر جا کر ہاجرہ کو روکے۔ عبدالخالق کی آواز وہاں تک آ رہی تھی۔

"تم نے اس معصوم پر بہت ظلم کیا ہے، ایسے زبان کے نشتر اور لفظوں کے تیر چلائے ہیں کہ میری بچی زخم زخم ہے۔ تمہارے درد اور دماغی حالت کے پیش نظر مجھے چپ رہنا پڑا لیکن اب میں اپنی بیٹی کے ساتھ میں کوئی زیادتی برداشت نہیں کروں گا۔"

"مجھے پہلے ہی شک تھا، آپ کو ثوبان سے محبت تھی ہی نہیں ورنہ دنیا کھنگال ڈالتے، کونہ کونہ چھان مارتے، بیٹے کو ڈھونڈے بغیر سکون نہیں ملتا آپ کو لیکن آپ نے تو بھلا دیا اسے، بیٹھ گئے، تھک گئے، کیسے باپ ہیں آپ؟ ایک میں ہی اب تک اسے دیکھنے کی آس لیے زندہ ہوں، تڑپتی ہوں روز، وہ میرا ہی نہیں آپ کا بھی تو خون تھا......" انسان کا خود کو برتر سمجھنے والا غرور کسی بھی وقت سر اٹھاتا ہے۔

"خدا کے لیے ہوش میں آؤ ہاجرہ!" عبدالخالق کی آواز میں جھنجلاہٹ بھری عاجزی تھی۔

"کسی کو ثوبان سے تم سے کم محبت نہیں تھی، تمہارا ہی نقصان اور درد عظیم نہیں ہے، میں بھی اسی خارزار سے گزر رہا ہوں جس سے تم، بیٹے کو پھر سے دیکھ لینے کی امید ہی روز مجھے بستر سے اٹھاتی ہے مگر میرے پاس تمہاری طرح رعایت نہیں تھی کہ ہاتھ پیر چھوڑ کر بیٹھ جاتا۔ میں کمزور ہونا، ٹوٹنا بکھرنا افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے بیوی اور بچوں کو سنبھالنا تھا، کمانا تھا، گھر چلانا تھا۔ ہماری تین اولادیں اب بھی ہمارے پاس تھیں، ان کی حفاظت کفالت کا ذمہ دار میں تھا، تم نے نہ صرف میرا ساتھ چھوڑ دیا بلکہ بچوں سے ماں بھی چھین لی۔ ایک بیٹا کھو کر میں نے باقیوں کی اہمیت سمجھی، انھیں آرام دینے، محفوظ اور خوش رکھنے کی کوشش پہلے سے زیادہ کی، انھیں ان کی مرضی اور خواہشیں پوری کرنے سے روکا نہ ٹوکا۔ اس سانحے کے اثرات سے بچنے کے لیے وہ جو کرنا چاہتے تھے انھیں کرنے دیا۔ جو چھن گیا تھا اس کا سوگ مناتے ہوئے جو پاس ہیں انھیں فراموش کرنا، نظر انداز کرنا کہاں کی دانش مندی ہے؟ تم نے اپنے سوا کسی کے درد اور نقصان کا احساس نہیں کیا نہ شوہر کے دل میں جھانکا نہ بچوں کے چہرے دیکھے، اتنا ہی کافی نہیں تھا تو تم نے صائبہ کو ساری عمر سولی پر چڑھائے رکھا، اسے الزام دیتی رہی جس کی کوئی غلطی نہیں بلکہ اس واقعے کے بعد اسے تمہاری زیادہ ضرورت تھی، تم نے صرف اس سے منہ ہی نہیں موڑا بلکہ میری معصوم بچی پر زندگی تنگ کر دی، اسے سمیٹنے سنوارنے کی بجائے روز توڑتی رہی، اس کی زندگی......" عبدالخالق اب رو رہے تھے۔ ان سے بات مکمل نہ ہو سکی۔ صائبہ بھی رونے لگی تھی۔

"جو پاس تھا، جو بچا تھا اس کی قدر نہیں کی تم نے، دکھوں کے ساتھ جینا آسان نہیں ہوتا مگر ہمیں کوشش کرنا پڑتی ہے، لڑنا ہوتا ہے، جیسے اب اتنے عرصے بعد صائبہ لڑ رہی ہے، کوشش کر رہی ہے، اس نے ہمت کی ہے تو تم اسے پیچھے نہ کھینچو، خدا کا واسطہ اسے اس قید سے رہائی دو، اسے خوش رہنے دو تاکہ میں سکون سے مر سکوں۔" ہاجرہ ہکا بکا انھیں سن رہی تھیں۔ وہ تھکے تھکے سے کمرے سے باہر نکلے اور

ہال میں ان دونوں کو دیکھ کر ٹھٹھک گئے۔ صائبہ نے دیکھا ان کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ وہ کرتے کی آستین چہرے پر پھیر کے ان کے قریب آئے اور وہ ان کے سینے سے لگ کر بری طرح رو پڑی۔

"میں آنٹی کو دیکھتا ہوں۔" اسیر جانے لگا تھا کہ عبدالخالق نے اسے روکا۔

نہیں، رہنے دو۔" انہوں نے صائبہ کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"میں آج کچھ زیادہ بول گیا بیٹا! تم پریشان نہ ہو، کچھ وقت بعد تمہاری ماں ٹھیک ہو جائے گی، میں معافی مانگ لوں گا اس سے۔ مجھے وہ سب نہیں کہنا چاہیے تھا۔" وہ اور تیزی سے رونے لگی۔

"کچھ غلط تو نہیں کہا تھا انہوں نے۔ گھر کے مرد سے سب ہی سنبھل جانے اور سنبھال لینے کی توقع رکھتے تھے، اس کی بہادری کے پیچھے کی پردہ داری کوئی نہیں سمجھتا۔ وہ دیکھتی تھی، اب بھی شہر یا آس پاس کے علاقے میں کسی لاوارث لاش کی خبر پر وہ چپ چاپ گھر سے نکل جاتے تھے۔ وہ اب بھی ہر ہفتے اقبال چوہدری سے ملتے تھے۔ خاموشی سے انتظار اور تلاشِ مسلسل تو ان کی اب تک جاری تھی۔

"بس بیٹا۔" انہوں نے اسے خود سے الگ کیا۔ "فکر نہ کرو، میں تمہاری ماں کو منا لوں گا۔ وہ شام میں سو کر اٹھے گی تو نارمل ہو گی۔" انہوں نے اس کے آنسو صاف کیے۔

"ابو!" اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔ "یہ بات یہیں ختم کر دیں۔" اس کا سر جھکا تھا۔

"نہیں بیٹا۔ تم اپنی ماں کی باتوں کو دل پر مت لیا کرو، وہ ذہنی مریضہ ہے۔" ذرا دیر پہلے جذبات اور طیش میں وہ خود یہ بھول گئے تھے جس کا انھیں افسوس تھا۔

"تم یہاں سے دور جاؤ، زندگی جیو، خوش رہو، یہ میری خواہش ہے۔ تمھیں آگے بڑھنا ہے، ایک نئی شروعات کرنی ہے اور اس سفر میں اسیر کو تمھارا ہاتھ تھماتے ہوئے میں مطمئن ہوں۔" ان کا لہجہ مضبوط اور حتمی تھا۔

☆☆☆

اسے کمرے میں بھیج کر اسیر اور عبدالخالق نے وہ سہ پہر آگے کی منصوبہ بندی میں گزاری۔ وہ اب دیر نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ عصر پڑھ کر کمرے سے باہر نکلی تب تک وہ دونوں ہال میں ہی تھے۔ وہ چائے بنا کر ٹرے لیے ہال میں آئی۔

"میں امی کو دیکھتی ہوں۔" وہ دونوں کے سامنے کپ رکھ کر ان کے کمرے میں چلی آئی۔ خلافِ معمول وہ پلنگ پر پیر لٹکائے بیٹھی تھیں۔ بستر کی حالت اور ان کا چہرہ بتا رہا تھا وہ سوئی نہیں تھیں۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ سو کر نہیں اٹھیں یعنی وہ ابھی تک ابو کی باتیں سوچ رہی ہیں۔ وہ پلٹ کر عبدالخالق کو بلانے کا سوچ رہی تھی کہ ہاجرہ نے پکارا۔

"صائبہ!" ان کا انداز اور آواز مختلف تھی۔ "ادھر آؤ۔" انہوں نے بستر پر اپنے قریب ہاتھ رکھا۔ وہ ڈرتے ڈرتے ان کے قریب بیٹھ گئی۔ ہاجرہ پوری اس کی سمت گھومیں۔

"مجھے معاف کر دو صبو......" انہوں نے اسے بالکل ویسے پکارا جیسے اس حادثے سے پہلے لاڈ سے پکارتی تھیں۔

"امی!" اس نے تڑپ کے کہا۔ اس پر گھبراہٹ سوار ہونے لگی۔ وہ ماں کے لیے اتنی محتاط اور خوف زدہ رہتی تھی کہ ان کا یہ نیا روپ بھی اسے کسی طوفان کا پیش خیمہ لگ رہا تھا۔

"میرے تین بچے اور ہیں، میں یہ بھول گئی تھی۔ تمہارے ابو نے ٹھیک کہا مگر بہت دیر سے کہا، میں نے بہت تنگ دلی اور بزدلی کا مظاہرہ کیا، سنبھلنے کی کوشش ہی نہیں کی، باقیوں کا سوچا ہی نہیں، تمھیں محروم رکھا، جلی کٹی سناتی رہی، اب تو تلافی کا وقت بھی نہیں، میں پھر ہوش سے بے گانہ ہو جاؤں، اس سے پہلے مجھے کہنے دو۔" انہوں نے ساکت بیٹھی صائبہ کا چہرہ ہاتھوں میں لیا۔

"تم میری بہت پیاری اور بہادر بیٹی ہو۔" وہ

pklibrary.com

رو رہی تھیں۔ ''میں نے تمہارے ساتھ غلط کیا، ثوبان کا گم ہونا حادثہ تھا، تمہاری کوئی خطا نہیں تھی پھر بھی میں نے تمہیں گناہ گار بنادیا، تمہیں اپنے لفظوں سے گھائل کرتی رہی۔ وہ سانحہ ہم سب کا امتحان تھا جس میں میں ناکام رہی تم سب نہیں اور سب میں بھی معتبر تم ہو۔''

''امی!''اس کی لرزتی آواز میں بے یقینی اور نمی تھی۔ ہاجرہ نے اسے گلے لگایا اور دونوں زار و قطار رونے لگیں۔ دروازے میں کھڑے عبدالخالق اور اسیر حیرت زدہ سے اندر کا منظر دیکھ رہے تھے۔

''میں ماں تھی مگر تم میری ماں بن گئیں، تم نے مجھے ماں کی طرح سنبھالا۔'' وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھیں۔ ''کاش میں ہوش میں رہوں اور اپنے رویے کی تلافی کر سکوں!'' وہ کہہ رہی تھیں اور صائبہ کے بدن سے سوئیاں اڑ کر کہیں غائب ہونے لگیں، اس کے پیروں سے کانٹے نکل رہے تھے، سر سے سیاہ سائے ہٹ رہے تھے، زنداں کے دریچے میں پرندے پر پھڑ پھڑا کر زنجیریں ٹوٹنے کی نوید دے رہے تھے۔ اس کے آنسوؤں میں بیس برسوں کی تھکان اور اذیت بہہ رہی تھی۔

''مجھے معاف کردو صبو۔''

عبدالخالق نے اندر آکر دونوں کے سروں پر ہاتھ رکھا۔

''اب بس کرو۔'' ان کی آواز بھرائی تھی۔ صائبہ ان سے الگ ہوئی۔

''آپ بھی مجھے معاف کردیں۔''انہوں نے شوہر کا ہاتھ تھاما۔

''کسی کو کسی معافی کی ضرورت نہیں۔'' انہوں نے بیوی کے آنسو پونچھے۔ دو محبت کرنے والے میاں بیوی کا تعلق جو بیس سال پہلے منجمد ہو گیا تھا، آج پگھلنے لگا تھا۔

''ابھی ہمیں اپنی بیٹی کی شادی کرنا ہے اور پھر جو وقت بچا ہے اسے بیس سال پہلے جہاں سب ٹھہر گیا تھا، وہیں سے دوبارہ شروع کریں گے۔''

''ہمم۔''ہاجرہ نے اقرار میں سر ہلایا۔

''اسیر!'' انہوں نے دروازے کے باہر کھڑے اسیر کو پکارا۔

''جی۔''وہ کمرے میں آیا۔

''بیس سال بعد مجھے خوشی کا احساس صائبہ اور تمہاری شادی پر ہی ہوگا۔'' عبدالخالق کے بجائے ہاجرہ نے کہا۔

اسی رات سب کو فون کھڑکائے گئے۔ اس کی شادی کی تاریخ طے کرنے سے پہلے نعمان اور لائبہ سے بات کرنا ضروری تھا کہ انھیں اور بچوں کو کب چھٹیاں مل سکتی ہیں۔ اسیر نے آپی سے بات کی انہوں نے عبدالخالق سے پھر تایا جان کو بھی یہ خوش خبری دی گئی۔ وہ سب ہاجرہ کی ہوش مندی اور حواس میں ان کی تمنا پوری کرنا چاہتے تھے کیوں کہ اس کا دورانیہ کتنا ہوگا کوئی نہیں جانتا تھا۔

☆☆☆

جس رات بیس سال بعد عبدالخالق اور صائبہ سکون کی نیند سوئے تھے وہ رات ہاجرہ کی آخری رات ثابت ہوئی۔ وہ اپنے وقت پر جاگی نہیں تو عبدالخالق انہیں جگانے گئے مگر وہ ابدی نیند سو چکی تھیں۔

کہانی انجام کو پہنچے تب ہی کتاب بند کر کے سکون ملتا ہے ورنہ ادھوری کہانیاں بے چین رکھتی ہیں اور ایک تکمیل کو نہ پہنچا قصہ کس طرح ان سب کو ادھورا کر گیا تھا۔

ہاجرہ جانتی تھیں اسی لیے اپنے باب کو مکمل انجام دیا تھا تاکہ باقی سب کتاب بند کر کے پرسکون ہو سکیں۔ کوئی ادھورا پن اور ان کہی کی بے قراری کسی کے ساتھ نہ رہے۔

وہ اپنے اختتام سے سب کے لیے نئے آغاز کا راستہ کھول گئی تھیں۔ بیس سالوں میں اتنے ہوش و حواس میں وہ پہلی بار اسی لیے آئی تھیں کہ یہ آخری بار تھا۔

لائبہ وقت پر پہنچ گئی تھی مگر نعمان کو ماں کا آخری

pklibrary.com

دیدار نصیب نہیں ہوا۔ نعمان باپ کو ساتھ لے جانا چاہتا تھا مگر وہ اسی شہر اور گھر میں رہنا چاہتے تھے تب صائبہ نے ان کے ہاتھ تھام کر کہا تھا۔

"ابو! میں چاہتی ہوں آپ بھی یہاں سے باہر نکلیں، اس شہر اور اس گھر سے پرے کی زندگی اور دنیا کے رنگ دیکھیں۔ آپ باپ ہی نہیں نانا اور دادا بھی ہیں۔ اپنے نواسوں اور پوتا پوتی پر اپنی محبتیں نچھاور کریں، ان کی چھوٹی بڑی خوشیاں اور شرارتیں انجوائے کریں۔ اپنے ان دو بچوں کے ساتھ بھی وقت گزاریں۔ آپ نے ذمہ داریاں بہت احسن طریقے سے نبھائی ہیں اب سب کے ساتھ زندگی جیئیں، مسکرائیں، ہنسیں۔ آپ یہاں اس گھر میں بند رہیں گے تو میں بھی آپ کے ساتھ بند رہوں گی۔"

اور وہ مان گئے۔

ان کی شادی کے بعد وہ نعمان کے ساتھ چلے گئے تھے۔ اسیر کو یہاں کے اسپتال کا کمٹمنٹ پورا کرنا تھا۔ اس کے بعد وہ ناسک میں اپنے والدین کا اسپتال سنبھالنے والا تھا۔

☆☆☆

بیگز ڈکی میں رکھنے کے بعد وہ کچھ دیر صائبہ کا انتظار کرتا رہا جب وہ نہیں آئی تو وہ اندر آیا۔ سب کمرے بند تھے بس ہال اور باہر کا دروازہ مقفل کرنا تھا۔

"صائبہ!" وہ آواز دیتا ہال میں آیا۔ وہ اسی دیوار کے پاس فرش پر پیر پھیلائے بیٹھی تھی۔ وہ کچھ کہے بغیر آگے آکر اس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ وہ رو نہیں رہی تھی مگر کسی بھی پل آنسو لڑھکنے والے تھے۔ اسیر نے بازو پھیلا کر اسے خود سے قریب کیا۔

"تم رو لو آخری بار۔" اس کی ساری یادیں یہیں بکھری پڑی تھیں۔ اس چار دیواری کو چھوڑ کر، یہاں سے دور وہ پہلی بار جا رہی تھی۔ وہ رونے لگی۔

"ہم آتے رہیں گے، ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر تو نہیں جا رہے۔" کچھ دیر بعد اسیر نے کہا۔ اس نے آنسو صاف کرتے ہوئے سر ہلایا۔

"میری زندگی کے کچھ بہت حسین پل اور خوبصورت یادیں اس شہر اور گھر سے جڑی ہیں۔" اسیر نے اس کی بائیں ہتھیلی ہاتھ میں لے کر پشت کے ہلکے ہو رہے نشان پر انگوٹھا پھیرا۔ "یہ گھر اور شہر میرے لیے خاص ہیں کہ یہاں مجھے تم ملی ہو۔" وہ اس کی غمگین اور اداس یادوں کی گٹھڑی میں کچھ خوش کن جگنو ڈال رہا تھا۔

"یہ ہمیشہ میری اچھی یادوں کا حصہ رہے گا۔ تم بھی اسے ایسے ہی یاد رکھو۔"

صائبہ نے اس کے ہاتھ میں اپنے ہاتھ کو دیکھا۔ بہت دن ہوئے اس کے احساسات کی محفل میں بڑی تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں۔ کئی نئے چہرے پہلی دوسری قطار سنبھال چکے تھے۔ اداسی اور دکھ اب کہیں پیچھے دبکے رہتے تھے۔ وہ جانتی تھی، یہ موقعہ دیکھ کر وقتاً فوقتاً آگے آتے رہیں گے مگر اب وہ تنہا نہیں تھی۔ اس کے ساتھ، اس کے پاس، ایک ماہر طبیب، ایک مسیحا تھا...... بلکہ نہیں وہ تو ساحر تھا جس کے چند الفاظ میں ہی وہ تاثیر تھی کہ زخم بھی خوشبو بکھیرنے لگتے تھے اور تیرگی میں رنگے احساسات ست رنگی ہو جاتے تھے۔

"اتنے غور سے کیا دیکھ رہی ہو بلکہ کیا سوچ رہی ہو؟" اسے یک ٹک ہاتھوں پر نگاہ ٹکائے دیکھ اسیر نے سوال کیا۔

"اسی وجہ سے یہ میرے لیے بھی خاص ہے۔" اس نے اسیر کی سمت دیکھا۔ "مگر یہ میرا میکہ بھی ہے، اس لیے ہر بار یہاں سے جاتے ہوئے میری آنکھیں نم تو رہیں گی۔" وہ دکھ ہی نہیں سب کچھ بانٹنے کی اہمیت جان گئی تھی۔

"فیئر اِنف!" اسیر نے سر ہلایا پھر یونہی اس کا ہاتھ تھامے کھڑا ہوا تو اسے بھی اٹھنا پڑا۔

"اب چلیں...... ورنہ آپی خود آ جائیں گی۔"

اس نے چاروں طرف الوداعی نظر ڈالی۔ سارے منفی اور مایوس خیالات وہ یہیں چھوڑ کر جا رہی تھی اس امید کے ساتھ کہ اگلی دفعہ آئے گی تو ایک نئی

pklibrary.com

اور پُر رجا صائبہ سے مل کر وہ یہ گھر بھی چھوڑ جائیں گے۔

"چلیں۔" اسیر کا ہاتھ کھینچتے ہوئے وہ اس سے پہلے دروازے کی سمت بڑھی تھی۔

☆☆☆

صائبہ اپنی تکلیف اور تجربہ یوں ضائع نہیں جانے دینا چاہتی تھی۔ ناسک منتقل ہو جانے کے بعد اس نے اسیر سے کہا تھا۔

"ہمارے یہاں گمشدہ افراد کے خاندان یا کسی بھی حادثے میں بچ جانے والوں کے لیے کوئی مستحکم ادارہ ہے نہ کوئی سپورٹ سسٹم نہ کسی قسم کی گائیڈ لائنز ہیں۔ جو محدود ہیلپ موجود ہے، اس کا علم اور فائدہ اٹھانے کی سکت صرف متمول طبقے میں ہے۔ متوسط اور غریب طبقے کا کوئی پُرسان حال نہیں۔ اگر کہیں کچھ ہے بھی تو ضرورت مند کو اس کی خبر ہی نہیں۔ جب کہ غریب بستیوں میں گمشدگی کے معاملات زیادہ ہوتے ہیں۔ میں ایسے خاندانوں کے لیے کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ کسی نے ہمیں درد دل رکھنے کا مشورہ ہی دیا ہوتا تو بھی ہمارے حالات بہت مختلف ہوتے تھے اس لیے میں کوئی چھوٹی سی شروعات، معمولی سی مدد ہی سہی، لیکن مجھے اپنے جیسے پیچھے رہ جانے والوں کے لیے کچھ کرنا ہے۔"

اور اسیر نے وعدہ کیا تھا وہ اس میں اس کی پوری مدد کرے گا۔ اس معاملے میں آپی بھی اس کے ساتھ تھیں۔

کئی مہینوں کی ریسرچ اور محنت کے بعد اب اس کی ایک این جی او تھی جو پیچھے رہ جانے والوں کے لیے کام کرتا تھا۔ ان خاندانوں کے ساتھ کام کرتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ ایسے بچوں کی تلاش میں بھی انوالو ہو گئی تھی۔

بیس اکیس سال میں حالات بہت بدل گئے تھے۔ گم شدہ افراد کی تلاش کے لیے الگ محکمہ تھا جن کا طریقہ کار اور نیٹ ورک بھی پہلے سے بہتر تھا۔ اقبال چوہدری بھی اس کے این جی او کے ساتھ رضا کارانہ طور پر کام کرتے تھے۔

☆☆☆

عبدالخالق چند ماہ بعد کچھ وقت کے لیے واپس آئے تو وہ بھی کچھ دن کے لیے ان کے پاس آئی تھی جب ایک دن اقبال چوہدری کے فون نے ان کی دنیا بدل دی۔

"ثوبان مل گیا ہے عبدالخالق۔" ان کی آواز کا جوش اور خوشی اپنی اولاد مل جانے جیسی تھی۔

"کیا......؟" انھیں اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا مگر یہ معجزہ رونما ہو چکا تھا۔

اقبال چوہدری کی ہمیشہ اور ہر جگہ ثوبان کی تصویریں دینے اور چھوڑنے کی عادت رنگ لائی تھی۔ کسی خاتون نے ثوبان کی تصویر پہچان لی تھی جو جوانی میں لوگوں کے گھروں میں کام کیا کرتی تھیں۔ وہ بچہ بیس اکیس سال قبل، اس کے گمشدہ ہونے والے سال ہی ایک کرسچن جوڑے کے گھر آیا تھا۔ انہوں نے اس بچے کے متعلق کہا تھا کہ اپنے کسی غریب رشتے دار کا بچہ گود لیا ہے۔

بہت ساری ضابطے کی کارروائیوں کے بعد وہ ان کے سامنے تھا۔ انہوں نے سب سے پہلے اس کی کہنی پر وہ زخم کا نشان دیکھا تھا جو بچپن میں جلنے سے بچ گیا۔ تقریباً ستائیس سال کا وہ دبلا پتلا نوجوان عبدالخالق کی جوانی کا عکس تھا مگر کنفیوز اور ڈرا ڈرا سا۔ جسے وہ ساری دنیا میں تلاش کر رہے تھے وہ ان کے بہت قریب تھا۔ مزید تحقیق اور مجرم جوڑے کے اقبال جرم سے صاف ہوا تھا کہ اسے پاس کے شہر کے ایک عیسائی میاں بیوی نے اغوا کیا تھا۔ پہلے ڈیڑھ سال تک اسے بڑے پیار سے گھر تک ہی محدود رکھا کہ وہ کہیں بھاگ نہ جائے یا کسی کو اصلیت نہ بتا دے۔ وہ مالی طور پر خوش حال مگر بے اولاد تھے۔ ثوبان کو گھر لانے کے بعد قسمت نے انھیں جلد ہی اولاد کی نعمت سے نواز دیا اور اس کے بعد انھیں کسی غیر کو بیٹا ماننے اور سمجھنے کی ضرورت نہیں رہی۔ اپنی اولاد کے ملتے ہی ان کا دل اور نیت بدل

pklibrary.com

گئی تھی۔ ثوبان کی صورت میں انھیں بنا تنخواہ والا نوکر مل گیا اور گھر کے کاموں کے لیے وہ چار دیواری کا قیدی بنا دیا گیا تھا۔ اولاد کی خواہش میں کیا گیا جرم اب اکلوتی اولاد کی خاطر ہی زندگی بھر چھپائے رکھنا لازمی تھا۔ انھوں نے اس کوشش میں ثوبان کی شخصیت مسخ کر دی تھی۔ وہ ہمیشہ گھر میں بند رہنے والا ان پڑھ اور اعتماد سے محروم کمزور سا نوجوان تھا۔ ایک بوڑھے اور ایک لڑکی کو یوں خود سے لپٹ کر روتے دیکھ اس کا دل عجیب ہو رہا تھا۔ اسے اپنی زندگی کے غیر معمولی پن کا احساس ہمیشہ رہتا تھا مگر حقیقت اتنی ڈرامائی اور دکھی ہوگی یہ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔

ہاجرہ کی دیوانگی یونہی نہیں تھی، ثوبان کے ذہن میں صرف ماں اور مکان کی دھندلی یادیں تھیں، ان کے علاوہ اسے کوئی اور یاد نہ تھا۔ اس یاد کے سہارے اس نے مان لیا تھا کہ اس کی صرف ماں تھی اور وہ کسی وجہ سے دور ہو کر خود ہی بھٹک گیا تھا۔ اس کی ایک ہی خواہش تھی کہ وہ کبھی تو اپنی ماں سے مل سکے۔

جب وہ ہاجرہ کی تصویر دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رویا تو سب کے دل میں ایک ہی کاش تھا کہ ہاجرہ یہ دیکھ پاتیں۔ نعمان اور لائبہ بھی آئے تھے۔ وہ ان کے لیے بھائی اور بیٹا تھا لیکن اس کے لیے وہ سب اجنبی تھے۔ اجنبیت اور دوری کے باوجود خون اور دل کے رشتوں نے بہت کچھ آسان کر دیا تھا۔

☆☆☆

کار سے ٹیک لگائے وہ بھیگی آنکھوں سے قبرستان کے احاطے کی سلاخوں کے پار کا منظر دیکھ رہی تھی جہاں ہاجرہ کی قبر پر ثوبان زار و قطار رو رہا تھا اور عبدالخالق اسے شانوں سے تھام کے کھڑے تھے۔ وہ سب آج یہ شہر اور گھر چھوڑ کر جا رہے تھے۔ ثوبان کو طبی اور نفسیاتی مدد کے ساتھ ساتھ محبت اور اپنائیت کی ضرورت تھی اور یہ سب کے ایک ساتھ رہنے پر ہی ممکن تھا۔

"کاش امی تھوڑا اور انتظار کر لیتیں......!" اس نے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

"اصل زندگی میں ایسی پرفیکٹ اینڈنگ نہیں ہوتی ہے۔" اسیر نے ثوبان اور عبدالخالق کو دیکھتے ہوئے ہی اس کے پیچھے بازو پھیلایا۔

"مگر ثوبان کے لیے مجھے پرفیکٹ اینڈنگ لکھنا ہے۔"

"صائبہ......" اسیر نے گردن اس کی سمت گھمائی۔ "ثوبان کو ابھی اپنی شخصی، مذہبی، خاندانی ہر پہچان تلاش کرنا ہے، اسے اپنانا ہے، وہ بہت ٹوٹا پھوٹا ہے، اسے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے میں ہی بہت وقت لگے گا، اس کے لیے یہ سفر نہایت مشکل ہے اور پھر اب تک جس کی زندگی امپرفیکشن کی مثال رہی ہو اس سے کسی بھی معاملے میں پرفیکشن کی امید لگانا زیادتی ہوگی۔"

"لیکن میں اس سے امید نہیں رکھ رہی، خود سے کہہ رہی ہوں۔"

"آپ یہ سمجھیں، اسے صرف آنٹی یاد تھیں اور کوئی نہیں اور اب وہ ہی نہیں ہیں، ثوبان بھی پیچھے رہ گیا ہے اس لیے اس سے بہت توقعات رکھیں نہ خود کو اس پریشر میں ڈالیں کہ سب صحیح کرنا ہے۔"

اس کے ذہن میں "ثوبان بھی پیچھے رہ گیا ہے۔" اٹک گیا تھا۔ اس نے نظر پھر ادھر کی جہاں عبدالخالق نے اسے گلے لگایا ہوا تھا۔

اسے پیچھے رہ جانے والوں کو سنبھالنے اور سنوارنے کا سلیقہ آ گیا تھا اور وہ اس بار تنہا بھی نہیں تھی۔

"تو مجھے امپرفیکشن کو ہی تکمیل سے زیادہ خوبصورت بنانا ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے پورے یقین سے کہا تھا۔

☆☆

pklibrary.com

سونیا ربانی

فیصلہ

pklibrary.com

نایاب کو اماں کی طرف آئے دو ہفتے سے بھی زیادہ ہو گئے تھے۔ مگر رضوان نے نہ کال کی اور نہ ہی ولید کی یاد آئی کہ گزرتے گزرتے بیٹے سے ہی مل جاتے۔ جب کہ ان کا راستہ یہ ہی تھا۔ پہلے تو اسے چار دن بھی نہیں رہنے دیتے تھے کہ ولید کے بغیر گھر بالکل اچھا نہیں لگتا۔ ولید کی دادی اماں تو دو دن بھی مشکل سے گزارتی تھیں۔ سچ تو یہ تھا کہ نایاب نے کبھی ضد نہ کی تھی۔ چھ سالوں میں پہلی بار ضد کی تھی مگر رضوان نے نہ مانی۔

وہ لاہور اپنے چچا کے بیٹے کی شادی پہ جانا چاہتی تھی۔ پورے ہفتے کے لیے، رضوان کو بھی ساتھ لے کر جانا چاہتی تھی۔ مگر وہ کہہ رہے تھے۔ "تم اپنے گھر والوں کے ساتھ چلی جاؤ میں نہیں جا سکتا ہوں۔ اماں کو اکیلے کیسے چھوڑ جاؤں۔"

وہ چاہتی تھی کہ اماں کو آپا ناصرہ کی طرف چھوڑ جائیں۔ لیکن وہ نہ مانے۔ تو وہ ناراض ہو کر اماں کی طرف آ گئی۔ ولید کی دادی اماں کو نایاب نے کہا۔

"میری اماں کی طبیعت خراب ہے اس لیے رضوان کے ساتھ جا رہی ہوں کچھ دنوں میں آ جاؤں گی۔"

رضوان نے دروازے پہ اتار کر کہا کہ میں لینے نہیں آؤں گا اور نہ میں لاہور جاؤں گا۔ تم بے شک چلی جانا مگر وہ نہ جانے کیوں ضد پر اڑ گئی تھی اس طرح اماں کی طرف آ گئی کہ رضوان مان جائیں گے۔ مگر دو ہفتے سے زیادہ ہو گئے۔ انہوں نے خبر بھی نہ لی۔ جب کہ ولید کی دادی اماں روز فون کرتی تھیں ادھر اماں حیران تھیں کہ ان کی صحت ٹھیک تھی۔ تو نایاب کیوں جھوٹ بول کر آئی ہے۔

وہ سارا دن فون دیکھتی رہتی۔ مگر رضوان نہ جانے اتنے پتھر دل کیوں ہو گئے تھے۔ اور اسے اس کی انا مجبور کر رہی تھی۔

☆☆☆

ولید نے صبح ناشتہ نہیں کیا تھا اور اب اسے بھوک لگی تھی۔ وہ کچن کے تین چکر لگا چکا تھا۔ نایاب، بھابھی کے ساتھ کچن میں لگی تھی۔ بھائی کے جاننے والے آ رہے تھے۔ بھابھی نے اس سے کہا۔

"پہلے ایک روٹی بنا دو ولید کو۔ بھوک لگی ہے اسے۔"

وہ اپنے چار سالہ بیٹے کے لیے روٹی بنانے لگی، بھابھی کی کال آ گئی تو وہ باہر نکل گئیں۔ اماں کچن میں آئیں۔ ایک طرف وہ روٹی بنا رہی تھی دوسری طرف قورمہ بن رہا تھا۔ اماں نے سالن میں سے بوٹی نکالی اور باہر نکل گئیں۔

ولید پھر سے روٹی کے لیے چلا آیا۔ نایاب نے اس کے لیے سالن نکالا مگر وہ سالن دیکھ کر بولا۔ "ماما

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے

بہنوں کے لیے خوب صورت ناولز

ناول	مصنفہ	قیمت
زرد موسم	راحت جبیں	-/1000
حساب دل رہنے دو	نبیلہ عزیز	-/400
محبت من محرم	سمیرا حمید	-/400
ایک تھی مثال	رخسانہ نگار عدنان	-/500
یہ گلیاں یہ چوبارے	فائزہ افتخار	-/400
دست مسیحا	نگہت سیما	-/400
گل کہسار	فرح بخاری	-/400

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

میں نے قیمہ بھی کھانی ہے۔" وہ تو اماں نکال کر لے گئی تھیں۔

"اچھا تم یہاں بیٹھ کر روٹی کھاؤ۔ میں آدھی تمہارے لیے لے آئی ہوں۔" اماں واسط کے لیے ہی لے کر گئی ہوں گی۔ وہ ولید سے کہہ کر بھابھی کے کمرے کی طرف آ گئی۔ دروازہ کھلا تھا۔

واسط کھانے میں نخرے کر رہا تھا۔ تب ہی اماں کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ "جلدی کھالو میرے بچے! دیکھنا ابھی ولید آ گیا۔ تو یہ قیمہ بھی نظر بھی نہیں آئے گی۔" اور نایاب کو لگا کہ چھت اس کے سر پر آ گری ہے، وہ مرے مرے قدموں سے کچن میں لوٹ آئی۔ ولید قیمہ کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ مگر نایاب نے کہا" وہ تو واسط نے کھالی بیٹا! تم جلدی سے روٹی کھالو۔ پھر بابا لینے آ رہے ہیں۔"

نایاب نے بے اختیار فون اٹھایا اور رضوان کو کال ملائی۔ انہوں نے دوسری بیل پہ فون اٹھالیا۔ وہ بولی۔

"کب واپس آئیں گے دفتر سے۔"

وہ بولے" چار بجے واپسی ہوگی۔ کیوں تم گھر لوٹ آئی ہو کیا جو آنے کا پوچھ رہی ہو۔" رضوان نے پوچھا۔

"نہیں آپ واپسی پہ مجھے اپنے ساتھ لیتے جانا میں انتظار کر رہی ہوں۔"

"ٹھیک ہے جناب! میں دفتر سے نکل رہا ہوں تم تیار رہنا۔ اللہ حافظ۔"

اس نے فون رکھ دیا۔ جس انا کی دیوار میں وہ قید ہوتی جا رہی تھی اماں کی آواز نے وہ دیوار گرا دی تھی۔ اس نے پل بھر میں واپسی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے بے اختیار پر سکون سا سانس لیا۔ اور کچن کے دروازے کے باہر کھڑی اس کی اماں نے بھی۔ جو پلیٹ میں آدھی قیمہ اپنے پیارے نواسے کے لیے بچا کر لائی تھیں۔

☆☆

مکمل ناول

مالِ غنیمت

اُم ایمان قاضی

''امی امی! کدھر ہیں؟'' حریم سارے گھر میں چلاتی پھر رہی تھی۔
''کیا ہے؟'' وہ الماری میں منہ دیے ہی اونچی آواز میں بولی تھیں۔
''صائمہ کی منگنی ہے شام میں...... ابھی کال آئی ہے اس کی۔ اور پتا ہے ہم سب کزنز نے کیا پروگرام بنایا ہے؟''
وہ خوشی سے بولتے ہوئے وہیں بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔
''کیا پروگرام ہے بھئی......؟'' ثانیہ نے مسکرا کر بیٹی کے چہرے کی جانب نگاہ کی تھی۔
''صائمہ کہہ رہی تھی کہ وہ سب کو رات اپنے پاس ہی روک لے گی...... ساری کزنز مل کر وہاں مزہ کریں گی، باتیں کریں گی...... مل کر بیٹھے ایک عرصہ ہوگیا۔''
''نہیں......'' ثانیہ کا لہجہ ایک دم سخت ہوا تھا۔ اس نے الماری کے پٹ زور سے بند کیے تھے۔
''تم میرے ساتھ ہی جاؤ گی۔ میرے ساتھ ہی واپس آؤ گی۔ باقی رہیں، رکیں۔ مجھے کسی سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔''
''امی!'' حریم بسوری۔ ''وہ میرے چچا کا گھر ہے اور صائمہ میری کزن ہے۔ اور میرا تو اور کوئی رشتہ دار بھی نہیں۔''
''میری بھی خالہ کا گھر تھا......'' اس کی بات سن کر ثانیہ بڑبڑائی تھیں اور ہولے ہولے چلتی ہوئی اس کے پاس بیڈ پر ہی آ کر بیٹھ گئی۔
''میری ایک تائی اماں ہوتی تھیں حریم! جانتی ہو وہ کیا کہتی تھیں؟''
وہ اس کے کندھوں کے گرد بازو پھیلا کر ہولے سے بول رہی تھیں۔
''ایک بات پوری سنی نہیں میری، دوسری شروع کر کے بیٹھ گئیں۔ خیر بتائیں کیا کہتی تھیں آپ کی تائی اماں......''
حریم کا منہ ابھی بھی پھولا ہوا تھا۔ ابھی ابھی تو وہ صائمہ سے رات کا پروگرام سیٹ کر کے آئی تھی اور یہاں اس کی امی نے ہمیشہ کی طرح اسے کہیں اکیلے بھیجنے سے انکار کر دیا تھا۔
''تائی کہتی تھیں......''
حریم ثانیہ کی بات پر متوجہ ہوئی تھی۔
''جس ماں کی نظر اپنی بچی سے چوک گئی وہ پھر دوسروں کے لیے ''مالِ غنیمت'' کی مانند ہوتی ہے۔ اگلا پھر اس سے اپنے ظرف کے مطابق سلوک کرتا ہے اور پھر مالِ غنیمت جب عورت کی صورت ہو تو پھر سلوک کرنے والا نہ چچا زاد رہتا ہے نہ خالہ زاد، نہ پھپھو زاد نہ تایا زاد...... وہ صرف مرد ہوتا ہے۔
''صرف مرد'' کاش کہ اس وقت وہ بات اور اس جیسی کئی باتیں ساجدہ سمجھ جاتیں تو نہ آج ثانیہ پر بے اعتباری کا عمر بھر کا ٹھپہ لگا ہوتا نہ ہی رانیہ بے بسی کی موت مرتی......''
وہ سرگوشی کی صورت بول رہی تھیں۔

pklibrary.com

''رانیہ...... میری خالہ...... مجھے لگتا ہے آج آپ کو پھر خالہ اور نانی کی یاد آئی ہے۔'' حریم نے اس کی آنکھوں میں نمی دیکھی تو وہ اپنی ضد بھول گئی تھی۔ اس نے ماں کو گلے سے لگالیا۔

☆☆☆

صدیقہ بیگم جیسے ہی اپنی طرف کا دروازہ کھول کر دوسرے پورشن میں آئیں جوان کی دیورانی کا تھا۔ بے زاری اور کوفت سے ان کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔

''عمر گزار دی اس عورت نے پر سلیقہ اور گھر داری کی الف ب بھی نہ جان سکی۔''

انہوں نے نیچے پڑا ہوا گلاس اٹھا کر صحن میں پڑی چار پائی پر رکھا جس کے پاؤں کے نیچے آجانے سے وہ گرتے گرتے بچی تھیں۔

''ثانیہ...... ثانیہ......''

انہوں نے زور سے آواز لگائی اور ناگواری سے اطراف کا جائزہ لینے لگیں۔ رات کو وہ لوگ صحن میں ہی سوئے ہوں گے جب ہی چار پائیاں، بستر، تکیے، چادریں چار پائیوں پر ویسے ہی موجود تھیں۔ دودھ جن گلاسوں میں پیا گیا تھا، وہ ویسے ہی یہاں وہاں اوندھے پڑے تھے جن پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں

گنڈیریوں کے سوکھے چھلکے ان کی نفیس طبیعت کو ایسے ناگوار گزرے کہ انہوں نے طویل سانس لیتے ہوئے اس طرف سے منہ پھیرلیا۔ اتنے میں چائے کا کپ ہاتھ میں لیے ثانیہ نمودار ہوئی تھی۔

''ارے تائی جان! آپ کب آئیں! اندر آجاتیں۔''

''باہر کا حال دیکھ کر ہی بھر پائی میں...... ماں تمہاری کی تو اب سدھرنے کی نہ عمر ہے نہ امید...... تم دونوں بڑی ساری ہو...... صفائی ستھرائی کا خیال رکھا کرو...... نو بج گئے ہیں صبح کے اور حال دیکھو ذرا اس گھر کا...... اور تمہیں کتنی بار سمجھایا ہے کہ سلیپر گھسیٹ کر مت چلا کرو۔''

''ابھی کریں گے ناں تائی جان! صفائی وغیرہ، ماسی کم بخت دس بجے کے بعد آتی ہے۔ صبح اٹھ کر سارے اندر جا کر سو جاتے ہیں۔ آج کل کالج کی چھٹیاں ہیں تو عیش ہی عیش ہیں میرے، اس لیے ناشتا بھی ابھی کیا ہے۔ اماں تو ابھی بھی سوئی ہوئی ہیں۔ رانی ٹی وی دیکھ رہی ہے۔ میں آپ کے لیے ناشتا لاؤں؟''

''نہیں بھئی۔ ہم سے نہیں ہوتے یہ بے برکتی والے کام...... تمہاری ماں کا تو سدا یہی اصول رہا کہ نہ کوئی اوقات بنائے کسی کام کے نہ کبھی طریقے سے

pklibrary.com

تمہاری جی پی اے بہت کم تھی...... تب امتحانوں سے پہلے تمہارے کسی ماموں زاد کی شادی آ گئی تھی۔ تو اب ان چھٹیوں میں کوشش کرو کہ جن مضامین میں کچھ کمی ہے وہ دور کر لو...... رضا کے بھی تمہارے والے ہی مضامین تھے۔ اس سے مدد لے سکتی ہو۔ مجھ سے ہو سکا تو میں بھی حتی المقدور مدد کر دیا کروں گا۔ لیکن پہلے نمبر پر تعلیم پھر یہ سیر سپاٹے۔"

"اسے کیا سمجھا رہے ہیں۔ جس کو سمجھنی چاہیے یہ بات، اس کو ہوش خبر ہی نہیں ہے۔ آئے روز کے بلاووں پر گھر بند کر کے بچیوں کو لے کر چل پڑتی ہے کئی کئی دن میکے میں رہنے کے لیے...... ایسے میں بچوں کی پڑھائی کا حرج نہ ہو تو کیا ہو......"

تائی صدیقہ کچن سے چائے لے کر آئیں اور تایا جان کے سامنے لا کر رکھ دی۔

"ہاں تو ٹھیک ہے، جائے سو دفعہ جائے۔ اس کا میکہ ہے۔ ہم کیسے کسی کو روک سکتے...... نہ ہی بھابھی کو نہ بچیوں کو...... آخر کو ان کے نانا، خالہ، ماموں ہیں وہاں مگر بیٹا! جب ضروری ہو تب جاؤ وہاں...... تمہاری ماں بھلے چلی جائے۔ تم دونوں یہاں رہ سکتی ہو...... یہ بھی تو گھر ہے تمہارا...... ضروری ضروری فنکشنز پر جاؤ۔ ورنہ تمہاری ماں جاتی ہے تو جائے...... تم لوگ منع کر دیا کرو۔ مجھے اس بار اچھا رزلٹ چاہیے تمہارا۔"

تایا ابو نے ایک بار پھر سمجھایا تو ثانیہ نے اثبات میں ہولے سے سر ہلا دیا۔

☆☆☆

"شکر ہے، ثانیہ بی بی کو بھی ہوش آیا اور پتا چلا کہ زندگی کی ترجیحات میں ایک تعلیم بھی ہے جس پر دھیان دینا بھی ضروری ہے۔"

مردہ دلی سے اسے کتابیں اٹھائے اپنے کمرے میں آتے دیکھ کر رضا کو خوش گوار سی حیرت ہوئی تھی۔

"بس کرو، اب تم شروع نہ ہو جانا...... پرسوں تائی جان کا ایک لمبا سا لیکچر سنا، پھر تایا جان کا...... آج تم سے سننے کا بالکل بھی موڈ نہیں ہے۔"

وہ بے زاری سے کتابیں میبل پر رکھتی صوفے پر ڈھیر ہو گئی۔ آنکھوں میں ابھی بھی نیند کا ہلکا سا خمار تھا۔ جبکہ وہ خود بھی ست سی نظر آ رہی تھی۔

"تم یہ اتنی بے مصرف زندگی گزار کے مطمئن کیسے ہو؟ تھکتی نہیں ہو سارا سارا دن سو سو کے......"

"بے مصرف کیوں...... گھر کے کتنے کام ہوتے ہیں کرنے والے...... پھر اتنی پڑھائی۔ ٹائم ہی نہیں ملتا۔"

"ساری ساری رات جاگ کر ٹی وی دیکھا جائے گا۔ سونے کے ٹائم جاگنا، اٹھنے کے ٹائم سونا ہو گا تو پھر تو واقعی ٹائم کا نکلنا مشکل ہی ہے ناں۔

ہمیں دیکھو۔ نماز کے بعد اماں نے کبھی سونے ہی نہیں دیا۔ پڑھائی کا کام تو ان ہی دو ڈھائی گھنٹوں میں ہو جاتا ہے جب تک ناشتا بنتا ہے۔ پھر کالج۔ واپس آ کر کھانا کھا کے تھوڑی دیر کا ریسٹ، اس کے باوجود اتنا وقت بچ جاتا تھا کہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔ ابا نے مشورہ دیا۔ اس وقت کو مثبت انداز میں کام میں لانے کو...... بس پھر کیا تھا میں نے اور ثمینہ نے تمہارے سامنے اپنی ٹیوشن اکیڈمی کی بنیاد رکھی۔ ہمارے علم میں اضافے کی راہ تو نکلی ہی...... وقت کا بہترین مصرف بھی نکل آیا۔ اور تو اور اپنے ہاتھ اور محنت کی کمائی میں جو مزہ ہے۔ وہ دنیا کی اور کسی چیز میں نہیں ہے۔

تمہیں شاید حیرت ہو، ثمینہ نے اپنا سارا جہیز اسی آمدنی سے بنایا۔ ابا کو صرف زیورات اور فرنیچر کے لیے رقم خرچ کرنی پڑی۔ اب تو ماشاء اللہ ہماری اکیڈمی کا شمار شہر کی ایک اچھی ساکھ والی اکیڈمی میں ہوتا ہے۔ ثمینہ کی شادی کے بعد بچے بھی بڑھ گئے اور کام بھی تو اب میرے علاوہ سات آٹھ اساتذہ اور پڑھانے والے ہیں اس میں...... تمہیں بتانے کا مطلب یہ ہے کہ رات کو جب تھک کر سوتے ہیں تو ضمیر اور دماغ مطمئن ہوتے ہیں کہ زندگی ایک اچھے مقصد کے حصول میں گزر رہی ہے۔ ثمینہ نے اپنی تعلیم کو ضائع نہیں جانے دیا۔ اب سسرال میں بھی اپنا

pklibrary.com

ایک ٹیوشن سینٹر کھول لیا ہے۔ ایسے میں تمہیں دیکھتا ہوں تو عجیب سی کوفت ہوتی ہے مجھے......"

"اف رضا! کتنی مشکل زندگی ہے تمہاری...... نہ کوئی آرام سکون نہ ہی آزادی اور تفریح......"

اسے بھی وہ ساری تفصیل از بر تھی پھر بھی ہمیشہ والی بات ہی منہ سے نکلی۔

"مشکل نہیں انتہائی آسان، سادہ اور بامقصد، صرف سوچ بدلنے کی بات ہے۔"

"تمہیں صرف یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ جیسے ہی میری جاب کا کوئی سلسلہ بنتا ہے اماں میری شادی کرنا چاہتی ہیں۔"

"ہیں سچ! بہت مزہ آئے گا رضا! ثمینہ کی شادی کے بعد پھر کوئی فنکشن ہوا ہی نہیں ہمارے گھر میں......"

"پہلے میری پوری بات سنو بے وقوف لڑکی۔" وہ جھنجلا کر بولا۔

"میرا دل بھی عجیب ہے۔ آیا بھی تو تم جیسی سر پھری پر......"

وہ اس کے سر پر چپت مار کر بولا۔ ثانیہ ہونق سی اسے دیکھے گئی۔

"اماں بہت اصول پسند خاتون ہیں۔ انہوں نے ایک مشکل زندگی گزاری ہے اور ساری زندگی جن اصولوں پر خود کاربند رہیں۔ ہمیں بھی ویسی ہی عادت ڈالی اور اب اپنی اکلوتی بہو کے لیے بھی کچھ ایسی ہی خواہشات رکھتی ہیں۔ تو پلیز یہ اپنی روش چھوڑ کر ان کی گڈ بک میں آنے کی کوشش کرو، سمجھیں کہ نہیں؟"

"تائی جان مجھے بہت پیار کرتی ہیں...... ویسے بھی......" وہ اترا کر بولی تھی۔

"یہ تو ان کی اچھائی ہے ناں...... کچھ تمہیں بھی اپنی اچھائی ثابت کرنے کی ضرورت ہے۔"

"اچھا نا رضا! ابھی میں نے اس انداز سے اور اس بارے میں کچھ سوچا ہی نہیں...... بہت عجیب سی اور پابندی والی زندگی لگتی ہے مجھے شادی شدہ زندگی...... تم ایسا کرو...... مجھے یہ چیپٹر پڑھا دو...... ہزار بار خود سے پڑھ چکی ہوں، سر کے اوپر سے ہی گزر رہا ہے۔"

اس کے لاپرواہ انداز پر رضا طویل سانس لے کر کتاب پر جھک گیا۔

"یہ دل بھی کس بے وقوف پر آ گیا۔"

"سنو رضا!" پڑھتے پڑھتے اچانک اس نے کتاب سے سر اٹھایا۔ "مجھے ناں یہ تھکس انداز کی پسندیدگی اور محبت کا اقرار پسند نہیں ہے۔ میں چاہتی ہوں، وہ جیسے فلموں میں ہوتا ہے ناں وہ والی محبت ہو تو اچھا بھی لگے۔ خوب صورت اظہار محبت، پھول شول دے کر اظہار کرنا...... آسمان سے تارے توڑ لانے کے وعدے...... ظالم سماج کی آہنی دیواریں...... پھر محبوب کی کسی بھی خواہش پوری کرنے کے لیے جان تک کی بازی لگا دینا...... تم نے تو اظہار محبت بھی ایسے کیا ہے جیسے کیمسٹری کا یہ چیپٹر پڑھا رہے ہو۔"

اس کے آنکھیں میچ میچ کر مزے سے یہ داستان محبت بیان کرنے پر رضا کا دل چاہا، کیمسٹری کی کتاب اس بے وقوف کے سر پر دے مارے جو فلمیں دیکھ دیکھ کر اسی میں ہی زندہ تھی۔

"اچھا بی بی! یہ یاد کر کے سناؤ پھر اس قسم کی محبت کے بارے میں بھی کچھ سوچیں گے۔ چاند، تارے، ظالم سماج۔ اف خدایا۔"

وہ سر جھٹک بڑبڑایا۔ ثانیہ منہ بنا کر کتاب اٹھا کر رٹنے لگی۔ وہ سب کچھ تو اوپر سے ہی گزر گیا تھا کہ جب وہ پڑھا رہا تھا۔ اس کے دل و دماغ میں یہی خواہش گردش کر رہی تھی کہ خوب صورت تو ہے ہی رضا، بس ذرا محبت کرنے کی تمیز سیکھ جائے تو مزہ آ جائے زندگی کا۔ جب کہ رضا سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کے الفاظ ذہن میں دہراتا اور جھرجھری لے کر رہ جاتا۔

☆☆☆

"ایک بات کرنی تھی ثمینہ کے ابا! آپ سے۔"

تائی صدیقہ نے کتاب میں سر دیے شوہر کو مخاطب کیا۔ انہوں نے چونک کر اپنی نصف بہتر کو دیکھا پھر کچھ خاص بات ان کے چہرے پر محسوس کر کے کتاب بند

pklibrary.com

کر کے سائیڈ ٹیبل پر رکھی۔ چشمہ اتار کر کتاب پر رکھا اور پوری طرح ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"اپنی بھابھی بیگم کی عادات اور فطرت سے بخوبی واقف ہیں آپ۔"

ان کی اس بات پر انہوں نے استفہامیہ نظروں سے ان کی جانب دیکھا۔ جیسے جاننا چاہتے ہوں کہ وہ آگے کیا کہنا چاہ رہی ہیں۔

"اس عورت کو تو نہ بیوی بن کر کوئی عقل آئی نہ ماں بن کر، میکے کی ہڑک ایسی شدید ہے اس کے اندر کہ عمر بھر گھر گرہستی اور شوہر کو بھلائے رہی اور میکے والوں کی خوشی کا خیال رکھا۔ اور اب اولاد کے ساتھ وہی کر رہی ہے۔"

"کھل کر کہیں، آپ کہنا کیا چاہ رہی ہیں؟" وہ کچھ بیزاری سے بولے۔

"دیکھیں، بات ہے سیدھی اور صاف! کتنی اچھی جاب تھی بھائی صاحب کی اور کیا کچھ نہیں چھوڑا مرحوم نے بیوی بچوں کے لیے مگر پوچھیں تو بھاوج سے بچایا کیا! کچھ ہے اس میں سے...... مرحوم کے جتنے بھی فنڈ ملے اس نے بھائی اور بہنوئی کو پکڑا دیے کہ کاروبار میں شیئر ڈال دیں۔ منافع تو ایک طرف ہم نے تو گھر کی حالت کو مزید بگڑتے ہی دیکھا ہے۔ زیورات کا ایک بار میں نے سرسری سا پوچھا تھا۔ گڑبڑا کر آئیں بائیں شائیں کر کے رہ گئیں، مطلب وہ بھی اللے تللوں میں اڑا گئی ہیں۔ آپ سے درخواست اتنی ہے۔ اب جو مشترکہ تھوڑی بہت زرعی زمین بچی ہے اس میں سے جو بھی آمدنی آتی ہے تو اس ناعاقبت اندیش عورت کے ہاتھ میں پکڑا دینے کے بجائے اپنے پاس محفوظ کرتے جائیں۔ کل کو اس نے دو بیٹیاں بیاہنی ہیں۔ اور مجھے یقین ہے وہ اس وقت بھی خالی ہاتھ کھڑی منہ تک رہی ہو گی۔"

انہوں نے بہت لمبی بات کی تھی۔ تایا ابا سوچ میں پڑ گئے۔

"کہہ تو آپ ٹھیک رہی ہیں صدیقہ بیگم مگر میں کسی بھی حوالے سے نہ تو اپنے بھائی کی روح کے آگے شرمندہ ہونا چاہتا ہوں نہ ہی اللہ کے حضور یتیموں کی کفالت سے چشم پوشی کے حوالے سے...... بغیر بتائے تو مجھ پر کسی کا ایک پیسہ بھی حرام ہے۔ ہاں، بھابھی بیگم، کو مشورہ ضرور دوں گا کہ ہر چھ ماہ بعد فصل سے آنے والی یہ رقم بچیوں کی شادی اور جہیز کی مد میں جمع کرتی جائیں۔" کچھ سوچ کر وہ بولے تھے۔

"ہاں جی! کر لی آپ نے بات اور مان لیا آپ کی بھابھی بیگم نے آپ کا مشورہ، جیسے جانتے ہی نہیں ہیں خاتون کو...... سرسوں کے تیل سے لے کر سبزی تک اور موسم کے پھلوں سے لے کر کھجوروں تک گھر میں زمینوں سے بعد میں چیزیں پہنچتی ہیں۔ آپ کی بھاوج پہلے تیار کھڑی ہوتی ہیں میکے پہنچانے کو...... بے وقوف عورت دونوں ہاتھوں سے لٹائے جا رہی ہے بچیوں کا حق اور پتا نہیں کیسے بے غیرت بھائی، بہنیں ہیں۔ حق سمجھ کر وصول کرتے ہیں۔ ہاں بھئی جب دینے والے نہیں سوچ رہے تو لینے والے کیوں تردد کریں۔"

وہ چڑ کر اپنا تکیہ سیدھا کرنے لگیں۔

"اچھا صدیقہ بیگم! آپ نہ تو غیبت کر کے اپنی عاقبت خراب کریں نہ ہی منفی باتیں سوچ کر پریشان ہوں...... سوچتے ہیں کچھ اس بارے میں بھی......"

انہوں نے بات ختم کر کے دوبارہ سے کتاب اٹھالی تھی۔

☆☆☆

"اے ثانی! تم کیوں بت بنی بیٹھی ہو...... ذرا یہ سامان ہی سمٹوالو۔ اس بار تو ٹرین پر سفر کرنے کا دل تھا میرا...... یہ ساتھ والا بلو ٹکٹیں بھی گرا آیا ہے۔ اب ذرا ہل بھی لو...... کب سے میں اکیلی ہی لگی پڑی ہوں۔ اس گونگی کو تو ٹی وی کے عشق نے نکما کر چھوڑا ہے، صبح ٹی وی، شام ٹی وی، کتنی بار مدد کرنے کے اشارے کر آئی ہوں پر مجال ہے۔ جو ٹس سے مس ہو جائے، ادھر تم اینٹھی بیٹھی ہو۔"

وہ کھجوروں اور آموں کے حوالے سے بات کر رہی تھیں۔ جو تایا ابا کل ہی زمینوں سے لائے تھے

pklibrary.com

اور اماں نے آج ہی رخت سفر باندھ لیا تھا۔ انہیں
خیال آرہا تھا کہ پورا ایک ماہ ہو گیا تھا انہیں میکے سے
آئے ہوئے۔

"اماں! اس بار میرا موڈ نہیں بن پارہا جانے کا،
چھٹیوں کے بعد میرے امتحان ہیں۔ اور میری ذرا
تیاری نہیں ہے پھر مجھے تایا جان نے بھی منع کیا تھا کہ
تمہاری ماں ہزار بار جائے، اس کا میکہ ہے وہاں، تم
دونوں مت جایا کرو...... اچھا نہیں لگتا۔"

"ارے میرا میکہ ہے تو تمہارا ننھیال ہے
وہاں...... کوئی غیر تھوڑی ہیں وہ...... تمہارے تایا ٹھہرے
سیدھے سادھے آدمی...... یہ ساری پٹیاں تمہاری تائی کی
پڑھائی ہوئی ہیں۔ خود کا تو میکے کے نام پر کوئی رشتہ نہیں
ہے۔ ہم سے بھی جلتی ہے وہ...... اور بے وقوف! میں تو
تم دونوں کو وہیں نپٹانا چاہتی ہوں۔ ایک بار تم دونوں کی
شادی ہو جائے تو میں بھی وہیں رہوں گی تم لوگوں کے
ساتھ، اب اٹھ بھی جاؤ۔ ان لوگوں کی باتیں سن لیا کرو
بس...... عمل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلو آجائے گا
بارہ بجے تک ٹیکسی لے کر۔"

انہوں نے حسب معمول تایا جی کی بات کو ہنسی
میں اڑایا۔ ثانیہ کو بھی ان کی بات شاید سمجھ میں آ گئی
تھی۔ جب ہی اچھل کر کھڑی ہو گئی اور ان کی مدد
کرنے لگی۔ دل میں اگرچہ تایا جی کی بات نہ ماننے کا
ہلکا سا ملال بھی تھا مگر اماں نے اس بار پروگرام ہی اتنا
زبردست بتایا تھا...... روبی کی منگنی ہونے والی تھی۔
شیراز کے بیٹے کا عقیقہ ان کے انتظار میں رکا ہوا تھا۔
فنکشنز کے لیے خالہ نے کہا تھا کہ کپڑے وغیرہ مت
بنوائیں، انہوں نے بنوا لیے ہیں۔ بس وہ آنے کی
کریں۔ ڈر کے مارے ثانیہ تو تائی جان کے گھر بھی
بتانے نہیں گئی کہ وہ آج جا رہے ہیں۔ ایسا اسے اماں
نے کہا تھا۔ اور گھر سے جاتے ہوئے اماں نے گھر کی
چابی بلو کو پکڑائی تھی کہ تائی جان کو دے آئے گا۔

☆☆☆

خالہ کے گھر آ کر وہ لوگ سب کچھ بھول بھال گئی
تھیں۔ نانی کے اس وسیع و عریض گھر میں دو خالائیں اور
دو ماموں اپنی اپنی آل اولاد کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔
ان کے آتے ہی عقیقے اور منگنی کا دن بھی مقرر
کر لیا گیا تھا۔ خالہ نے ان ماں بیٹیوں کے بہت خوب
صورت کپڑے بنوائے تھے۔ ان کا قیام بھی زیادہ تر بڑی
خالہ کے گھر ہوتا تھا اور اماں سے آج تک سب سے
زیادہ مالی فائدے بھی انہوں نے ہی حاصل کیے تھے۔
بڑی خالہ کے دو بیٹے، دو بیٹیاں تھیں۔ ایک بڑی بیٹی
ماموں کے گھر بیاہی ہوئی تھی۔ اسی کے بیٹے کا عقیقہ اور
خالہ کی دوسری بیٹی کی منگنی تھی۔

مدثر خالہ کا تیسرے نمبر پر والا بیٹا تھا اور ثانیہ کو
بہت پسند کرتا تھا۔ وہ پڑھ رہا تھا جبکہ بڑا بیٹا صرف
مڈل تک پڑھا تھا اور ایک ورکشاپ کھول لی تھی۔ اماں
کو کچھ کچھ مدثر کی پسند کا اندازہ تھا۔ ارادہ تو یہی تھا کہ
جیسے ہی بڑی خالہ ثانیہ کے لیے مدثر کا رشتہ مانگیں گی
وہ گونگی کو بھی مزمل سے بیاہنے کی بات کریں گی کیونکہ
ایک تو اماں نے اس کو اپنی ورکشاپ لگانے میں سرمایہ
فراہم کیا تھا۔ پھر وہ خالہ، ماموں کے بچوں میں ایک تو
واجبی شکل وصورت کا مالک تھا پھر بچپن میں پولیو کا شکار
ہو جانے کے باعث ایک ٹانگ میں لنگ بھی تھا۔

امید یہی تھی کہ بڑی خالہ ان کی بات مان
جائیں گی کیونکہ اماں بارہا یہ بات اپنے بہن بھائیوں
کو سنا چکی تھیں کہ وہ اپنے دامادوں کو اپنا گھر گفٹ
کریں گی، پھر رانیہ، ثانیہ سے زیادہ خوب صورت تھی
بالکل اماں کی طرح، جبکہ ثانیہ ابا کے اوپر گئی تھی۔ اور تو
اور ابا کی وفات کے بعد ان کے دفتر سے ملنے والی فنڈ
کی تمام رقم اماں نے خالو جی کے ہاتھ پر دھر دی تھی
کیونکہ ان دنوں ان کا کاروبار خسارے میں جا رہا تھا۔
وہ یہی سوچتی تھیں۔ کہ بہنیں اکٹھی خوش رہیں گی۔
بس خالہ کے منہ سے بات کے نکلنے کا انتظار تھا۔

☆☆☆

لیکچرر شپ اس کا بہت پہلے دیکھا جانے والا
خواب تھا جس کی تعبیر اسے آج سات سال کے طویل
انتظار کے بعد ملی تھی۔ یہ خواب اس نے تب دیکھا تھا
جب چھوٹے پیمانے پر ٹیوشن کا آغاز کیا تھا اور پھر

pklibrary.com

ٹیوشن سے اکیڈمی تک کے سفر نے اس کی لیکچرر شپ کی تحریک میں مہمیز کا کام دیا تھا۔ تایا جان نے گلے سے لگا کر اس کی پیشانی چومی اور مبارک باد دی تھی۔ تائی صدیقہ بھی کھلی پڑ رہی تھیں۔

"بس میں تو آج ہی عرفانہ سے بات کرتی ہوں ردا کے لیے...... ماشاء اللہ سے وہ سارے گن ہیں اس میں جو میں اپنی اکلوتی بہو کے حوالے سے چاہتی تھی۔ بہت انتظار کیا ہے میں نے اس دن کا...... اچھی لڑکی ہے۔ اور ایسی بچیاں زیادہ دیر ماں باپ کے گھر نہیں بیٹھی رہتیں۔ اس سے پہلے کہ کوئی اور سوال ڈالے۔ میں کہتی ہوں، میں ہی اس بچی کا ہاتھ مانگ لوں۔"

تائی صدیقہ نے میز پر ٹرے لا کر رکھی جس میں چائے کے تین کپ اور مٹھائی کی ایک پلیٹ رکھی تھی جو رضا گھر آتے ہوئے لایا تھا۔ چائے کے کپ میاں اور بیٹے کو پکڑا کر وہ خود بھی بیٹھ چکی تھیں۔ رضا نے چائے کا کپ میز پر رکھ دیا اور ہراساں نظروں سے ماں کو دیکھتے ہوئے گویا ہوا۔

"نہیں امی! آپ ایسا کچھ نہیں کریں گی۔"

"کیوں بھئی؟ کیوں نہیں کروں گی۔ ہر ماں جیسے ہی اپنے بچوں کو گود میں لیتی ہے نجانے کتنے خواب اس کی آنکھوں میں سج جاتے ہیں اور ایک کٹھن اور طویل وقت گزارنے کے بعد جب یہ ارمانوں بھرا دن میری زندگی میں آیا ہے تو کیوں نہ میں اپنے خواب پورے کروں......"

ان کے نروٹھے پن کو دیکھتے ہوئے رضا نے مدد طلب نظروں سے باپ کی طرف دیکھا۔ وہ شاید اس کا مطلب سمجھ چکے تھے اور خواہش بھی۔ جب ہی ایک خاموش تسلی بھرا اشارہ بیٹے کو کیا اور چائے کا خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے بیٹے کی وکالت کے لیے میدان میں آگئے۔

"ثمینہ کی ماں! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں اور آپ کو اپنے ارمان پورے کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔ ضرور پورے کریں مگر شاید آپ کو یاد ہو کہ بھائی مرحوم اکثر ایک خواہش کا اظہار کیا کرتے تھے کہ ہم دونوں بھائی آپس میں بچوں کے رشتے کی دوڑ میں بندھ کر مزید مضبوط ہو جائیں اور یقیناً میں بھی ایسا ہی چاہتا تھا اور ہوں...... جب گھر میں بچیاں ہوں تو میرا نہیں خیال کہ باہر رشتے کے لیے یہاں وہاں منہ ماری کرنے کی ضرورت ہے۔"

"کچھ نہیں بھولی میں اکرم صاحب! ارے میں تو رانیہ کو بھی بہو بنا لیتی اگر جو آپ کی بھاوج کے کچھن ٹھیک ہوتے۔ بارہا سمجھایا کہ بی بی! اولاد اور وہ بھی بیٹی ہو تو عورت عمر بھر پل صراط جیسے بال برابر باریک تار پر چلتی ہے کہ اس کا اٹھایا گیا ایک غلط قدم، غلط تربیت کا ایک غافل پہلو اس کو بیٹی سمیت ایسے جہنم میں گرا دیتا ہے۔ جس کی گہرائی اور اندھیرے کا کوئی انت نہیں۔

ارے اللہ تو رحمان ہے کریم ہے، معاف کرنا اس کی صفت ٹھہرا۔ گناہ گاروں کے پہاڑ برابر گناہوں کو ایک توبہ کے آنسو کے عوض جہنم کی آگ جنت کی ٹھنڈک اور سکون میں بدل دیتا ہے پر یہ جو ہم انسان ہیں ناں اپنے سب عیب، گناہ غلطیاں نظر انداز کر کے عمر بھر اس ٹوہ میں رہتے ہیں کہ کوئی غلطی کرے اور ہم اسے اس کا گناہ بنا کر اس دنیا کو اس کے لیے جہنم بنا دیں...... مگر نہ جی اس عورت کو نہ بھائی جی کی ناگہانی موت نے بدلا نہ دو بیٹیوں کی ذمہ داری نے...... چلو مان لیا میں آپ کی یہ خواہش مان بھی لیتی ہوں تب کیا گارنٹی ہے کہ ثانیہ اپنی ماں والی روش پر نہیں چلے گی۔ وہی طور طریقے اور چال چلن نہیں اپنائے گی۔ رہنے دیں میاں! میں نے نہ اپنا گھر بار برباد کرنا ہے نہ اپنی نسل......"

وہ تو گویا پھٹ ہی پڑی تھیں۔

"دیکھو ثمینہ کی ماں! ثانیہ ابھی کم عمر ہے اور بچیوں میں تو ویسے بھی بہت گنجائش ہوتی ہے رویوں اور رشتوں کو نبھانے کی...... جب آپ جیسی ساس کے زیر تربیت آئے گی تو ویسا ہی ماحول اپنائے گی جیسا اپنے اردگرد دیکھے گی۔ جیسا آپ بتائیں گی......"

"ہونہہ...... اس کی ماں نہیں سیکھی عمر بھر تو وہ کہاں سے سیکھ لے گی...... پچھلے ہفتے میرے سامنے

pklibrary.com

منع کیا تھا ناں آپ نے کہ اس بار نہیں جائے گی نانی کے گھر، کہنا مانا اس نے آپ کا۔"
ان کی رسان سے کہی ہوئی بات کے جواب میں وہ چمک کر بولی تھیں۔ رضا کو اس پل ثانیہ کی ہٹ دھرمی پر جی بھر کرتا ؤ آیا تھا۔ کیا تھا جو وہ ابا کی بات کا مان رکھ لیتی۔
"کیا ناں بھئی! ابھی کم عمر ہے اور یہ عمر ایسی ہی لاپرواہ ہوتی ہے۔ ابھی اس کا فرض نہیں بنتا کہ وہ ہمارے گھر کے اصولوں کی پیروی کرے...... پھر اس دن وہ ذکر کر رہی تھی کہ کوئی فنکشنز وغیرہ ہیں ان کے ہاں...... بہرحال خوب سوچ سمجھ لیجیے کہ یہ صرف میری ہی نہیں آپ کے بیٹے کی بھی خواہش ہے اور ہم اپنی عمر گزار چلے ہیں۔ ہمیں کوئی حق نہیں ہے کہ اپنی زبردستی کی پسند اپنے بچوں کے سر پر مسلط کر کے ان کا مستقبل خراب کریں بلکہ زندگی بھی......"
گھٹنوں پر زور دے کر وہ حتمی انداز میں کہتے وہاں سے اٹھ گئے تھے۔ تائی صدیقہ نے اپنا روئے سخن رضا کی طرف موڑا جو سر جھکائے بالکل خاموش بیٹھا اپنے باپ کی بات کی تائید کر رہا تھا، اس کے سامنے پڑی چائے ٹھنڈی ہو گئی تھی جسے اس نے باقاعدہ فرمائش کر کے بنوایا تھا کہ مٹھائی کے ساتھ چائے پی کر وہ ماں باپ کے ساتھ اپنی خوشی بانٹنا چاہ رہا تھا۔
"کیا تمہارے ابو ٹھیک کہہ رہے ہیں رضا!"
کسی موہوم سی امید کے تحت انہوں نے پوچھا تھا کہ ہو سکتا ہے یہ صرف ان کے شریک حیات کا خیال ہو اور وہ انکار کر دے مگر اس نے آہستہ سے جی امی کہہ کر دوبارہ سر جھکا لیا تو تائی صدیقہ طویل سانس لے کر رہ گئیں۔

☆☆☆

زندگی میں پہلی بار رضا نے اس کو کال کر کے خوب سخت سنائی تھیں کہ جب اس نے اور تایا جان نے اسے وہاں جانے سے منع کیا تھا تو وہ کیوں گئی۔
"تم نے اور تایا جان نے بغیر وجہ کے جانے سے منع کیا تھا رضا! اور یہاں ایک نہیں دو، دو وجوہات تھیں آنے کی وہ بھی بڑی اہم اور خوب صورت۔"
اب وہ اسے یہاں ہونے والے فنکشنز کی تفصیلات بتا رہی تھی جن سے رضا کو قطعاً کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ایک دو اور باتوں کے بعد اسے سختی سے جلدی آنے کی تاکید کر کے فون بند کر دیا تھا۔ پتا تھا کہ وہ لوگ ایک بار ننھیال جاتے تو واپس آنا بھول جاتے تھے اور آج کل تو ویسے بھی ثانیہ کے کالج کی چھٹیاں تھیں ورنہ طوعاً و کرہاً ثانیہ کے کالج کے لیے آنا ہی پڑتا تھا وہ بھی جب تایا جان فون کر کے ثانیہ کی پڑھائی کے حرج کے بارے میں بتاتے تھے۔ لمبے بالوں میں گھنگھرو والا پراندہ لٹکائے وہ آج روایتی گھاگھرا چولی میں ملبوس تھی اور نیچے نیٹ ورک کمزور ہونے کے باعث سگنل کی کمی تھی۔ سو وہ رضا کا فون سننے چھت پر آئی تھی۔ واپس سیڑھیاں اترنے سے پہلے کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی جانب رخ کیا تھا۔
"ٹھیک ہے بھئی۔ خوب صورت لوگوں کا اترانا حق بنتا ہے مگر اتنا بھی نہیں کر چاہنے والوں کو ستا کے رکھ دیا جائے۔" وہ مدثر تھا جو نجانے کب سے اس کے اکیلے ہونے کا موقع تلاش کر رہا تھا۔ اس نے اسے لا کر چھت پر بنی چھوٹی سی منڈیر پر بٹھایا اور خود اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ نیچے روشنیوں سے سارا گھر جگمگا رہا تھا۔ ثانیہ مبہوت ہو کر نیچے دیکھنے لگی۔
"محترمہ! میں نے آپ کو ارد گرد کے نظاروں سے لطف اٹھانے کے لیے نہیں بٹھایا بلکہ کچھ باتیں کرنا چاہ رہا تھا بہت ضروری......"
ثانیہ چونک کر سیدھی ہو بیٹھی۔
"ہم۔ بولو...... کیا کہنا ہے۔"
"شاہد ماموں نے اماں سے بات کی ہے۔ وہ زرقا کی شادی مجھ سے کرنا چاہتے ہیں مگر میں نے بہت پہلے سے تمہارے بارے میں سوچا ہوا ہے۔ اماں بھی ایسا ہی چاہتی ہیں۔ ماموں اپنی مین مارکیٹ والی دکانیں بھی میرے نام کرنے کو تیار ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ سلامی میں مجھے گاڑی بھی دیں گے۔ ان سب باتوں میں میرے لیے کوئی کشش نہیں ہے کیونکہ جتنی

pklibrary.com

محبت میں تم سے کرتا ہوں، اس کے سامنے یہ گاڑی، بنگلے سب ہیچ ہیں۔

"اوہ گڈ......" ثانیہ کا خوشی سے چہکنا مدثر کی سمجھ میں نہیں آسکا۔

"میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری ہوگئی۔"

"تم...... تم بھی مجھ سے ایسی ہی محبت کرتی ہو، جیسی میں کرتا ہوں۔"

مدثر نے اس کے مہندی سے رنگے نرم و نازک ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر خوشی سے کہا۔

"نہیں بھئی! میں یہ محبت شحبت والے مشکل مشکل کاموں سے گھبراتی ہوں۔ لیکن مجھے اندازہ تھا کہ تم مجھے پسند کرتے ہو۔ ایسے ہی تو نہیں اتنے مہنگے مہنگے گفٹس لا کر دیتے ہو، جتنے دن یہاں ہوتی ہوں، روز آئس کریم کھلانے لے جاتے ہو۔ میں تو یہ سوچ کر خوش ہو رہی ہوں کہ میری ہمیشہ سے خواہش تھی کہ میری شادی عام روایتی سی شادی نہ ہو۔ اس میں خوب مار دھاڑ ہوں...... آخری دم تک یہ شادی نہیں ہوسکتی والے معاملات ہو......" تاکہ اپنی شادی کی سالگرہ ہمیں عمر بھر بھلائے نہ بھولے......"

وہ اپنی خواہشات جو اس سے پہلے رضا کو بھی بتا چکی تھی بڑے جوش سے بتا رہی تھی۔ مدثر طویل سانس لے کر رہ گیا مگر اس ساری گفتگو کے دوران مدثر اسے بے حد قریب کر چکا تھا اور ہر ہونے والی ملاقات کی طرح اس بار بھی اسے اپنی محبت کا احساس دلا رہا تھا۔ رات گئے جب وہ نیچے آئی تو فنکشن عروج پر تھا۔

"کہاں رہ گئی تھیں ثانی! میں کتنی دیر سے تمہیں ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔"

اماں کو وہ بہت دیر سے نظر آئی تھی اس لیے پوچھ بیٹھیں۔ عموماً وہ بیٹیوں سے جیسے اپنے سسرال میں غافل ہوتی تھیں۔ یہاں میکے آکر اس سے دس گنا زیادہ ہو جاتی تھیں۔ نہیں جانتی تھیں کہ ماؤں کی غفلت بیٹیوں کے لیے کیسی کیسی قباحتیں لے کر آتی ہے۔ ابھی ثانیہ کوئی جواب سوچنے ہی لگی تھی کہ وہ دوسری طرف بھی مڑ گئی تھیں۔ ثانیہ نے سکون کی سانس لی تھی۔

☆☆☆

"اماں...... سنیں اماں......"

اس نے غنودگی میں جاتی ماں کا بازو پکڑ کر ہلایا تھا۔ ساجدہ چونکی تھیں۔

"کیا تکلیف ہے تمہیں ثانی! سونے بھئی......"

ساجدہ کی آواز خمار آلود تھی۔

"بعد میں سو لینا۔ ابھی میری بات سنو۔"

اس نے اماں کا رخ زبردستی اپنی طرف موڑا تھا۔

"کیا ہے بھئی! صبح بھی تو بتائی جاسکتی تھی بات، نیند سے اٹھا دیا مجھے......" وہ جماہی لے کر ناگواری سے بولی تھیں۔

"میری بات سن لیں گی تو ساری نیند اڑ جائے گی آپ کی!" وہ تجسس دلانے والے انداز میں بولی تھی۔

"بول بھی دو ثانی اب...... پوری فلم ہی بنا ڈالی تم نے تو......"

ساجدہ کا انداز بے زاری لیے ہوئے تھا، تاہم ان کی نیند اب اڑ چکی تھی۔

"مدثر کہہ رہا تھا کہ شاہد ماموں خالہ پر دباؤ ڈال رہے ہیں، زرقا کا رشتہ لے لیں مدثر کے لیے۔ وہ اپنی دکانیں بھی مدثر کے نام کرنے کا کہہ رہے ہیں وہ تو مدثر اڑا ہوا ہے شادی کروں گا تو ثانی سے نہیں تو کروں گا ہی نہیں۔"

ثانیہ کا انداز فخریہ تھا۔ ساجدہ کی آنکھیں پوری کھل گئی تھیں۔

"ہمم!"

انہوں نے کچھ سمجھتے ہوئے لمبی سی ہمم کی تھی۔

"یہ شاہد کی نہیں تیری مامی کی پلاننگ لگ رہی ہے ثانی مجھے...... اس کی بڑی نظر ہے مدثر پر...... ارے میں بہن ہوں خالدہ آپا کی۔ میرا حق زیادہ ہے مدثر پر پھر زرقا میں رکھا کیا ہے نہ شکل نہ رنگ روپ...... بس آپا بات کرتے ہوئے ذرا جھجک ہو رہی ہے مجھے...... تو کر، مدثر کو پکا کر لے کہ وہ ماں سے بات کرے۔

صرف تیری بلکہ گونگی کی بھی۔ آخر کو ابا کے حصے کی میرے والی جائیداد، اس مکان میں حصہ، میں نے کچھ بھی نہیں لیا صرف اس لیے کہ میرے، بہن بھائی ہیں اور بہن بھائی میں کیا تیرا میرا...... یہ دکانیں کیا تیری مامی میکے سے لائی تھی۔ ہمارے باپ نے خریدی تھیں۔ شاہد بھائی کا رونا نہیں دیکھا گیا تھا۔ مجھ سے۔ جب تیرے خالو نے اپنے حصے کی رقم مانگ لی دکان میں سے۔ اچھا خاصا خسارا آ گیا اس کو...... میں نے کہا چلو میری خیر ہے۔ ابھی میرا حصہ رہنے دے اپنے کاروبار پر دھیان دے۔ شاہد بھی کبھی میری بیٹی کے حق میں ڈاکا نہیں مار سکتا اور آپا کے جس کمرے میں مزمل رہتا ہے، وہ ابا کے مکان میں سے میرے حصے کا ہے جو آپا کے تصرف میں ہے۔ میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ تیرے ساتھ ساتھ گونگی بھی نبٹ جائے، اس لیے جس نے جو کہا، جو لے لیا۔ جو دے دیا میں نے کچھ نہیں کہا۔ اب تو اس نئی بات نے مجھے فکر میں مبتلا کر دیا ہے۔ تو بس مدثر سے بات کر فوراً۔ اس سے پہلے کوئی اور بات کرے......"

ثانیہ ماں کی بات سنتے ہوئے سر ہلا رہی تھی۔

☆☆☆

بارہویں دن وہ تینوں گھر لوٹ آئی تھیں۔ ثانیہ نے مدثر سے بات کی تھی اور اس نے یقین دلایا تھا کہ خالدہ خالہ جلد ہی ان کے رشتے کی بات ساجدہ سے کرنے والی تھیں مگر پہلے ان کا بیٹی کو بیاہنے کا ارادہ تھا جس کی منگنی پر وہ لوگ آئے تھے۔ اور حیرت کی بات تھی کہ زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ ان کے بہاولپور سے واپس آنے کے بعد نہ تو تائی صدیقہ نے جھانک کر دیکھا تھا نہ ہی کھانا بھیجا تھا۔

ہمیشہ ایسے ہی ہوتا تھا کہ وہ سفر سے تھکی ہوئی ہوتیں تو عموماً کھانا باہر سے منگوا لیا کرتی تھیں مگر تائی صدیقہ نے ایک بار ٹوک دیا تھا کہ گھر میں عورتوں کے ہوتے ہوئے کھانا باہر سے آئے یہ ان کے گھر کا رواج نہیں تھا اور یہ اصول ان کی ساس کے دور سے ان کے گھر میں رائج تھا۔ یہ اور بات تھی کہ ان کی مرحومہ ساس کے اصولوں کی پاس داری صرف صدیقہ ہی کرتی تھیں۔ ساجدہ کا تو شروع سے یہی وتیرہ تھا جواب تک ویسے ہی تھا۔

"اے ثانیہ! پیسے لے کر چلی جا، گڈو کو کہہ کر کچھ منگا لے۔ کھا کے کچھ آرام کریں گے پھر شام کی دیکھ لیں گے کہ کیا کرنا ہے۔ تیری تائی کو تکلیف ہوگی کہ اس کے چرن چھوئے بغیر جو چلے گئے بہاولپور...... اس لیے پوچھا بھی نہیں جھانک کے کہ تھکے ہارے آئے ہیں، پانی ہی پوچھ لوں، حالانکہ تالا کھلنے سے لے کر جھاڑو لگانے تک کی آوازیں آتی ہیں۔"

"اچھا اماں! ہم کون سا کسی کے کھانے کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ لائیں مجھے دیں پیسے، میں گڈو کو پیسے دے آؤں۔"

ثانیہ بے زاری سے بولی تھی۔ ساجدہ سر ہلاتے پیسے لینے اندر بڑھ گئیں جبکہ رائنہ اتنی تھک گئی تھی کہ زندگی میں پہلی بار ٹی وی کے سامنے بیٹھنے کے بجائے جا کر کمرے میں سو گئی تھی۔

سارا گھر دھول مٹی سے اٹا پڑا تھا۔ ساجدہ نے بٹوے سے پیسے لا کر ثانیہ کو دیے اور خود دوپٹے سے گرد جھاڑ کر برآمدے میں تخت پر بیٹھ گئی تھیں۔ ثانیہ نے دوپٹہ اوڑھا اور باہر گلی میں نکل آئی تھی۔ سامنے سے رضا آتا دکھائی دیا تھا۔ وہ ابھی اسے ناراضی بھرا تاثر دینا چاہتی تھی کہ وہ انجان بنا اس کے پاس سے گزر کر ان کے گھر کے بالکل پاس والے اپنے گھر کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔

"ہونہہ...... نہ تو نہ سہی...... مجھے بھی کوئی پروا نہیں ہے۔"

پیر پٹخ کر خود سے کہا اور گڈو کے گھر آ گئی۔ گڈو شاید گھر میں اکیلا تھا جو اس کو دیکھ کر اس کی باچھیں کھل گئی تھیں۔

"ارے سوہنیو! کہاں رہ گئے تھے اتنے دن؟" نگاہیں بند دروازے کا دیدار کر کے اور ٹانگیں تمہاری گلی کا چکر لگا لگا کر شل ہو گئیں۔"

وہ اس کے بالکل قریب چلا آیا تھا۔

"نانی کے گھر گئے تھے۔ تم نے ہی تو لا کر دی

pklibrary.com

تھیں تکٹیں، اب بنومت اور یہ پیسے پکڑو اور نکڑ والے ہوٹل سے نان اور مرغ کڑاہی لا دو...... ابھی واپس آئے ہیں تو کچھ پکانے کی ہمت نہیں ہو رہی۔'' اس نے تڑخ کر کہا۔ گڈو نے اس کے ہاتھ سے پیسے پکڑتے ہوئے اس کا ہاتھ ہلکا سا دبا کر چھوڑ دیا تھا۔

''بدتمیز نہ ہو، ہر وقت کا شوخا پن مجھے پسند نہیں ہے۔''

وہ ہاتھ جھٹکتے ہوئے کچھ ایسے انداز میں بولی تھی کہ انداز میں ناگواری تو ہرگز نہیں تھی ہی نہ غصہ بس بے زاری تھی جیسے اس نے اس کے اس عمل کو روز مرہ کا ایک عمل لیا ہو۔

''تم چلو! میں ابھی آیا اور بوتل بھی لا رہا ہوں جو میری طرف سے ہوگی۔ آخر کو اتنے دن بعد گھر آئے ہیں پروہنے......''

ایک آنکھ میچ کر کہتا وہ ہنسا تھا۔

''دفع دور! ہر وقت کا لچر پن۔''

اس کو ہلکا سا دھکا دیتی وہ باہر نکل آئی تھی۔

☆☆☆

وہ شام کو ساجدہ کے کہنے پر ہی تائی صدیقہ کے گھر آ گئی تھی کہ پتا تو کر کے آئے کہ آخر تائی کے گھر اتنی خاموشی کیوں ہے اور رضا کا دوپہر کو بغیر بولے اس کے پاس سے گزر جانا بھی اسے کھل رہا تھا۔ مگر گھر میں داخل ہوتے ہی وہ ٹھٹھک کر رک گئی تھی کہ صحن کے بیچ و بیچ صاف ستھرے بستر پر لیٹے کمزور سے تایا ابا...... سائیڈ ٹیبل پر پڑی دوائیوں کا ڈھیر۔ ان کے پاس دو کرسیوں پر موجود صفیہ پھپھو اور امجد پھپھا جو تایا اور اس کے ابا کی خالہ زاد بہن اور بہنوئی تھے اور چارپائی پر پریشان بیٹھی تائی صدیقہ تھیں۔ رضا اپنی اکیڈمی والے پورشن میں تھا یقیناً کیونکہ یہ وقت اس کا وہاں گزرتا تھا جو گھر کے دوسرے حصے میں تھی اور اب جب سے اکیڈمی کا کام بڑھا تھا! رضا نے تین نیچے کے کمروں پر دو اور کمرے بھی اضافی ڈلوا دیے تھے اور اکیڈمی والا پورشن گھر سے بالکل الگ کر دیا تھا۔

''ارے میری بیٹی آئی ہے۔ میری ثانی......''

تایا ابا اسے دیکھ کر اٹھنے لگے تھے۔

''لیٹے رہیں آپ...... ابھی آپ نے کچھ دن بالکل حرکت نہیں کرنی۔''

تائی صدیقہ بے چین ہو کر اٹھتے ہوئے بولی تھیں۔

''ٹھیک ہوں بھئی میں اور اپنی بیٹی کو دیکھ کر تو بالکل ٹھیک ہو گیا ہوں۔''

تایا ابا خوش دلی سے بولے تھے۔ ثانیہ جو بت بنی کھڑی تھی، سب کی توجہ اپنی طرف مرکوز دیکھ کر ذرا گھبرا گئی تھی۔ اس سے کچھ بولا نہ جا سکا تھا۔ تاہم ہلکا سا سلام کرتے وہ آگے بڑھ آئی تھی۔

''خیر ہے میکے گئی ہوگی ساجدہ جو اتنے دن سے نظر نہیں آئی تھی۔''

صفیہ پھپھو نے یقیناً طنز کہا تھا مگر ثانیہ پر کون سا اثر ہونا تھا۔ وہ جگہ بنا کر تایا ابا کے پاس بیٹھ گئی تھی۔

پھپھو صفیہ اور تائی صدیقہ آپس میں دھیمی آواز میں بات کرنے لگی تھیں شاید ساجدہ ہی زیر بحث تھیں۔ پھپھا جان چاروں نفوس کو آپس میں مصروف دیکھ کر اپنا موبائل نکال کر تھوڑی دور چلے گئے تھے شاید کوئی کال کرنی یاد آ گئی تھی۔

''کیا ہوا ہے آپ کو......؟''

جو بھی تھا ثانیہ دل سے تایا ابا کا احترام کرتی تھی۔

''کچھ بھی نہیں ہوا۔ بس یہ دل ذرا شرارت پر اتر آیا ہے۔ تم بتاؤ نکمی لڑکی! نانی کے گھر جا کر سب کچھ بھول جاتی ہو، تایا ابو کو بھی اور اس بار تو مل کر بھی نہیں گئیں۔''

وہ ہلکے سے شکوے کے ساتھ بولے تھے۔ ثانیہ شرمندہ ہو کر رہ گئی تھی۔

''بس وہ تایا ابا!''

''اچھا یہ بتاؤ، رانیہ کیسی ہے؟ اسے بھی لے آتیں۔''

وہ اس کو شرمندہ نہ دیکھ سکے تھے سو بات بدل دی تھی۔

''آئے گی تایا ابا! جب آپ کی طبیعت کا پتا چلے گا۔ میں تو ویسے ہی چکر لگانے آ گئی تھی۔''

pklibrary.com

پھر وہ جو پانچ منٹ کا کہہ کر گئی تھی۔ تایا ابا کے ساتھ وقت گزرتے پتا ہی نہیں چلا تھا اور وہ عصر کی گئی مغرب کو واپس آئی تھی، اس خبر کے ساتھ کہ تایا کو دس روز پہلے ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ وہ ایک ہفتہ ہاسپٹلائز رہے تھے اور پرسوں ڈسچارج ہو کر آئے تھے۔

☆☆☆

"اے ثانیہ! میں جا رہی ہوں تمہارے تایا کی طبیعت پوچھنے، ماسی آئے تو سر پر کھڑے ہو کر کام کرالینا کم بخت ماری سر پر نہ رہو تو اوپر اوپر ہاتھ مار کر چلی جاتی ہے۔ رات کچھ ڈھونڈتے ہوئے تخت کے نیچے نظر پڑ گئی میری۔ اتنا کوڑا تو اسی کے نیچے نظر آیا۔ کہنا اماں کہہ کے گئی ہیں کہ پلنگوں، صوفوں کے نیچے جھاڑو مار کے سارا کوڑا نکالے باہر، اور گونگی کو دیکھ لینا ذرا، ابھی تک سو رہی ہے۔ طبیعت کا پوچھ لینا۔"

ساجدہ نے جاتے جاتے کئی کام اس کے ذمہ لگائے تھے جن میں آدھے اس نے سنے تھے آدھے مدثر سے چیٹنگ میں اس کے سر پر سے گزر گئے تھے۔ تخت پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے وہ ٹانگیں نیچے لٹکائے مدثر کے ساتھ مصروف تھی جب رسمی سی دستک دے کر گڈو اندر آ گیا تھا۔

"خالہ کدھر ہیں؟"

"تایا ابا کے گھر گئی ہیں۔ کوئی کام تھا؟"

اس نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر گڈو کو دیکھا تھا جو پرشوق نظروں سے اس کو دیکھ رہا تھا۔

"ہاں کام تو تھا پر اب وہ نہیں ہیں تو......"

وہ سر کھجا کر بولا تھا کہ اب کوئی بات ذہن میں آ نہیں رہی تھی۔ اصل میں وہ گھر سے نکل ہی رہا تھا کہ ساجدہ کو برابر والا دروزہ کھول کر اندر جاتے دیکھا تھا۔ پتا تھا کہ دروازہ بھی بہت کم ہی بند ملتا تھا ان کا، سو موقع غنیمت جان کر وہ اندر چلا آیا تھا۔

"کیا ہے بھئی! جو بھی کام ہے، بتاؤ نہیں تو شام کو آ جانا۔"

اس کے مسلسل کھڑے رہنے پر وہ جھنجلا کر بولی تھی کہ گڈو کی موجودگی کا احساس تھا جو اسے مدثر کی طرف پوری طرح متوجہ ہونے سے روک رہا تھا۔

"ا...... اچھا چلو پھر آتا ہوں شام میں خالہ کے پاس، تم نے کچھ کھانا ہے تو بتاؤ...... لے آتا ہوں۔"

اس نے دانہ پھینکا تھا۔

"ہمم! دل تو کر رہا ہے فرید بابا کا مرغ پلاؤ کا بڑا پسند ہے مجھے...... وہ کھلا دو، میں ابھی پیسے لاتی ہوں۔"

چہک کر کہتی وہ اٹھ کھڑی ہوئی، موبائل ہاتھ میں ہی تھا۔

"ابھی اتنے برے دن نہیں آئے گڈو کے کہ آفر بھی کچھ کھلانے کی خود کرے اور پیسے بھی اگلے سے لے۔ ابھی لایا۔ دروازہ کھلا رکھنا۔" گڈو بظاہر برا مان کر بولا تھا۔

"اچھا بھئی! لے آؤ۔ جلدی آنا۔ بھوک لگی ہے ناشتا بھی نہیں کیا میں نے ایک کیک رسک کھایا تھا ابھی چائے کے ساتھ، وہ تو کب کا ہضم ہو گیا۔"

"ارے! تم نے ابھی پلکیں بھی نہ جھپکی ہوں گی کہ بندہ حاضر ہو جائے گا۔"

وہ باچھیں پھیلا کر بولا تھا۔ دروازے سے اندر داخل ہوتے رضا کا چہرہ غصے سے سرخ پڑ گیا تھا۔ وہ تو دروازہ چوپٹ کھلا دیکھ کر اسے تخت سنانے آیا تھا کہ چچی ساجدہ ان کے گھر گئی ہیں۔ مطلب گھر میں صرف ثانیہ اور رانیہ تھیں مگر یہاں پر گڈو کی موجودگی، اس کی بے تکلفی اس کا دماغ خراب کر گئی تھی۔ گڈو کی قسمت کہ وہ اسے ترنگ میں گاتا ہوا بیرونی دروازہ پار کرتا مل گیا تھا۔ پتا نہیں رضا کو کیا ہوا کہ اس نے گریبان سے ہی پکڑ لیا تھا گڈو کو۔

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی بغیر اجازت دندناتے ہوئے کسی کے بھی گھر گھس آنے کی۔"

رضا نے دانت پیس کر اس کے گریبان کو جھٹکا دیا تھا گڈو کے تو چودہ طبق ہی روشن ہو گئے تھے۔

"ر...... ر...... رضا بھائی! کیا ہو گیا یار! اپنے رشتہ داروں کا گھر ہے۔ کام سے آیا تھا، خالہ نے بلایا تھا۔ گریبان چھوڑ و یار...... کسی نے دیکھ لیا تو کیا کہے گا؟"

گڈو نے گھگھیاتے ہوئے اپنا گریبان اس کے ہاتھوں سے چھڑانا چاہا تھا۔

''خالہ تمہاری اس وقت گھر پر موجود نہیں ہیں۔ تم جانتے تھے خبیث۔'' وہ دبی دبی آواز میں چلایا۔

''ناں...... وہ تو یہاں آ کر پتا چلا کہ خالہ گھر پر نہیں ہے۔ ثانی بھوکی بیٹھی تھی۔ اس نے کہا کہ مرغ پلاؤ لے آؤ۔ اسی نے روک لیا تھا۔'' وہ مسلسل اپنا کالر اس سے چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''ثانی بھوک سے مر کیوں نہ جائے اور تمہاری خالہ بلا بلا کر تھک کیوں نہ جائیں، تم آئندہ اس گھر کی دہلیز پار نہیں کرو گے۔'' رضا نے چبا چبا کر کہتے ایک دم اسے جھٹکا دیا تھا۔ گڈو توازن برقرار نہ رکھ سکا اور نیچے گر گیا۔

''نن...... نہیں آؤں گا۔''

وہ ایک دم اٹھ کر کپڑے جھاڑتا ہوا بولا تھا۔ اور رضا سے تھوڑی دور چلتا ہوا بیرونی دروازہ پار کر گیا تھا۔ رضا نے بیرونی دروازے کے دونوں پٹ برابر کیے اور اندر چلا آیا۔

چھوٹے سے ہال نما کمرے کے باہر کھڑے ہو کر دروازہ بجایا تھا مگر وہ دروازہ بھی کھلا ہوا تھا اور اس کا دل جل کر رہ گیا۔ باہر کھڑے کھڑے ہی اس کو ثانیہ نظر آئی تھی اپنی سابقہ پورشن میں ٹانگیں جھلاتی تخت پر موبائل میں اتنی مگن تھی کہ اسے صحن میں بیرونی دروازے کے پاس ہونے والی جھڑپ کا علم تھا نہ ہی سامنے کھڑے رضا کی آمد کی خبر۔

''بیٹیاں تو پھولوں کا وہ نازک پودا ہوتی ہیں جن کی دیکھ بھال بیج بونے سے لے کر اس وقت تک کرنا پڑتی ہے جب تک وہ اپنے تنے کو مضبوط کر کے زمانے کا سرد گرم نا صرف سہہ سکیں بلکہ اپنے آپ کو ہر قسم کے موسم کی شدت سے بچا بھی سکیں اور تمہاری چچی نے تو بچیوں کو خودرو پودے کی طرح اپنے حال پر چھوڑ دیا ہے جہاں وہ نازک پھولوں والے قیمتی پودے اردگرد کے جھاڑ جھنکاڑ کے باعث پوری طرح نمو ہی نہیں پا رہے۔''

اسے اپنی ماں کی اس وقت کی گئی بات کا مطلب آج پورے مفہوم کے ساتھ سمجھ میں آیا تھا جس کو اس وقت اس نے ہنسی میں اڑا دیا تھا۔

''ارے رضا! تم کب آئے؟''

ثانیہ کو نجانے کب ہوش آیا تھا، وہ موبائل تکیے کے نیچے چھپاتی آگے بڑھ آئی تھی۔

''تم گڈو کیوں آیا تھا؟''

رضا کا لہجہ نہایت سخت اور غصہ لیے ہوئے تھا۔

''آتا رہتا ہے۔ کیوں؟'' کیا ہوا؟ اماں سے کوئی کام تھا اس کو...... اماں نہیں تھیں تو مجھ سے کہا کہ پلاؤ کھلاتا ہوں۔''

ثانیہ کی لاپروائی سے کہی ہوئی بات پر وہ سر سے پاؤں تک جھلس کر رہ گیا تھا۔

''آئندہ چچی گھر موجود ہوں یا نہیں...... باہر کا دروازہ ہر وقت اندر سے بند رکھو گی تم......'' وہ انگلی اٹھا کر کہتا غصے سے کہہ رہا تھا۔

''کیوں؟''

''بکواس بند کرو اور میری بات سنو......''

ثانیہ کی بات کو اس نے ایک ہی دھاڑ سے چپ کرایا تھا۔ وہ بھی سہم کر چپ ہو گئی تھی۔

''اور یہ گڈو آئندہ مجھے یہاں نظر آیا تو اس کی ٹانگیں توڑ دوں گا اور تمہارا گلا دبا دوں گا میں...... اس بات کو دھمکی مت سمجھنا۔ بازار کا یا باہر کا جو بھی کام ہو۔ پرچی اوپر دیوار سے مجھے یا اماں کو پکڑا دو گے تم لوگ...... جو بھی کام ہوا، میں خود کر کے آؤں گا۔ ابھی میرا دماغ بہت خراب ہو رہا ہے اس لیے جا رہا ہوں، آ کر دروازہ بند کر لو اور شام کو کتابیں لے کر گھر آ جانا اگر سیر سپاٹے سے فرصت مل گئی ہو تو۔ آ جاؤ دروازہ بند کرو۔ رانیہ کدھر ہے۔''

جاتے جاتے وہ پلٹا۔ ثانیہ جو اس کے پیچھے آ رہی تھی ڈر گئی تھی۔

''سو رہی ہے اندر۔''

اس نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا کہ اسے رضا کا ایسا رویہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ تو بہت ٹھنڈے مزاج کا بندہ تھا، نہایت دھیمے لہجے میں بات کرنے

pklibrary.com

والا...... آج پتا نہیں کیوں اتنے غصے میں آ گیا تھا، اسی ادھیڑ بن میں وہ دروازہ بند کر کے اندر آ گئی۔
''یہ گڈو کم بخت نجانے کب آئے گا۔ بھوک بھی زوروں کی لگی ہے۔ لیکن رضا کو کس بات کا غصہ آیا ہوا تھا؟ گڈو تو پہلے بھی آتا جاتا رہتا ہے۔ میں بھی چلی جاتی ہوں کوئی کام ہو تو؟'' بڑبڑاتے اس نے کمرے میں جھانک کر رانیہ کو دیکھا۔
''گونگی بھی آج گھوڑے بیچ کے سوئی ہے۔ اٹھ کے ناشتا ہی بنا دیتی۔ لگتا ہے خود ہی کچھ کرنا پڑے گا۔'' بیزاری اور کوفت سے کہتی وہ صحن کے ایک کونے میں بنے کچن کی طرف آ گئی۔
''اماں کو تو موقع چاہیے۔ لوگوں میں بیٹھ کر باتیں بگھارنے کا۔ کہہ رہی تھیں کہ دو منٹ میں آ جاؤں گی۔ تمہاری تائی کی طنزیہ باتیں مجھ سے برداشت نہیں ہوتیں۔ اب گھنٹہ بھر ہو گیا۔ نام ہی نہیں لے رہیں آنے کا اور یہ ماسی...... آج آئے تو اس کی خبر لیتی ہوں۔''
کچھ کچن میں برتن ابھی تک بغیر دھلے پڑے تھے۔ ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔
اس نے خراب موڈ کے ساتھ مکھیوں کے ڈھیر کو ڈسٹرب کر کے فرائی پین گندے برتنوں سے نکالا تھا۔

☆☆☆

''پھر کیا سوچا آپ نے ثمینہ کی ماں......؟''
تائی صدیقہ ان کو دبا رہی تھیں جب باتوں باتوں میں تایا ابا نے پوچھا تھا۔
''کس بارے میں؟'' وہ ہاتھ روک کر بولی تھیں۔
''وہی جو آج سارا دن آپ ماں بیٹی کے درمیان زیر بحث رہا۔''
تایا ابا کی بات پر تائی صدیقہ نے ایک طویل سانس لی تھی۔
''سچ کہوں تو ثمینہ کی نند کی بیٹی کے لیے بڑا دل ہے میرا۔ جتنی شکل کی خوب صورت ہے، اتنی ہی نیک سیرت اور سگھڑ تو اس جیسا خاندان میں کوئی نہیں۔''

وہ جوش سے بولی تھیں۔
''خوب صورت تو میری بھتیجیاں بھی ہیں ثمینہ کی ماں اور میں سمجھتا ہوں کہ اس گھر میں ان میں سے کسی ایک سے زیادہ اور کوئی حق نہیں رکھتا اس حوالے سے۔''
وہ ہمیشہ والی بات پر آ گئے۔
''مجھے بخدا آپ کی بھتیجیوں سے کوئی پرخاش نہیں ہے اکرم صاحب! مگر میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ میں اس کی آنے والی نسل کی تعلیم و تربیت کم از کم ساجدہ کی بیٹیوں کے ہاتھوں میں دے کر اپنے بچے کی زندگی اور آنے والی نسل کی تربیت خراب نہیں کر سکتی۔''
تائی صدیقہ کا ہمیشہ کا ایک ہی موقف تھا۔
''آپ اپنے بیٹے کی خوشی بھی تو دیکھیں ثمینہ کی ماں۔ بھابھی ساجدہ کی طرز زندگی اور ماحول الگ طرح کا تھا۔ اسلم سیدھا سادہ آدمی تھا۔ بیوی عمر بھر حاوی رہی اس پر...... پھر اس کی بے وقت موت نے بھابھی ساجدہ کو اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کا پورا پورا موقع دیا۔ ہمارے اور ان کے گھر کے ماحول میں بہت فرق ہے۔ رضا بہت سمجھ دار بچہ ہے۔ ثانیہ کو اپنے ماحول میں ڈھال لے گا۔ پھر تم بھی تو ہو اس کو سمجھانے کے لیے۔''
''بس کریں اکرم صاحب! یہ سہانے خواب مجھے نہ دکھائیں۔ آپ کی اماں مرحومہ ساجدہ کے سدھرنے کے خواب لیے قبر میں اتر گئیں۔ اب آپ مجھے یہ لارا نہ لگائیں کم از کم...... ابھی دو سے تین ہفتے رک کر دیکھیں ساجدہ بی بی نئے سفر کے لیے تیار بیٹھی ہوں گی۔''
تائی صدیقہ کچھ زیادہ ہی جلی بیٹھی تھیں۔
''اچھا ایک کام کرتے ہیں۔ رشتہ ڈالنے کے ساتھ ہی ساجدہ کے سامنے کچھ شرائط رکھ دیں گے کہ شادی کے بعد ثانیہ ساجدہ کے کسی میکے کے پروگرام کا حصہ نہیں بنے گی۔ ہاں وہاں اس کی ننھیال ہے۔ بہت ضروری بھی ہوا کسی دکھ سکھ میں جانا تو ثانیہ رضا

pklibrary.com

کے ساتھ جائے گی۔ اسی کے ساتھ واپس آئے گی۔"
"مان ہی نہ لے آپ کی بھاوج آپ کی شرائط۔" انہوں نے سر جھٹک کر کہا تھا۔
"اور کون جانے کہ ثانیہ بی بی ان شرائط پر عمل کریں نہ کریں۔"
وہ مزید بولی تھیں۔
"وہ رضا کا کام ہے، وہ سمجھا لے گا اس کو۔ ثانیہ اچھی بچی ہے، وہ جیسا ماحول دیکھے گی، اسی میں ڈھل جائے گی۔ آپ بات تو کریں۔"
"اچھا آپ زیادہ مت سوچیں۔ ڈاکٹر نے منع کیا ہے آپ کو زیادہ سوچنے سے اور ٹینشن لینے سے ...... بس دعا کریں جو بھی ہو، بہتر ہو سب کے لیے، ثمینہ اور رضا کو بٹھا کر بات کرتی ہوں پھر دیکھتے ہیں کیا کرنا ہے۔ میں آپ کی دوائی لے آؤں۔"
تائی صدیقہ اٹھتے ہوئے بولی تھیں۔ تایا ابا نے آہستہ سے سر ہلاتے ہوئے آنکھیں موند لی تھیں۔ کم از کم تسلی ہو گئی تھی کہ تائی صدیقہ نے بیٹھ کر اس حوالے سے ان کی بات تو سنی تھی ورنہ وہ ہمیشہ انکار کر دیتی تھیں۔

☆☆☆

"ایک سرپرائز ہے تمہارے لیے......"
مدثر نے تجسس پیدا کیا تھا۔
"کیا...... جلدی بتاؤ۔"
وہ موبائل اٹھا کر اوپر چھت پر چلی آئی تھی۔ رانیہ فرش پر نیچے بیٹھی انگلی سے پتا نہیں زمین پر کیا لکھ رہی تھی۔ ثانیہ ایک پل کو ٹھٹکی تھی پھر دوبارہ سے مدثر کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔
"فائدہ کیا ہوا سرپرائز کا اگر بتا دیا تو......"
"یہ بھی ہے...... چلو میں کوشش کرتی ہوں...... تم نے خالہ خالدہ سے ہمارے رشتے کی بات کی ہو گی لازمی......" وہ سوچتے ہوئے بولی تھی۔
"وہ بھی کر لیں گے جلدی کیا ہے۔"
مدثر نے لاپروائی سے کہا تھا۔
"پھر......؟؟"

"زرقا کا کہیں رشتہ ہو گیا ہے؟" وہ چٹکی بجا کر بولی تھی۔
"تم نے وہاں جا کر رشتے کرانے کا کام شروع کر دیا ہے جو ہر بات رشتے سے شروع ہو کر رشتے پر ختم ہو رہی ہے۔ کبھی ہمارا رشتہ، کبھی زرقا کا رشتہ۔"
مدثر بدمزہ ہو کر بولا تھا۔
"ملنے کو دل کر رہا تھا تم سے؟"
مدثر کی بات کے ساتھ لہجہ بھی بدل گیا تھا۔
"دن میں دو تین بار بات ہو جاتی ہے۔ چیٹنگ کا سلسلہ سارا دن چلتا ہے، ابھی بھی ملنے کو دل کر رہا ہے؟" وہ اتراتے ہوئے بولی تھی۔
"پھر بھی ثانی! میں تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں، محسوس کرنا چاہتا ہوں۔"
اس کی بات پر ثانیہ مغرور ہوئی تھی۔
"ابھی تو ہمارا آنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ ادھر تایا ابا بھی بیمار ہیں۔ ہارٹ اٹیک ہوا تھا ان کو ہمارے یہاں سے جانے کے دو دن بعد۔"
"ثانی! میں نے تم سے تمہاری اور اپنی بات کرنے کے لیے فون کیا ہے، تم تایا نامہ کھول کر بیٹھ گئی ہو...... یہ بتاؤ اکیلی ہو؟"
مدثر نے بیزاری سے کہا مگر آخری بات معنی خیزی سے پوچھی تھی۔
"اکیلی...... سمجھو...... اکیلی ہی ہوں۔"
اس نے ایک نظر رانیہ پر ڈال کر کہا تھا۔ پھر پندرہ سے بیس منٹ کی کال میں مدثر کی باتوں نے اسے ایک اور جہان میں پہنچا دیا تھا۔ کال کے اختتام پر اس نے غیر ارادی طور پر چھت کی منڈیر سے تایا ابا کے گھر جھانکا تھا مگر پھر فوراً ہی پیچھے ہٹ گئی تھی۔ کم و بیش پرسوں والا ہی منظر تھا نیچے تایا ابا لیٹے ہوئے تھے صحن میں ہی۔ تائی صدیقہ اور ثمینہ ان کے پاس رکھی پلاسٹک کی کرسیوں پر بیٹھی تھیں جبکہ رضا تایا ابا کے بالکل پاس بیٹھا ان کا بی پی چیک کر رہا تھا۔
"بس شکل و صورت کا اچھا ہے رضا، نہ کوئی شوخی، شرارت، نہ جذبوں کا اظہار، نہ ہی نفس کا

تبادلہ، ابھی بھی کہتا ہے، تمہیں پسند کرتا ہوں نہ بھئی۔ مجھے نہیں ایسے مشینی بندے کے ساتھ زندگی گزارنی۔ اور مدثر......" اس نے دل ہی دل میں سوچا تھا اور مدثر کی چند لمحے پہلے کی گئی باتیں یاد کر کے وہ خود ہی شرما گئی تھی۔

☆☆☆

دھوپ سر پر آچکی تھی، صحن میں پنکھا چلنے کے باوجود مکھیاں تھیں کہ تنگ کرنے میں ایک دوسرے کے مقابلے پر آئی ہوئی تھیں۔ تنگ آکر اس نے ادھ کھلی آنکھوں سے ہی تکیہ اٹھایا اور اندر جا کر لیٹ گئی۔ ساجدہ اپنی چارپائی پر بیٹھی چائے میں رسک ڈبو کر کھا رہی تھیں۔

"اب جا کے دوپہر کی خبر نہ لے آنا، جلدی اٹھنا، میں نے شکیلہ کے ہاں جانے کا پروگرام بنایا ہے آج چھ ماہ ہوگئے، روز سوچتی ہوں۔ آج جاؤں گی، کل جاؤں گی۔ ابھی آج کل میں چھ مہینے ہوگئے غریب کی ٹانگ ٹوٹے، کیا سوچے گی۔ کیسی سہیلی ہے پلٹ کر خبر تک نہ لی۔"

"اچھا۔"

اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تھا۔ نیند کا غلبہ اس قدر تھا کہ دوپٹے کا ایک سرا بمشکل کندھے پر ٹکا تھا اور اندر لے جانے کے لیے جو چادر بستر کی پائنتی سے اس نے کھینچ کر بغل میں دبائی تھی۔ دونوں ہی فرش پر جھاڑو لگاتے ہوئے اس کے ساتھ اندر چلے گئے تھے۔

گونگی کو نہ جانے کون سے غم ستانے لگے ہیں آج کل اٹھے گی تو جا کر چھت پر گھنٹہ گھنٹہ لگا آئے گی۔ کتنی بار سمجھایا ہے نجانے کون کون سی ہوائی مخلوق ہوتی ہیں پر سننے سمجھنے کی ہوتی تب ناں۔ ایک بار آپا بات کر لے مدثر کے لیے۔ گونگی کو بھی مزمل کے ساتھ ہی نپٹا دوں گی۔ پھر تو میں نے رہنا ہی ادھر ہے اپنوں میں، یہاں میرا کون بیٹھا ہے۔"

چائے پیتے ہوئے وہ زیر لب بڑبڑا ہی تھیں۔ جب دروازے پر زور سے دستک ہوئی تھی۔

"اس وقت کون آگیا۔ ضرور گڈو کی ماں ہوگی چائے کی پتی یا چینی لینے آئی ہوگی۔ تیرہ ہی بنالیا ہے۔ اس نے ...... آرہی ہوں بھئی، صبر کرو۔ دستک ایسے دے رہی ہو جیسے قرضہ لینے والے آئی ہو۔ بندہ دستک دینے کے بعد دو منٹ صبر ہی کر لیتا ہے۔"

بیرونی دروازے تک جاتے جاتے وہ بولتی گئی تھیں۔ جاتے وقت پاؤں لگنے سے کپ بستر پر ہی الٹ گیا تھا۔ کپ میں بچی تھوڑی سی چائے چادر پر داغ ڈال گئی تھی مگر وہاں پروا کسے تھی کہ ایسے پھوہڑپن کی مثالیں اس گھر میں دن بھر میں کئی بار دیکھنے کو ملتی تھیں...... تائی صدیقہ بھی بھول کر آ بھی جاتیں تو جل کڑھ کر ہی واپس جاتی تھیں۔ یہ اور بات تھی کہ جتنی دیر وہاں بیٹھی رہتیں۔ دونوں بچیوں کو ہر کام کرتے وقت ٹوکتی رہتی تھیں۔ انہیں ثانیہ سے زیادہ رانیہ پر ترس آتا تھا کہ ان کے خیال میں ثانیہ سے زیادہ رانیہ کو توجہ اور تربیت کی ضرورت تھی مگر ان بچیوں کی قسمت کہ ان کے نصیب میں ساجدہ جیسی ماں آئی تھی۔ بچیوں نے جو کچھ سیکھا تھا، اپنے اردگرد سے سیکھا تھا یا پھر ٹی وی دیکھ کر۔

دروازہ کھولتے ہی ساجدہ کی خوشی کے مارے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی تھی کہ نہ صرف خالدہ خالہ، مدثر بلکہ امجد خالو بھی موجود تھے۔

"کیا ہوگیا ساجدہ! اندر آنے دو گی یا باہر سے ہی لوٹا دو گی واپس، اتنا لمبا سفر کر کے آئے ہیں اور تم ہو کہ بت بن کر دروازے سے چپک گئیں۔"

"ارے آؤ آؤ...... میری تو مت ماری گئی خوشی کے مارے۔"

انہوں نے دروازہ چوپٹ کھول کر مہمانوں سے کہا اور خود سلیپر گھسیٹتی ان کے پیچھے ہی آگئیں۔

"خالہ! تگڑے سے ناشتے کا بندوبست کریں پھر میں نے لمبی تان کے سونا ہے۔ آٹھ گھنٹوں کے سفر نے جسم کا جوڑ جوڑ ہلا دیا۔"

مدثر نے بھاری بھرکم بیگ نیچے رکھتے ہوئے

pklibrary.com

انگڑائی لے کر کہا تھا۔ جبکہ خالدہ اور امجد خالو وہیں صحن میں پڑی چارپائیوں پر ہی براجمان ہو گئے تھے، جہاں سے ابھی رات والے بستر ہی نہ اٹھائے گئے تھے۔

"میں صدقے! خالہ قربان جائے، ابھی بن جائے گا ناشتا۔"

"اے ساجدہ یہ رانو اور ثانیہ کدھر ہیں۔"

خالدہ نے ادھر ادھر نظریں دوڑائی تھیں۔

"رانیہ تو چھت پر ہے، ثانیہ کا تو پتا ہے کہ دیر سے اٹھتی ہے۔ اے جا بیٹا جگا دے اس کو۔ اور گونگی کو بھی بلا اوپر سے۔"

ساجدہ نے مدثر سے کہا تھا جس کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔ لمحوں میں ہی گندی سوچ نے تانا بانا بن لیا کہ پہلے گونگی سے ملا جائے پھر ثانیہ کے خوابیدہ حسن کو خراج تحسین دے گا۔

وہ لمحوں میں ہی کسی ڈر خوف کے بغیر سامنے نظر آتی سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا تھا۔ پتا تھا کہ ساجدہ اس پر خود سے زیادہ بھروسا کرتی تھیں۔ اور جب وہ خود ہی بیٹیوں کی ماں ہو کر ایک نامحرم کو موقع دے رہی تھیں کہ ایک بیٹی قدرتی طور پر اپنے عیب کی وجہ سے احساس کمتری کا شکار ہے۔ ماں کی غفلت نے اسے نارمل نہیں رہنے دیا۔ جاؤ جا کر جو سلوک کرو، تمہیں کھلی چھوٹ ہے۔ وہ ماں سے تو کیا کسی سے بھی کچھ نہیں کہے گی۔ صرف اپنے درد کو پی کر وہ اور اکیلی اور تنہا ہو جائے گی۔" دوسری اپنی عمر کے اس خطرناک دور سے گزر رہی ہے جہاں ماؤں کی رہنمائی، شفقت اور اعتماد ہی بچیوں کو سنبھل کر رہنے میں مدد دیتی ہے اور جہاں یہ سب کچھ نہ ہو وہاں پھر سہانے خواب دکھانے کے لیے مدثر اور گڈو جیسے لوگ ہوتے ہیں۔ ایسے خواب جن کے لیے آنکھوں کا خراج دینا پڑتا ہے۔ بلکہ اور بھی بہت کچھ قربان کرنا پڑتا ہے۔

"واہ بھئی! کیا ٹھاٹ ہیں، کیا مزے ہیں؟"

مدثر اب کمرے میں آ کر بولا تھا جہاں دنیا ومافیہا سے تو کیا وہ اپنے آپ سے بھی بے نیاز نیند کے سفر پر تھی۔ اس نے جان بوجھ کر اس کی پنڈلی کو چھوا تھا جہاں سے شلوار کا پائنچہ تھوڑا اٹھا ہوا تھا۔

"اے ثانی! اٹھ ناں......"

وہ سرگوشی میں بولا تھا۔

"آ رہی ہوں اماں...... سونے دو ابھی......"

وہ ابھی بھی نیند میں تھی۔

"ثانیہ۔"

اب کے اس کے ہاتھ اپنے چہرے پر محسوس کر کے ثانیہ کی آنکھیں پٹ سے کھلی تھیں۔ کچھ لمحے وہ دم سادھے اسے دیکھتی رہی تھی کہ کیا وہ خواب تھا یا مجسم۔

☆☆☆

"سن رہے ہیں آپ......؟ پڑوس میں آپ کی بھاوج کے گھر کی کیا خیر خبر ہے۔"

تائی صدیقہ بیزار سی اندر داخل ہوئی تھیں اور اخبار پڑھتے اکرم صاحب سے طنزاً مخاطب ہو کر کہا تھا۔

"اب کیا جرم سرزد ہو گیا ہماری بھاوج سے؟"

انہوں نے اخبار لپیٹ کر اپنے سامنے رکھا۔ عینک اتار کر اس کے اوپر رکھی اور ہلکے پھلکے انداز سے بولے تھے جانتے تھے کہ صدیقہ جب جب ان کے بھائی کے گھر سے ہو کر آتیں، ان کو ہزار ہا شکوے ہوتے تھے ساجدہ سے، اس کے طور طریقوں سے، گھر کے نظام سے، وہ کتنے کتنے دن بول بول کر اپنے دل کی بھڑاس نکالتی رہتیں۔ کبھی وہ سنتے رہتے، کبھی تنگ آ کر چپ بھی کرا دیتے تھے انہیں کہ عادت بدل سکتی ہے فطرت نہیں اور ساجدہ فطری طور پر ہی لاپروا، پھوہڑ اور ناعاقبت اندیش عورت تھی۔ ان کے بھائی مرحوم سیدھے سادھے اور قدرے بھولے آدمی تھے۔ لڑائی جھگڑے کا نام سن کر ہی ان کا رنگ زرد پڑ جایا کرتا تھا لگتا کہ بیوی سے کسی بھی چیز کی باز پرس کرنا۔

دادی مرحومہ جب تک زندہ رہیں تو ڈانٹ ڈپٹ، سختی سے کچھ کنٹرول کیے رکھا تھا ساجدہ کو خصوصاً

pklibrary.com

میکے جانے سے، ادھر ادھر محلے میں پھرنے سے مگر اس کی ازلی لاپرواہی اور تربیت کو نہ بدل سکی تھیں۔ ساس کے گزرنے کے بعد تو شیر ہی ہو گئی تھیں اور میاں کے جانے کے بعد تو میدان ہی صاف ہو گیا تھا۔

"اب بتائیں گی بھی یا یونہی ہمیں اخبار پڑھنے سے روکنا مقصود تھا۔" انہیں کچھ بڑبڑاتے دیکھ کر اکرام صاحب مسکرا کر بولے تھے۔

"سسرال والے تشریف لائے ہیں آپ کے مرحوم بھائی کے۔ ابھی بھی کوئی قیمتی چیز رہ گئی ہو گی ساجدہ کے پاس جس کی ندیدوں کو اب خبر ہوئی ہو گی جو پورا ٹبر آن پہنچا۔ بہن صاحبہ بہنوئی اور وہ مسٹنڈا بھانجا۔"

"آپ ایسی زبان کب سے استعمال کرنے لگیں؟"

وہ ناگواری سے بولے۔

"تو اور کون سی زبان بولوں...... اکرم صاحب بہت کچھ دیکھا ہے میں نے، بس، زبان نہ کھلوائیں میری۔ پوچھیں تو ذرا بھاوج سے کہ اماں مرحومہ (ساس) نے دس دس تولے سونا چڑھایا تھا دونوں بہوؤں کو۔ میں نے تو آدھا ثمینہ کو دیا، آدھا رضا کی دلہن کے لیے رکھا ہے۔ آپ کی بھاوج کے پاس چھلا بھی نہیں بچا چاندی کا۔ بھائی صاحب کے واجبات سے لے کر پنشن تک کی رقم ہے اس کے پاس؟ اور پھر زمینوں کی آمدنی؟ زمیندارنی کہلاتی ہیں میکے میں خود کو محترمہ۔ سال کی گندم تو آپ خود بھجواتے ہیں ناں اس کے میکے؟"

وہ غصے میں کافی کچھ بول گئی تھیں۔

"بھابھی بتا رہی تھیں کہ قیمت ادا کرتے ہیں وہ لوگ ان کو اس گندم کی۔"

"جی جی ضرور، دل کو بہلا لیجیے یہ کہہ کر ورنہ حقیقت سے تو آپ بھی واقف ہیں۔" وہ جل کر بولی تھیں۔

"غضب خدا کا، میری تین بہنیں ہیں۔ مجھے نہیں یاد کہ میرے بہنوئیوں نے کبھی ڈرائنگ روم کے سوا گھر کے اندر قدم بھی رکھا ہو۔ یہاں جوان جہاں بچیوں کے سامنے بنیان شلوار میں گھوم رہے ہیں محترم۔ اور ساجدہ بی بی بیٹھی ٹھٹھے لگا رہی ہیں۔ وہ تو شکر ہے، رضا ٹیسٹ دینے شہر سے باہر ہے ورنہ اس کو سخت ناپسند ہے اپنی چچی کا اس طرح بے تکلفی سے ہر کسی سے بات کرنا۔"

"آپ ان مہمانوں کے رخصت ہوتے ہی فوراً رشتے کی بات کیجیے۔ میں اس معاملے میں مزید تاخیر نہیں چاہتا۔"

تایا ابا کا لہجہ نہایت سنگین ہو گیا تھا۔

"اچھا...... آپ اب زیادہ پریشان نہ ہوں۔ وہ عورت نہیں سدھرنے والی۔"

جذبات ذرا ٹھنڈے پڑے تو تائی صدیقہ کو یاد آیا کہ کچھ عرصہ پہلے ہی تایا ابا کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا اور ڈاکٹر نے ان کو ٹینشن سے دور رکھنے کو کہا تھا۔

☆☆☆

"ارے بھابھی! آئیں آئیں...... آپ تو بھول ہی گئیں کہ آپ کے پڑوس میں بھی رشتہ دار بستے ہیں۔" تائی صدیقہ کو بیرونی دروازہ پار کرتے دیکھ کر ہی ساجدہ نے طنزاً کہا تھا۔

"بیٹھیں...... یہاں بیٹھ جائیں۔ بھائی صاحب کی طبیعت کیسی ہے اور کب سے رضا نے بھی چکر نہیں لگایا۔"

ساجدہ نے ان کے لیے اپنے پاس تخت پر ہی جگہ بنائی تھی اور کپڑوں کے دھلے ہوئے ڈھیر کو اٹھا کر اپنی پشت پر رکھ لیا تھا۔ ان کے اس عمل کو تائی صدیقہ نے خاصی ناگواری سے دیکھا تھا کیونکہ پتا تھا کہ دھلنے کے بعد یہ کپڑوں کا ڈھیر یہاں سے وہاں منتقل ہوتا رہے گا تہ کیے بغیر ہی۔ اور جہاں پر ڈھیر ہو گا وہیں سے ہی تینوں ماں بیٹیاں کپڑے نکال نکال کر پہنتی رہیں گی تاوقت کہ کپڑوں کا پھر سے ایک میلا ڈھیر دھلنے کے لیے تیار نہ ہو جائے گا۔

"ہاں ٹھیک ہیں سب...... بس تمہارے بھائی

pklibrary.com

صاحب کی طبیعت پل میں تولہ پل میں ماشا والی صورت حال ہے۔ اور رضا تین چار دن کے لیے شہر سے باہر ہے اپنے کسی ٹیسٹ کے سلسلے میں...... کہہ رہا تھا چچی جان کو سودا سلف دے کر جا رہا ہوں۔ آیا تو تھا ملنے تم سے...... پھر تمہارے مہمان آ گئے تو مناسب نہیں سمجھا آنا۔ لاؤ یہ کپڑے مجھے اٹھا دو۔ باتوں باتوں میں ابھی جوڑے بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ بچیاں اپنے اپنے ٹھکانے پر رکھ دیں گی۔ ٹھکانے پر چیز رکھی ہو تو موقع پر مل جاتی ہے۔ وقت بھی ضائع نہیں ہوتا اور پریشانی سے بچ جاتا ہے بندہ...... بچیوں سے یاد آیا۔ بچیاں کہاں ہیں؟ نظر نہیں آ رہیں؟"

انہوں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"گونگی تو سوئی ہوئی ہے۔ ایسی کوئی نیندیں چڑھی ہیں کم بخت کو کہ اترنے کا نام نہیں لے رہیں اور ثانیہ گئی ہے یہ ساتھ والے پارلر...... آئی بروز بنوانے۔"

ساجدہ نے کپڑوں کا ڈھیر اٹھا کر تائی ساجدہ کے سامنے دھر دیا تھا اور جیسے ہی بیٹیوں کے متعلق بتایا تائی ساجدہ کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے۔

"گونگی اولاد ہے تمہاری ساجدہ...... وہ بھی بیٹی...... بیٹیوں کو تو بہت پیار بھرے نام سے پکارنا چاہیے، کون جانے کون سا لمحہ قبولیت کا ہو اور نجانے کیسا نصیب ان بچیوں کی راہ دیکھ رہا ہو۔ اور ثانیہ اکیلی چلی گئی پارلر؟" وہ ناگواری سے بولی تھیں کہ ان کی سمجھ نہیں آیا تھا کہ اس عورت کو کون سی بات کیسے سمجھائیں۔

"یہ ساتھ والی گلی میں تو گھر ہے بھابھی! میں دروازے سے دیکھتی رہی تھی جب تک وہ گلی نہ مڑ گئی۔" اور صدیقہ جانتی تھیں کہ دروازے سے دیکھنے والی بات ساجدہ نے جھوٹ بولی تھی۔

"پھر بھی ساجدہ بات نزدیک، دور کی نہیں ہے۔ بچی کو اکیلے باہر بھیجنے کی ہے۔ جانا ضروری ہو تو خود ساتھ جاؤ ورنہ مت بھیجا کرو۔"

انہوں نے دوٹوک کہا اور ساجدہ کا پورا سوٹ اکٹھے لپیٹ کر رکھا۔

"اچھا بھابھی! یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ یہ بتائیں، چائے پئیں گی یا جوس لے کر آؤں۔" انہوں نے ہمیشہ کی طرح تائی صدیقہ کی بات کو نظر انداز کر کے کہا تھا۔

"نہیں بھئی، دونوں کی طلب نہیں ہے...... آج تو میں تمہارے پاس ضروری کام سے آئی ہوں اور بھیجا بھی تمہارے بھائی صاحب نے ہے مجھے۔"

تائی صدیقہ کا لہجہ خود بخود نرم ہوا تھا۔

"میرے پاس۔"

ساجدہ کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہاں تمہارے پاس...... ابھی تو پیغام لے کر آئی ہوں پھر اگلے ہفتے ثمینہ آئے گی تو باقاعدہ سب آئیں گے۔ ابھی کل ہی گئی ہے ثمینہ اپنے گھر واپس۔"

تائی صدیقہ کے لہجے میں بیٹی کے نام پر خود بخود پیار گھل گیا تھا۔

"کیسا پیغام بھابھی؟"

ساجدہ کا ماتھا ٹھنکا تھا۔

"تمہارے میاں مرحوم نے ایک بار اپنے بھائی سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا کہ دونوں بھائیوں کا رشتہ مضبوط ہو جائے گا اگر ہم ثانیہ بیٹی کو اپنی بہو بنا لیں۔ تمہارے بھائی کی بھی شدید خواہش ہے کہ ان کے مرحوم بھائی کی بیٹی ان کے گھر بہو بن کر آئے اور رضا کی بھی خواہش سمجھ لو۔ لیکن میری کچھ شرائط ہوں گی یہ اچھی طرح کان کھول کر سن لو تم۔"

وہ ایک مان سے بولی تھیں۔ ساجدہ کے ماتھے کی شکنیں گہری ہو رہی تھیں۔

"اور یہ بچی کی بھلائی کے لیے ہی ہوگا۔ تم ہم اپنی زندگی گزار چکے۔ لازمی نہیں کہ بچوں کو بھی زبردستی اپنی مرضی اور پسند پر چلنے پر مجبور کریں۔ رضا ہوں یا تمہارے بھائی دونوں کی خواہش ہے کہ شادی کے بعد ثانیہ جہاں بھی جائے گی رضا کے ساتھ جائے گی۔ ہمیں یہ روز روز ننھیال جانا نہیں پسند اس کا۔ اور

سچ پوچھو تو روز کا آنا جانا قدر گھٹا دیتا ہے بندے کی۔ سیانے ایسے ہی مثالیں نہیں بنا گئے۔ اور میں تو کہتی ہوں کہ تم بھی جوان بچیوں کی ماں ہو، یہ وتیرہ چھوڑ و اب......"

"بس بھابھی!"

ساجدہ کے صبر کی حد بس یہیں تک تھی۔

"آپ کے منہ میں جو بھی آ رہا ہے، بولے جا رہی ہیں۔ مجھ سے پوچھ تو لیتیں کہ میں کیا چاہتی ہوں۔ ارے میں تو پچھتائی آپ کے خاندان میں آ کر۔ ایک لمحہ سکون کا نہ لینے دیا مجھے آج تک، ہر ہر بات پر اعتراض ہر عمل پر طعنے ہی سننے کو ملے مجھے۔ پہلے اماں پھر آپ...... ارے زندگی دوزخ بنا کر رکھ دی میری، اب آپ نے کیسے سوچ لیا کہ ایک بھلے مانس وہ بھی مرے ہوئے کی خواہش کے لیے میں اسی دوزخ میں اپنی بچی کو جھونک دوں گی۔ ساری تکلیف ہی میرے میکے والوں کی چلی آ رہی ہے آپ کے خاندان کو۔ غیر تھی آج تک غیر ہی رہیں گے۔ یہ شرطیں ورطیں نہ بھی ہوتیں تب بھی میں نے بیٹی کو یہاں نہیں بیاہنا تھا۔ میں اپنی ایک نہیں دونوں بیٹیوں کی شادی اپنی بہن کے گھر کرنے کا فیصلہ کر چکی ہوں۔ زبانی کلامی سب طے ہو چکا۔ بس جلد ہی شادی کر کے میں بھی اپنے ماں باپ کی دہلیز پر چلی جاؤں گی۔ جو میرا اصل ٹھکانا ہے۔ بتا دیجیے گا بھائی صاحب کو۔"

ساجدہ نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے تھے تائی صدیقہ کے سامنے۔

"ماں باپ کی دہلیز شادی شدہ عورت کے لیے کبھی بھی ٹھکانا نہیں ہوتی۔ عارضی پناہ گاہ ضرور ہو سکتی ہے۔ شادی شدہ عورت کا اصل گھر اس کے شوہر کا گھر ہوتا ہے یا پھر اس کی قبر...... انہوں نے کہا تھا

"پروردگار تمہاری بچیوں کے نصیب اچھے کرے اور تم جیسا چاہ رہی ہو، ویسا ہی ہو۔"

وہ اٹھتے ہوئے بولی تھیں مگر لہجہ نہایت ہموار اور پرسکون تھا۔ اندر ہی اندر کہیں سکون اتر اتھا ساجدہ کے انکار سے۔

"بھابھی! اب بیٹھیں بھی۔ آپ تو ناراض ہی ہو گئیں۔"

ساجدہ تھوڑا سا بوکھلائی تھیں۔

"نہیں ناراضی کیسی! تمہاری بیٹیاں ہیں، تم پورا حق رکھتی ہو ان کی زندگی کا فیصلہ کرنے کا۔ لیکن بیٹیوں کی ماں ہو، اس لیے نصیحت کر رہی ہوں کہ مجھے بیٹھے گھنٹہ گزر گیا۔ نہ رانیہ اٹھی نیند سے نہ ثانیہ آئی پارلر سے۔ اولاد سے غافل رہنا بہت بڑی قیامتیں لے کر آتا ہے بہت دفعہ، خدارا ہوش کے ناخن لو۔" وہ کہہ کر چلتی بنی تھیں۔

"ہونہہ...... گونگی سو رہی ہے۔ اب سوئی ہوئی سے کیسی غفلت اور ثانیہ...... یہ گلی تک گئی ہے۔ کئی دفعہ جا چکی ہے۔ اب تو سہیلی بن گئی ہے پارلر والی اس کی۔ سٹھیا گئی ہے یہ عورت۔ ہمیشہ مجھے برا سمجھا اور غلط بھی۔"

بڑبڑاتی ہوئی وہ گونگی کو دیکھنے چلی گئیں۔

☆☆☆

"آپ نے ٹھیک طرح سے بات تو کی تھی ناں ثمینہ کی ماں! بیٹیوں کے رشتے ایسے نہیں مانگے جاتے جیسے آپ نے مانگا۔"

اکرم صاحب بے چین ہو کر بولے تھے جب تائی صدیقہ نے ان کو آ کر ساری بات بتائی تھی۔

رضا بھی واپس آ چکا تھا اور سفر کی تھکان اتار کر باپ کے پاس بیٹھا معمول کی بات چیت میں مصروف تھا۔ ان دونوں کے چہرے اتر گئے تھے۔ جب انہوں نے ساجدہ کے انکار کا بتایا تھا۔

"زبان سے ہی بات کی تھی اکرم صاحب! اور کیا پاؤں پڑ جاتی آپ کی بھاوج کے۔"

صدیقہ بگڑ کر بولی تھیں۔

"پاؤں پڑنے پڑتے ہیں۔ جوتیاں گھسانی پڑتی ہیں۔ بیٹی ایک گھر کی سب سے انمول دولت ہوتی ہے۔ اس انمول دولت کو اپنے گھر کی زینت بنانے کے لیے تو بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ آپ نے تو

pklibrary.com

پہلے شرائط ہی گنوانا شروع کر دیں۔"
اکرم صاحب بے بسی سے بولے تھے۔
"پڑ جاتی پاؤں اگر آپ کی بھاوج فیصلہ نہ کر چکی ہوتیں۔"
تائی صدیقہ اکرم صاحب کی طبیعت کا سوچ کر دھیمی پڑ گئی تھیں۔
"ہم پھر جائیں گے، میں بات کروں گا بھابھی سے اور ثانیہ بیٹی سے خود پوچھوں گا۔ تم دیکھنا۔"
"نہیں ابا بس! مجھے آپ دونوں کی عزت سے بڑھ کر کچھ عزیز نہیں ہے۔ ثانیہ سے تایازاد ہونے کے ناتے ایک لگاؤ تھا بس، میں اس کے پیچھے زندگی نہیں رولنے والا۔ دوسرا مجھے بھی احساس ہو گیا ہے کہ یہ صرف چچی کا فیصلہ نہیں ہے، ثانیہ کی رضا بھی اس میں شامل ہے۔" وہ سر جھکا کر بولا تھا۔
"لیں اب تو اس کو بھی احساس ہو گیا کہ یہ قطعی بے جوڑ رشتہ ہے۔ ثانیہ یہاں نہ تو کبھی ایڈجسٹ ہو پائے گی نہ ہی خوش رہے گی جب تک ساجدہ زندہ ہے۔"
تائی صدیقہ نے جتانے والے انداز میں اکرم صاحب سے کہا تھا۔
"چلیں آپ دونوں اپنی بات کر چکے۔ لیکن میں ایک بار خود بھابھی سے بات کرنا چاہوں گا۔ اس کے بعد جیسے آپ لوگ کریں گے۔ کر لیجیے گا۔"
اکرم صاحب کا انداز حتمی تھا۔
"ٹھیک ہے، آپ بھی اپنی حسرت پوری کر کے دیکھ لیجیے گا۔ آپ کی بھاوج وہی جواب دے گی۔ جو پہلے مجھے دے چکی ہے۔"
تائی صدیقہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اٹھتے ہوئے بولی تھیں۔ رضا ہاتھوں میں ہاتھ پھنسائے سر جھکائے بیٹھا رہا تھا جبکہ تایا بھی اس بات چیت کے بعد پریشان سے تھے۔

☆☆☆

اور وہی ہوا تھا جیسا صدیقہ تائی نے بتایا تھا اکرم صاحب اگلے ہی دن ساجدہ کے گھر گئے تھے۔

اس نے تو ایسے طریقے سے بات کی تھی کہ ان کو بھی قائل ہونا پڑا تھا۔ ساجدہ نے تصویر کا نقشہ ہی ایسا کھینچا تھا کہ وہ تو چھوٹی کو بہن کے گھر دینا ہی اس لیے چاہتی ہے کہ بڑی ساتھ ہی نپٹ جائے ورنہ بھلے وہ شکل وصورت کی کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو، ایک گونگی لڑکی کو کون بہو بنانا پسند کرتا ہے۔ ان کے سر پر تو باپ کا سایہ بھی نہیں ہے اور وہ گونگی کے سر پر کب تک موجود رہیں گی۔ ایک اسی بات پر اکرم صاحب ڈھیلے پڑ گئے تھے ورنہ وہ ساجدہ کو ثانیہ کے رشتے کے لیے پوری طرح قائل کرنے کے ارادے سے گئے تھے۔
"میرے لیے تو ثمینہ کی طرح ہی رانیہ اور ثانیہ ہیں...... میرے گھر رہیں یا اپنی خالہ کے گھر...... بس خوش رہیں۔ انہوں نے کھڑے ہوتے ہوئے دونوں بھتیجیوں کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا اور تم آنکھیں لیے واپس اپنے گھر آ گئے تھے۔
"اب ایسے کیوں دل برداشتہ ہو کر بیٹھ گئے ہیں۔ خواہ مخواہ میں سوچ سوچ کر پریشان ہوتے رہیں گے اور اپنی طبیعت خراب کرتے رہیں گے۔ اکرم صاحب! یہ دلوں کے سودے اور رشتے ناتوں کے سلسلے تو ایسے ہی ہوتے ہیں، نصیب سے جڑتے ہیں۔ اس میں آپ کا میرا کیا دوش...... پھر آپ کا خون کا رشتہ ہے ان بچیوں سے وہ ختم کبھی بھی نہیں ہو سکتا۔ ساجدہ بچیوں کو لے کر چلی جائے گی تو آپ ان کے پاس ہو آئیے گا۔"
تائی صدیقہ سے اکرم صاحب کا ایسا دل گرفتہ انداز نہیں دیکھا جا رہا تھا سو قریب آن بیٹھیں اور طریقے سے سمجھانے لگی تھیں۔
"کیا ہوا امی! ابا کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟"
رضا جو اسی پل گھر میں داخل ہوا تھا۔ پریشان سا دونوں کے قریب چلا آیا تھا۔ اکرم صاحب کے چہرے پر کچھ تھا جو اسے بھی پریشان کر گیا تھا۔
"وہی ہوا جیسا میں نے کہا تھا۔ تمہاری چچی نے رشتے سے انکار کر دیا ہے۔"
تائی صدیقہ کو بھی اندر ہی اندر شاید کہیں

pklibrary.com

احساس تھا کہ ہوسکتا ہے ساجدہ اکرم صاحب کی بات مان لے ان کو بھی بیٹے کے حوالے سے تھوڑا سا افسوس ہوا تھا سو بجھے بجھے لہجے میں بولی تھیں۔

"اچھا ناں ابا! اس میں پریشانی والی کیا بات ہے؟ جب میں پریشان نہیں ہوں۔ ایک خواہش تھی۔ پوری نہیں ہوئی۔ ٹھیک ہے، اسی میں بہتری کی دعا کریں ہمارے اور ان کے لیے بھی، دنیا میں اگر ہماری ساری خواہشات پوری ہونے لگیں تو شاید مزہ ہی نہ ہے زندگی میں۔"

وہ باپ کی بھتیجیوں سے محبت جانتا تھا سو ان کے ہاتھوں کو تھام کر بولا تھا۔

"میں نے ایسی کسی بات کا تصور بھی نہیں کیا تھا جواب ایک دم میرے سامنے آ گئی ہے تو تھوڑا قبول کرنا مشکل لگ رہا ہے...... اور میں جانتا ہوں کہ تمہیں بھی اس بات سے کتنا دکھ پہنچا ہے......" وہ گہری سنجیدگی سے بولے تھے۔

"ہوا ہے افسوس ابا! مجھے بھی ہوا ہے لیکن چیزوں کی حقیقت کو جتنی جلدی تسلیم کرلیا جائے، اتنا ہی ہمارے حق میں بہتر ہوتا ہے۔ بہت سی چیزیں جو ایک وقت میں ہمیں دکھ دے رہی ہوتی ہیں، کچھ وقت بعد ہمیں پتا چلتا ہے اسی میں ہماری بہتری پوشیدہ تھی۔"

وہ تحمل سے بولا تھا۔ اکرم صاحب نے شفقت سے اپنی سمجھ دار اولاد کو دیکھا تھا۔ وہ بہت بار ایسی باتیں کر جاتا تھا کہ وہ حیران ہو کر سوچتے تھے کہ اتنی سمجھ داری اس میں یقیناً نعمت خداوندی تھی۔

"چائے ہی پلا دیں امی...... اور ساتھ کچھ ابا کی پسند کا بنا دیں......" رضا نے ایک طرف خاموش بیٹھی صدیقہ سے مخاطب ہو کر کہا تھا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں ......ضرور......" صدیقہ اٹھ کھڑی ہوئیں، رضا اکرم صاحب کو بتانے لگا کہ وہ اکیڈمی میں توسیع کا ارادہ رکھتا ہے اور کنسٹرکشن کے لیے اسے ان سے مشورہ درکار تھا۔ صدیقہ تائی نے دونوں کو نارمل موڈ میں بات کرتے دیکھ کر سکون کی سانس لی تھی۔

☆☆☆

"اماں!......"

"مجھے ناں، تھوڑا سا عجیب سا لگ رہا ہے......" ثانیہ نے ٹی وی دیکھتی ماں کا کندھا ہلا کر کہا تھا۔

"کیا عجیب سا لگ رہا ہے؟"

"یہی تائی کو اتنی جلدی اور دو ٹوک جواب دینا...... ابھی ٹال مٹول سے کام لے لیتیں۔ پھر جب مدثر سے میرا رشتہ ہو جاتا۔ بتا دیتے ان کو...... نجانے کیوں مجھے لگ رہا ہے کہ تایا جان کو بہت برا لگا تھا اس دن اور وہ یہاں سے جاتے ہوئے رو بھی رہے تھے......"

ثانیہ کو تائی کی اتنی پرواہ نہیں تھی مگر وہ اپنے تایا سے محبت کرتی تھی، سو تھوڑی سی شرمندگی سے بولی تھی۔

"اور پھر ایک بار رضا نے بھی کہا تھا کہ وہ مجھے پسند کرتا ہے...... مجھے تو اب ان کے گھر جاتے ہوئے بھی شرم آ رہی ہے......" کچھ یاد آنے پر اس نے کہا تھا۔

"اے ہے ثانی! کون سا تیر مار دیا میں نے ان کو...... انہوں نے بھی زبان سے بات کی، میں نے بھی زبان سے ہی جواب دیا...... اور کیسے ٹال مٹول کرتی؟ تم ہی بتا دو۔ وہ دونوں تو سیدھا سیدھا رشتہ لینے آ گئے۔ صاف صاف جواب نہ دیتے تو کیا کرتے ...... اور تمہارے تائے کا تو پتا نہیں، مگر صدیقہ تو گونگلو سے مٹی اتارنے آئی تھی...... رضیہ (ہمسائی) بتا رہی تھی کب سے ثمینہ اور تمہاری تائی رضا کے رشتے دیکھتی پھر رہی ہیں...... یہ تو ایک ڈرامہ تھا سوچا سمجھا بس......" وہ بے زاری سے بولی تھیں۔

"یہ گونگی کم بخت نشہ کرنے لگ گئی ہے کیا...... جب دیکھو، بستر پر پڑی نیند کے مزے لے رہی ہے ٹی وی کا شوق پالا تو ایک پل کو ٹی وی کے سامنے سے ہٹتی نہیں تھی۔ اب سونے پر آئی ہے تو مردوں سے شرط لگا کر سوئی ہی رہتی ہے، نہ دن دیکھتی ہے، نہ رات دیکھتی ہے، دیکھ لو، کہیں بخار و خار نہ ہو...... کھانا پینا بھی کم کر دیا ہے اس نے......"

pklibrary.com

انہوں نے عام سے انداز میں بات کی تھی۔ کوئی خاص پرواہ نہیں دکھائی تھی۔ ثانیہ بھی ساجدہ کی تربیت یافتہ تھی سوصرف سر ہلا دیا۔ بہن کے پاس جانا گوارا نہیں کیا تھا اس نے۔

''اماں! خالہ سے بھی کھل کر بات کریں رشتے کی...... مدثر سے کتنی بار کہا ہے، روز آج کل کرتا ہے......''

''ہاں اس بار تو آپا کی دہلیز پکڑ لینی ہے میں نے...... بتاؤں گی کہ ثانیہ کا تایا بھی رشتے کے لیے زور دے رہا ہے...... پچھلی بار ذکر کیا تو آپا نے کہا کہ مدثر کسی کام کاج سے لگ جائے تو دونوں بھائیوں کی اکٹھے ہی شادی کر دیں گی......''

کتنی ہی دیر دونوں ماں بیٹی نے مل کر کئی منصوبے بنائے تھے کہ کیسے اس چکر پر یہ رشتہ مہم کامیابی سے ہمکنار کرنی تھی۔

☆☆☆

''ارے آجاؤ بھئی ثانیہ، رانیہ...... اچھی بہنیں ہو تم...... کہا بھی تھا میں نے جلدی آجانا دونوں، لڑکی والوں پر رعب پڑتا ہے دولہا کی بہنوں کا......'' جیسے ہی وہ دونوں بہنیں تیار ہو کر تایا کے گھر داخل ہوئی تھیں تائی صدیقہ خوش دلی سے بولی تھیں۔

آج رضا کی رسم نکاح تھی جس کے لیے تائی صدیقہ خصوصی طور پر ان ماں بیٹیوں کو دعوت نامہ دے کر آئی تھیں۔ لڑکی ثمینہ کی نند کی بیٹی تھی...... ثمینہ بہت پہلے ہی سے اس لڑکی کا کہہ رہی تھی کہ وہ پڑھی لکھی بھی تھی اور سلیقہ شعار بھی...... شکل وصورت کی بھی بہت پیاری تھی...... ثانیہ کی طرف سے انکار ہوتے ہی انہوں نے وہاں آنا جانا شروع کر دیا تھا...... ثمینہ اپنی دیکھی بھالی بچی تھی اور تھی بھی بہت اچھی...... سو رضا کے رشتے کے لیے ثمینہ کے سسرال والوں نے رسمی طور پر سوچنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی تھی۔ سو جھٹ منگنی پٹ بیاہ والا معاملہ ہوا تھا۔ پندرہ دن بعد شادی کے فنکشن اسٹارٹ تھے۔ یوں میکے جانا ساجدہ کے لیے مزید تاخیر کا شکار ہو گیا تھا۔

''ارے رانیہ بچی! تمہیں کیا ہوا......؟ اتنی کمزور کیوں لگ رہی ہو...... رنگ اتنا پیلا زرد...... آنکھوں کے گرد حلقے...... بیمار تھیں تم......؟'' رانیہ سے ملتے ہوئے تائی صدیقہ کو تشویش ہوئی تھی وہ اشارے سے رانیہ سے پوچھنے لگی تھیں۔ وہ مضمحل سی مسکرا دی تھی۔

''ماں کہاں ہے تمہاری......؟'' تائی عجلت میں یہاں وہاں جاتے ہوئے رک کر پوچھنے لگیں۔

''آرہی تھیں ہمارے ساتھ...... گلی میں رضیہ خالہ مل گئیں۔ ان کے ساتھ ٹھہر گئیں۔ آتی ہی ہوں گی۔'' ثانیہ نے آہستہ سے کہا تھا۔

''واہ بھئی۔ میری بیٹیاں آئی ہیں...... لیکن میں ناراض ہوں بھئی...... بھائی کا نکاح ہے آج اور تم دونوں وقت کے وقت آئی ہو......''

تایا کمرے سے نکل کر آتے ہوئے خوش دلی سے بولے اور دونوں کو ایک ساتھ بازوؤں کے حصار میں لیتے لیتے تائی صدیقہ کے پاس آ گئے تھے۔

''ہاں جی! میں یہی کہہ رہی تھی دونوں کو...... چلو بھئی ثانیہ اندر کمرے میں جاؤ اور جتنے بھی مٹھائی کے ٹوکرے اور میووں کی ٹوکریاں ہیں، یہاں باہر لا کر رکھواؤ...... ستارہ اندر ہی ہے...... دو ٹوکرے رہ گئے تھے۔ اسے پیک کرنے میں گھنٹہ لگا دیا اس نے......''

انہوں نے ثانیہ سے کہا تو ثانیہ سر ہلاتے اٹھ گئی تھی...... جبکہ تایا اشاروں میں رانیہ سے بات چیت کر رہے تھے۔

''بھئی ثمینہ کی ماں! بھابھی آئیں تو میں اجازت لے لیتا ہوں ان سے...... شادی تک یہ سب یہیں رہیں ہمارے گھر...... بہنیں ہیں یہ رضا کی اور حق بنتا ہے ان کا اس گھر پر......''

وہ خوش دلی سے بول رہے تھے۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں......'' تائی صدیقہ مصروف مصروف سی بولی تھیں۔

''کیسی ہو ثانیہ؟''

وہ اچانک ہی سامنے آیا تھا۔ ثانیہ ٹھٹک کر رک گئی تھی اور نجانے کیوں شرمندہ سی ہو گئی تھی۔

''میں ٹھیک ہوں...... آپ کیسے ہیں؟''

''مجھے چھوڑو لڑکی! تمہاری پڑھائی کا کیا سلسلہ

pklibrary.com

بنا...... کوئی ڈیڑھ ماہ ہو گیا، تم نے نہ اپنی شکل دکھائی اور مجھے یقین ہے کہ کتابوں کی شکل بھی نہیں دیکھی ہوگی...... اور کالج بھی مجھے لگتا ہے، تم مارے باندھے ہفتے میں کوئی ایک آدھ دن ہی جاتی ہو...... ایگزیم کی ڈیٹ آ گئی ہے بھئی......"

"جی پڑھوں گی اب......" وہ آہستہ سے بولی تھی۔

"ہونہہ! شکر ہے، ان سے میری شادی نہیں ہوئی، کتنے دن بعد ملنے پر بھی وہی خشک اور بورنگ باتیں، اگر جو شادی ہو جاتی تو عمر بھر یہی بھاشن سننے پڑتے......" اس سے دل ہی دل میں جل کر سوچا تھا۔

"اچھا...... میں چلتی ہوں...... اندر جا رہی تھی ستارہ (ملازمہ) کے پاس...... کام بتایا تھا تائی جان نے......" اس نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا تھا۔

"ٹھیک ہے جاؤ......" رضا نے مسکرا کر کہا تھا اور لبوں میں بے وقوف بڑبڑا کر آگے بڑھ گیا تھا۔

"ایک مدثر ہے...... کتنی خوب صورت باتیں ہوتی ہیں اس کے پاس کرنے والی کہ گھنٹے منٹوں میں بدل جاتے ہیں مگر جی نہیں بھرتا...... اوہ مدثر سے یاد آیا کہ اس نے کہا تھا۔ تیار ہو کر سب سے پہلے مجھے پکس بنا کر بھیجنا......" اندر جاتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔

☆☆☆

اکرم صاحب کے بہت کہنے کے باوجود بھی ثانیہ ان کے گھر رکنے کے لیے رضامند نہیں ہوئی تھی۔ ہاں وعدہ ضرور کر لیا تھا کہ وہ روزانہ رانیہ کے ساتھ آ جایا کرے گی...... اصل میں ساجدہ کی روٹین اور ماحول ایسا تھا کہ تائی صدیقہ بھی برداشت نہ کرتیں...... وہ تینوں ماں بیٹیاں رات دیر تک ٹی وی کے آگے بیٹھی رہتیں...... جب دل چاہتا اٹھ کر کچھ بنا کر کھا لیتیں...... کام کا موڈ نہ ہوتا تو باہر سے منگوا لیتیں...... سارا سارا دن تو ثانیہ مدثر سے فون پر رابطے میں رہتی تھی...... ساجدہ جان بوجھ کر انجان بنی رہتیں......

رات دیر سے سونے کے باعث دن چڑھے تک سوئے رہنا ان کے معمولات میں شامل تھا اور تایا کے گھر رہ کر وہ اپنے معمولات میں تبدیلی گوارا نہیں کر سکتی تھیں۔ کام والی آ چکی تھی مگر ان کا ابھی ناشتا چل رہا تھا۔ آج تو ساجدہ خود ہی نکڑ سے جا کر حلوہ پوری لے کر آئی تھیں...... ثانیہ اور رانیہ کو بھی یہ ناشتا بہت پسند تھا۔ مگر کیا ہوا کہ ناشتے کے دوران پہلا نوالہ لیتے ہی ہی رانیہ کو الٹی آ گئی تھی اور وہ الٹیوں کا سلسلہ رکا نہیں تھا تاوقتیکہ وہ نڈھال ہو کر بستر پر نہ گر گئی تھی۔

"باجی! رانیہ کو ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ...... دیکھو تو کیسی پیلی پھٹک ہو گئی منٹوں میں......" ملازمہ نے صحن کی جھاڑو لگاتے ہوئے مشورہ دیا تھا۔

"ڈاکٹر کی دکان بھی تو کھلے ناں نسیمہ!...... کہا بھی تھا رات کو نگی کو کہ چاولوں کے ساتھ اتنا اچار مت کھاؤ...... مگر نہیں...... اس نے پہلے کبھی سنی ہے میری بات، جواب سنے گی...... لے کے ناشتے کا مزہ ہی کر کرا کر دیا......"

ساجدہ بے زاری سے بولی تھیں۔

"ابھی پھر ایسا کریں، تھوڑا سا پودینہ پانی میں ڈال کر ابال دیں...... میری ساس کا آزمودہ نسخہ ہے الٹی رک جائے گی۔ ڈاکٹر آئے گا تو پھر اس کو دکھا دینا......" نسیمہ ہمدردی سے بولی تھی۔

"اب پودینہ کہاں سے لاؤں میں...... چل ثانیہ! چائے بنا دے بہن کو......" ساجدہ نے ایک نظر بے سدھ پڑی رانیہ پر ڈالی تھی اور موبائل میں مصروف ثانیہ سے کہا تھا۔

"صدیقہ باجی کے گھر سے میں لے کر آتی ہوں۔ انہوں نے کیاری میں بھی دھنیا اور پودینہ، مرچیں اور ٹماٹر لگائے ہوئے ہیں اور خشک کر کے الگ رکھتی ہیں...... ایک بار میں جب بچے کے لیے لینے گئی تو مجھے بھی کافی سارا توڑ دیا تھا۔ جسے میں نے خشک کر لیا تھا۔"

نسیمہ ہی جھاڑو رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور دوپٹا ٹھیک کرتی ہوئی ڈیوڑھی پار کر گئی تھی۔

"ہونہہ...... اسی کے پاس اتنا فالتو وقت ہے یہ فضول کام کرنے کا...... دس روپے کی گٹھی مل جاتی ہے دھنیے کی اور بیس کی سبز مرچیں...... اب ان معمولی

چیزوں کے لیے کون اتنے کشٹ اٹھائے......" ساجدہ نے نجانے کسے سنایا تھا۔
"اے گونگی! کیسا محسوس کر رہی ہے اب؟ چل اندر چل کر لیٹ...... نسیمہ آجائے تو قہوہ بنا دیتی ہے...... پھر ڈاکٹر کے پاس لے کے جاؤں تجھے......" وہ رانیہ کے پاس آ کر اسے ہلا کر اشاروں میں بولی تھیں۔ نڈھال پڑی رانیہ نے مندی مندی آنکھوں سے ان کو دیکھا تھا پھر چکراتے سر کو تھام کر اٹھ بیٹھی تھی۔
"چھوڑ بھی دے ثانیہ اس موئے کی جان...... بہن کو پکڑ کر اندر لے جاؤ...... کم بخت الٹیوں نے بالکل ہی بے حال کر ڈالا بچی کو......"
اب کے ساجدہ کو تھوڑی سی تشویش ہوئی تھی رانیہ کی حالت دیکھ کر جب ثانیہ اس کو پکڑ کر اندر لے جا رہی تھی تو اس سے تو چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔
☆☆☆
"جی...... کیا کہہ رہی ہیں آپ ڈاکٹر صاحبہ......؟" ساجدہ نے ناگواری سے اس عورت کی شکل دیکھی تھی جو شاید ایل ایچ وی تھی مگر ایک لمبے عرصے ایک مقامی اسپتال میں جاب اور پارٹ ٹائم میں کسی گائنا کولوجسٹ کے پاس کام کرنے کے بعد اس نے اپنا کلینک محلے میں ہی کھول لیا تھا۔ الٹرا ساؤنڈ آپریٹس بھی رکھ لیا تھا۔ محلے کے لوگ اس کو لیڈی ڈاکٹر سمجھ کر مستفید ہوتے تھے...... ساجدہ پہلے محلے کے ہی ایک کمپاؤنڈر کے پاس رانیہ کو لے کر گئی تھی جس نے مریضہ کی حقیقت اور حالت کو بغور دیکھنے اور سننے کے بعد ساجدہ کو ڈاکٹر راشدہ کے پاس بھیجا تھا۔ باری آنے پر اس نے الٹرا ساؤنڈ کیا تھا اور رپورٹ دیکھنے کے ساتھ ساتھ ساجدہ سے جو سوال کیا تھا۔ اس نے تو ساجدہ کے چودہ طبق روشن کر دیے تھے۔
"بچہ بہت کمزور ہے بی بی! اس کو کھلاؤ پلاؤ...... ماں کی حالت ایسی ہوگی تو بچہ تو کمزور پیدا ہونا ہی ہے تم ماں ہو یا ساس......؟ وہ کاغذ پر دوائیاں لکھتے ہوئے معمول کے انداز میں کہہ رہی تھی۔
"مم...... ماں...... وہ بچہ کا کیا کہا آپ نے......؟" ساجدہ تھوک نگل کر بولی تھیں۔ ڈاکٹر راشدہ نے سر اٹھا کر ساجدہ کو دیکھا تھا۔
"پانچ ماہ کی حاملہ ہے بی بی یہ لیکن بچہ بہت کمزور ہے اور ماں بھی...... یہ دوائیاں باقاعدگی سے استعمال کراؤ۔ خوراک پر دھیان دو اس کی...... پندرہ دن بعد پھر چیک اپ کرا لینا اور اگلی بار بلڈ ٹیسٹ کروا کے آنا۔ مجھے خون کی کمی لگ رہی ہے اس میں......"
ڈاکٹر نے پرچہ ساجدہ کے بے جان ہاتھوں میں تھمایا اور اگلی مریضہ کو بلا لیا تھا۔ ساجدہ نے ایک قہر بھری نظر ساتھ بے زار اور نڈھال بیٹھی رانیہ پر ڈالی تھی اور اسے ہاتھ پکڑ کر اٹھایا تھا۔
☆☆☆
"ہائے میرے مولا...... یہ کیا ہو گیا؟ میں کیا سوچے بیٹھی ہوں اس گونگی منحوس کے لیے اور اس نے یہ کیا کر ڈالا...... کم بخت نہ کبھی باہر گئی...... نہ کوئی آیا گیا...... پھر کون......؟ کیا ہوگا؟ اب کیا کروں گی میں......؟ پانچ ماہ کی حاملہ......"
سارا راستہ ان ہی سوچوں میں گزر رہا تھا ساجدہ کا...... ان کا بس نہیں چل رہا تھا، وہ یہیں پر رانیہ کو مار مار کر اس بدبخت کا نام اگلوالیں جس نے نجانے کب نقب لگائی تھی اور ساجدہ کو برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔
گھر آتے آتے ساجدہ نے ہر طرح سے رانیہ کے شب و روز کا حساب لگا ڈالا تھا کہیں سے بھی تو کسی سراغ کا سرا نہیں مل رہا تھا۔
گھر آتے ہی ساجدہ نے نہ رانیہ کی حالت کا سوچا تھا نہ ہی ڈاکٹر کی ہدایت، بس پل پڑی تھیں اس پر، ساتھ ساتھ ان کے منہ سے پتا نہیں کیا کچھ نکل رہا تھا۔
"بول کم بخت...... کون ہے وہ......؟۔ کون ہے وہ ڈاکو، راہزن، وہ لٹیرا جس نے مجھ بیوہ کے سر میں خاک ڈال دی......" آوازیں سن کر حواس باختہ سی ثانیہ کمرے سے باہر نکل آئی تھی...... اور ساجدہ کو رانیہ کو بڑی طرح سے پیٹتے دیکھ کر بوکھلا گئی تھی۔
"چھوڑیں...... چھوڑیں اماں! مرجائے گی

گونگی...... کیا کیا ہے اس نے......؟ اس کی حالت تو دیکھیں، کیسے ہانپ رہی ہے......؟" ثانیہ نے کھینچ کر بڑی مشکل سے ساجدہ کو رانیہ سے الگ کر ڈالا تھا۔

"مرجانے دے ثانیہ! اس کو مرجانے دے نہیں تو یہ ہمیں مار ڈالے گی۔ اس کا گناہ۔"

"کیا کیا ہے اس نے......؟"

ثانیہ چیخ کر بولی تھی کہ ساجدہ نے تو کبھی بچپن میں بھی ان پر ہاتھ نہ اٹھایا تھا کجا کہ اتنی بے دردی سے مارنا کہ گونگی تڑپ تڑپ کر عجیب طریقے سے روتے ہوئے معافیاں مانگ رہی تھی۔

"ماں بننے والی ہے ثانیہ...... گونگی ماں بننے والی ہے...... کنواری ماں......"

ساجدہ کی بات جو انہوں نے ہانپتے ہوئے کہی تھی سن کر ثانیہ کسی چابی کی گڑیا کی طرح ساکت ہو گئی تھی اور جب غصے کا طوفان تھمنے کے بعد ثانیہ نے گونگی سے اشارے میں اس نقب زن کا نام پوچھا تھا۔ اس اشارے کو دیکھ کر دونوں ماں بیٹی صدمے سے گنگ رہ گئی تھیں۔

☆☆☆

"کمال ہے...... نجانے کہاں چلی گئی ساجدہ بچیوں کو لے کر...... پتا بھی ہے کہ آج بارات ہے، رضا کی۔" تین چکر اکرم صاحب نے خود لگا ڈالے تھے، دوبار رضا ہو کر آیا تھا مگر بیرونی دروازے پر صبح سے ہی تالا پڑا ہوا تھا۔

اکرم صاحب پریشانی کے عالم میں ٹہل کر کبھی بلند آواز سے خود کلامی کرتے تو کبھی زیر لب بڑبڑا کر وہ جاتے......

"چلی گئی ہوگی بنو میکے بیٹیوں کو لے کر۔ نئی بات تھوڑی ہے جو آپ حیرت زدہ ہو رہے ہیں......" تائی صدیقہ جل کر بولی تھیں۔

"آپ کو تو موقع چاہیے بھابھی کے خلاف بولنے کا...... اب رضا کی شادی والے دن تو نہیں جا سکتیں وہ مائیکے اور ثانیہ ہمیشہ مجھ سے مل کر جاتی ہے جب جاتی ہے نانی اماں کے گھر...... یہیں قریب ہی گئی ہوں گی کہیں بھابھی...... سوال یہ ہے کہ لیٹ کیوں ہو رہی ہیں؟......" اکرم صاحب نے بیوی کو کہہ کر خود کو بھی تسلی دی تھی......

"امی ٹھیک کہہ رہی ہیں ابا! چچی میکے ہی گئی ہیں...... ابھی رضیہ خالہ ملی تھیں، بتا رہی تھیں کہ ان کے بیٹے سے ٹرین کے ٹکٹس منگوائے ہیں...... ثانیہ کے خالو کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے شاید......" رضا نے آتے ہی بتایا تھا۔

"تو تمہاری چچی کیا ہارٹ اسپیشلسٹ ہے جو جا کر بہنوئی کا علاج کرے گی...... رک جاتی ایک دن نکل چلی جاتی...... تمہارے ابا کو بھی ہوا تھا ہارٹ اٹیک تب تو پندرہ دن خبر نہ لی یہاں کی......"

"چھوڑیں امی! ثمینہ کے فون پر فون آرہے ہیں کہ ہال کب تک پہنچنا ہے ہم نے...... اور کچھ زیور کے بارے میں بھی پوچھ رہی تھی......" رضا نے بات نبٹائی تھی۔

"بس نکلتے ہیں...... تمہاری چچی صاحبہ کے انتظار میں ہی روک رکھا ہے تمہارے ابا نے۔ اب وہ تو نکل لیں میکے...... لاؤ مجھے فون ملا کے دو، ثمینہ سے بات کروں میں......"

تائی صدیقہ بولتے ہوئے رضا کے قریب آئی تھیں۔ "آپ بھی بھاوج کے غم سے نکل کر تیار ہو جائیں اور رضا تمہارے کپڑے نکلے رکھے ہیں کمرے میں دیکھ لو...... کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتانا......"

تائی صدیقہ نے دونوں کو بھگتایا اور پھر رضا کے ہاتھ سے موبائل پکڑ لیا۔

"ہاں ثمینہ......"

وہ بولتے ہوئے صوفے پر جا کر بیٹھ گئیں۔ اکرم صاحب طویل سانس لے کر آگے بڑھ گئے۔

☆☆☆

بڑے سارے ہال میں وہ سب ہی جمع تھے۔ نہ صرف ماموں، خالہ ان کے بچے...... رانیہ، ثانیہ، ساجدہ کو لگ رہا تھا۔ گویا حشر کا دن آج کا ہی تھا۔

"میں صحیح کہہ رہی ہوں آپا! میری رانیہ جھوٹ نہیں

pklibrary.com

بولتی ...... وہ اگر مدثر کا کہہ رہی ہے تو پھر ...... مدثر ......"

"بس بس ساجدہ! میں اگر بہن کا لحاظ کر کے چپ ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تمہاری آوارہ بیٹیوں کے کہنے میں آ کر میں اپنے بچوں کو قصوروار ٹھہراؤں گی ......"

خالدہ آپا نے بات نہیں کی تھی، کوڑا مارا تھا جو بیک وقت ثانیہ اور ساجدہ دونوں کو اپنے دل پر محسوس ہوا تھا۔

"مدثر کو لڑکیوں کی کمی تھوڑی ہے جو وہ اس گونگی پر منہ مارے گا ......" خالہ کے لہجے میں حقارت تھی جس نے ساجدہ کو تڑپا دیا تھا۔

"لڑکیوں کی کمی نہیں ہے آپا! لیکن بچے بہک بھی تو سکتے ہیں ...... اور بچوں کی غلطی پر ان کو سمجھانا چاہیے اور غلطی سدھارنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ میرا اور کوئی تقاضا نہیں ہے بس مدثر میری رانیہ سے شادی کر کے اس کی زندگی برباد ہونے سے بچالے۔"

"واہ خالہ واہ! کتنی چالاک ہو تم ...... اپنی بیٹی کا گند کتنی خوب صورتی سے مجھ پر تھوپنے کے چکر میں ہو ...... ارے یہ گونگی ہو یا ثانیہ، دونوں ہی مجھ پر ڈورے ڈالنے کے چکر میں تھیں ...... بہانے بہانے سے میرے کمرے میں آجاتی تھیں اور اس ثانیہ کی تو میں آپ کو تصویریں دکھادوں اور میسج پڑھوادوں جو یہ مجھے خوامخواہ بھیجتی رہتی ہے، توبہ توبہ میں لڑکا ہو کر شرم سے پانی پانی ہو جاتا ہوں۔ مجھے تو بھئی معاف ہی رکھو کہ میں تمہاری کسی بیٹی کے گناہ پر پردہ ڈال کر عمر بھر زبردستی کا ڈھول گلے میں لٹکا کر پھروں گا ......"

مدثر کی بات سن کر ثانیہ کا جی چاہا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ نجانے کیوں اس نے مدد کے لیے سب کو دیکھا تھا کہ کوئی تو ہو جو اس کی مدد کو آئے ...... اس کی گواہی دے ...... مگر وہ سب تماشا دیکھنے والے تھے، تضحیک اڑانے والے تھے، الزام لگا کر پتھر پھینکنے والے تھے۔ وہ جنہیں وہ آج تک اپنا کہتی اور سمجھتی آئی تھی۔

اسے اس پل تایا یاد آئے۔ دل کو کسی نے مٹھی میں پکڑ کر بھینچ ڈالا تھا کہ اماں! ...... خالدہ خالہ کے پاؤں میں بیٹھی نجانے کیا کہہ کر رو رہی تھیں ...... ثانیہ کی سماعتوں نے سننے سے انکار کر ڈالا تھا۔

☆☆☆

وہ ساری رات ساجدہ کی گونگی کو مارتے اور کوسنے دیتے گزری تھی اور وہ جو سمجھی تھیں کہ حشر کا دن تمام ہوا تو وہ غلط تھیں ...... اگلے دن اسٹور والے کمرے میں پنکھے سے لٹکی گونگی کی لاش دیکھ کر احساس ہوا کہ قیامت ایک بار نہیں بار بار بھی آ سکتی تھی ......

"اماں! تایا ابو کو بلاؤ ...... ان کو بتاؤ رانیہ مر گئی ...... رضا کو بلاؤ ...... وہ آ کر اپنی بہن کے جنازے کو کندھا دے ......" لٹکی لاش کی ٹانگوں سے لپٹ کر ہذیانی انداز میں یہ ثانیہ نے کہا تھا۔

"نہ ...... نہ ...... ثانیہ! کیا جواب دوں گی میں اکرم کو کہ کیسے رول دیا میں نے اس کے بھائی کے انمول ہیروں کو کیچڑ میں ......" ساجدہ نے خوف زدہ انداز میں منہ پر انگلی رکھ کر کہا تھا۔

رانیہ کی ایسی موت کے تین دن بعد خالدہ خالہ نے کہا تھا کہ انہوں نے بڑی مشکل سے مزمل کو ثانیہ سے شادی کے لیے منایا ہے مگر ساجدہ کو شادی سے پہلے اپنا مکان مزمل کے نام کرنا ہوگا اور ثانیہ وعدہ کرے گی کہ وہ زندگی ویسی ہی گزارے گی جیسی مزمل چاہے گا ورنہ وہ اسے طلاق دینے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگائے گا ......

اور ایک عورت کی بیٹیوں جیسی قیمتی متاع کی تربیت جیسے اہم منصب سے چشم پوشی نے نہ صرف ساجدہ بلکہ ثانیہ کو بھی پل پل اذیت کی دہکتی بھٹی سے گزارا تھا ...... اور زندگی جو ثانیہ کے لیے ایک جہنم کا روپ لے کر آئی تھی اس میں قدم قدم پر انگارے تھے جس پر وہ اسی دن سے چلتی آ رہی تھی جس دن سے اس کی شادی مزمل سے ہوئی ...... نجانے انگاروں پر برہنہ پا چلنے کا وہ عمل کب تک جاری رہنا تھا ...... شاید اس کی موت تک۔

☆☆

pklibrary.com

سمیرا حمید

پانچ بھائیوں کے بعد پیدا ہونے والی چراغ اپنے بھائی بہرام کی چہیتی ہے، چچی کی لاڈلی، بہت منتوں مرادوں کے بعد پیدا ہوئی۔ اس کی شرارتوں سے بہرام حویلی کے سارے مکین عاجز تھے۔

بہرام کو اپنی لاڈلی بہن چراغ سے جتنی محبت ہے، بیوی سے اتنا ہی دور ہے۔ اس نے سختی سے تاکید کر رکھی تھی کہ چراغ کو کچھ نہ کہا جائے۔ اس کو ذاتی وکٹوریہ بھی دلوادی تھی۔ جس پر سوار ہو کر وہ شہر میں ہوا خوری کے لیے نکلتی تھی۔ ایک دن اس سے ایک نوجوان ٹکراتا ہے۔

وہ نوجوان جس کا نام شمس ہے، شاہی مسجد کے امام صاحب کا بیٹا ہے۔ شاہی مسجد حویلی کے سامنے ہے۔

چراغ کی شرارتوں سے حویلی کے سارے مکین تنگ، ہیں وہ کسی کا خاطر میں نہیں لاتی۔ حسن اور دولت کے نشہ نے اس کے مزاج کو دو آتشہ کر دیا ہے۔

چراغ کے بھائی نے اسی نوجوان کی پتنگ کاٹی تو وہ رات کو اپنی پتنگ لینے آ گیا۔ اس وقت چراغ وہ پتنگ اڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ دونوں میں تکرار ہوئی۔ شمس کو اپنی زیادتی کا احساس ہوا تو وہ دریا کنارے پر معافی مانگنے آیا۔

چراغ اس سے کہتی ہے کہ سامنے جو شیش محل ہے، وہ اس کا گھر ہے۔ وہاں آ کر معافی مانگے تب وہ معاف کرے گی۔

شمس شیش محل میں جاتا ہے تو وہاں قید کر لیا جاتا ہے۔ اسے شدید اذیتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مولوی صاحب جنہیں شمس کی ماں سے عشق تھا، اس کی وفات کے بعد دنیا تیاگ دی تھی۔ شمس کے غائب ہونے سے نیم دیوانے ہو گئے۔ یہ ان کی دعا تھی کہ شمس زندہ بچ گیا۔

چراغ کی منگنی اپنے خالہ زاد سے ہو چکی ہے، وہ اسے اوٹ پٹانگ خط لکھتی ہے تو اماں بی اس پر خفا ہوتی ہیں۔

شمس بازار جاتا ہے تو وہاں محبوب جان کو دیکھا جو خطوط نویسی کرتا ہے۔

شمس خط لکھواتا ہے۔ محبوب خان خط لکھنے کے ساتھ پہنچانے کے بھی دام مانگتا ہے لیکن وکٹوریہ کا نام سنتے ہی منع کر دیتا ہے۔ شمس دام بڑھا دیتا ہے اتنے پیسے دیکھ کر محبوب خان سکے اٹھا کر رکھ لیتا ہے۔ کئی دن انتظار کے بعد وکٹوریہ نکلتی ہے وہ اس کے پیچھے بھاگتا ہے۔ اور خط ڈال کر بھاگ جاتا ہے۔

خط پڑھ کر چراغ سمجھ جاتی ہے اور خاص ملازم سے معلوم کرتی ہے وہ بتا دیتا ہے کہ محبوب خان کوچہ جب میں بیٹھ کر خط لکھتا ہے۔ اسے بلا کر معلوم کرتی ہے اور اس سے جوابی خط لکھواتی ہے۔

امان کو بتاتی ہے کہ فرہاد منگیتر کو خط لکھواتا ہے۔ امام صاحب کے ہاں شمس کی شکایت کرنے جاتی ہے وہاں ان کی جگہ شمس سے ملاقات ہوتی ہے۔ مسجد سے جوابی خط آتا ہے کفایت اماں کے پاس لے جاتی ہے چراغ کی لاکھ کوشش کے باوجود اماں خط حور سے پڑھوا لیتی ہیں۔ کوچوان بتا دیتا ہے کہ چراغ مسجد گئی تھی۔

pklibrary.com

چراغ شمس کو چیلنج کرتی ہے کہ ہمت ہے تو حویلی آکر سلام کرو۔ شمس امام صاحب سے کہتا ہے کہ اسے حویلی میں نوکری کرنی ہے۔ امام صاحب بیرام سے کہتے ہیں بیرام اسے باغ کی دیکھ بھال کے لیے رکھ لیتا ہے حویلی والے پریشان ہو جاتے چراغ فرہاد کو نسبت ختم کرنے کی دھمکی دیتی ہے۔

چراغ سمجھ جاتی ہے کہ دیواروں پر اس کی تصویر کس نے بنائی ہے۔ وہ رات میں اس کا دماغ ٹھیک کرنے جاتی ہے۔ شمس اسے کہتا ہے کہ وہ اس کی شکایت کردے گا۔ وہ شمع دان شمس کے سر پر مارنا چاہتی کہ کوئی چراغ کا نام غصہ سے لیتا ہے وہ دھک سے رہ جاتی ہے۔

چچی چراغ سے خفا ہوتی ہیں چراغ عہد کی انگوٹھی پہنا کر انہیں اپنا بنا لیتی ہے۔ چراغ ہر ممکن حربہ آزماتی ہے پاک دامن کی شادی میں جانے کا۔ بیمار بن گئی کھانا پینا چھوڑ دیا۔ لیکن سب بے اثر رہا وہ آکری چال چالتی ہے کشتی رانی کے لیے سب کو لے جاتی ہے۔ ملازمین کے ساتھ شمس بھی جاتا ہے۔ وہ کفایت کو سیب سر پر رکھ کر نشانہ لینے کا کہتی ہے وہ نہیں مانتی۔ چراغ کی نظر شمس پر پڑتی ہے وہ اسے کھڑا کر دیتی ہے اور سیب کے بجائے اس کے سر کان آنکھ کا نشانہ لیتی ہے۔ اس سے فارغ ہو کر وہ سیر کو آگے جاتی ہے پرندوں کو کمان سے پتھر مارتی ہے کتے نظر آتے ہیں ان کو بھی مارتی ہے وہ اس کے پیچھے لگ جاتے ہیں دریا میں بمشکل کودتی ہے شمس اس کی جان بچاتا ہے۔ چراغ کا شادی میں جانے کا خواب پورا ہو جاتا ہے۔

خبر ملتی ہے کہ لاہور سے سامان لے کر ملازم آیا ہے۔ چراغ رات کو چھت پر ٹہلتے ہوئے لکھنؤ کی روشنیاں دیکھ رہی تھی کہ کوئی اس کے سامنے گھڑیال سے کودتا ہے۔

نویں قسط

یہ ایک سوگوار لمحہ تھا۔ یہ ایک حقیقت شناس دیکھا لیکن شمس کی طرف دیکھنے سے باز رہی۔ آبنوس کیفیت تھی۔ چراغ نے خوف سے آبنوس کی طرف کے آخری الفاظ کہ وہ کھیل ختم کر چکی ہے، نے اسے

سہادیا۔

آبنوس کتنا کچھ جان جاتی ہے۔ وہ حقیقتوں اور دلوں کے سارے بھید پالیتی ہے، بہت برا کرتی ہے۔ چراغ کی آنکھوں میں نمی در آئی، وہ جانتی تھی کہ وہ رو بھی دے گی۔

اسے پہلی بار شدت سے احساس ہوا کہ وہ کیسی کیسی فاش غلطیاں کر چکی ہے۔ اب یہ تمام غلطیاں اس کے گلے پڑ جانے کو ہیں۔ آخر اس نے بے فکری کا زمانہ ہاتھ سے جانے کیسے دیا۔ تیز تیز قدم اٹھاتی وہ خیمے میں واپس آئی۔

''مجھے جلدی سے کچھ اوڑھا دو کفایت!''

بیماروں کی طرح بستر پر گر گئی۔ دونوں ہتھیلیوں کو آپس میں سختی سے پیوست کرلیا۔ کفایت نے جلدی سے اسے لحاف اوڑھا دیا، جس میں وہ سر تک چھپ گئی۔ لحاف کے اندر اندھیرے میں آنکھیں میچے، وہ لرز رہی تھی۔ اندھیرا، حقیقت، تکلیف، ان کی موجودگی میں وہ ایسی نیند سونا چاہتی تھی جس سے بیداری کے بعد سب کچھ پہلے جیسا ہو چکا ہو گا۔

اس نے یاد کرنا چاہا کہ وہ ایک چھوٹی سی بچی ہے، جسے دوسروں کو تکلیف پہنچا کر خوشی ملتی ہے۔ وہ بڑے سے بڑا نقصان کر کے آنکھیں مٹکا کر شانے اچکا دیتی ہے۔ کل کی صبح وہ جاگے گی تو آنکھیں مٹکا کر شانے اچکا دے۔ وہ سنگدلی کی انتہا کر دے گی۔

آبنوس نے اندر آکر لحاف کھسکا کر اس کی طرف دیکھا، اس نے سختی سے آنکھیں میچ رکھی تھیں۔ کفایت دیکھ رہی تھی کہ آبنوس کتنی فکر مند ہو چکی ہے۔ اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا، پیشانی گرم ہو چکی تھی۔ چور بخار واپس لوٹ آیا تھا۔

''اس کا بخار پھر سے پلٹ آیا ہے۔'' کفایت کی طرف دیکھ کر کہا۔

''اب پھر......''

آبنوس کی بے تاثر نظریں خلا میں معلق رہیں۔

''پیشانی ٹھنڈی کروں؟''

آبنوس خاموش رہی، سوچتی رہی۔ ''نہیں...... صبح دیکھتے ہیں، کیا ہوتا ہے۔''

''ان کا بخار بڑھ گیا تو۔'' کفایت کا دل بیٹھنے لگا تھا۔

آبنوس ان سنی کر کے باہر آگئی۔ وہ تیزی سے قدم اٹھاتی اپنے خیمے کی طرف جا رہی تھی۔ پلٹ کر اس طرف دیکھنے سے اجتناب کر رہی تھی جس طرف شمس کھڑا تھا۔

منہ پر طمانچہ کھانے والے نے زندگی میں پہلی بار کسی عورت کا یہ انداز دیکھا تھا۔ وہ فیصلہ نہیں کر پایا کہ عورتیں زیادہ جرات مند ہوتی ہیں یا مرد۔ مرد ریاستیں سنبھالتے ہیں اور عورتیں گھر۔ اور اگر گھر درستی سے سنبھل جائیں تو پھر ان ہی گھروں سے ریاستیں سنبھالنے والے نکلتے ہیں۔ تو کمال کس کا ہو۔ عورت کا؟

اس کی آنکھیں ضبط سے سرخ ہو رہی تھیں۔ ہر چیز پر غور کرنے والا اس بات پر غور نہیں کر سکا کہ اسے کھیل ختم ہو جانے کی تکلیف تھی یا اس طمانچے کی۔

اس نے ہمیشہ اپنی مرضی کی تھی کہ اسے کسی چیز کے نقصان کا خوف نہیں رہتا تھا، اپنی جان کا بھی۔ وہ جو چاہے کر سکتا ہے، وہ ڈرتا نہیں اور یہی چیز اسے عجیب بناتی ہے۔

ڈر ہونا چاہیے، کم سے کم کسی کے نقصان کا۔ دوسروں کی پامالی کا ڈر ضرور رکھنا چاہیے۔ زندگی قلعے کی مانند نہیں ہے کہ کوند پھاند کر کسی سے بھی حساب برابر کرلیا جائے۔

''یہاں سے اسی وقت واپس لوٹ جاؤ، میں بہرام کو خط لکھ کر تمہاری غیر موجودگی کی وجہ سمجھا دوں گی۔''

وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہہ چکی تھی۔ وہ بھی اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا لیکن اب وہ ان سے خوف زدہ ہو چکا تھا۔

''تم گنوار ہو، تمہیں دوستی کا قرینہ ہے نہ دشمنی کا۔ کل کا سورج طلوع ہو تو مجھے تمہاری شکل دکھائی نہیں دینا چاہیے۔''

وہ آگے بڑھ گئی۔ وہ اس کے فرمان کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ عورت جو اسے کھلے دل سے پسند کرتی تھی، دوستانہ انداز میں باتیں کرتی تھی، وہی عورت اسے تھپڑ مار کر بہت کچھ جتا کر جا چکی ہے۔ کس لیے؟

☆☆☆

چراغ شاید سو چکی تھی، کفایت خیمے کی اوٹ میں کھڑی اس طرف دیکھ رہی تھی جس طرف شمس کھڑا تھا۔ فرنگی لڑکیاں جا چکی تھیں۔ ہر طرف سناٹا تھا، وہ اکیلا کھڑا تھا۔ اس پر رشک آتا تھا، اس پر غصہ بھی آتا تھا، لیکن اس وقت اسے ایسے کھڑے دیکھ کر ترس آ رہا تھا۔ وہ بہت تنہا ہے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی محبت کا کشکول کبھی نہیں بھرا محسوس کیا جا سکتا تھا۔

کفایت کا دل چاہا کہ وہ چل کر اس کے قریب جائے، اور کہے کہ

جو بھی دل میں ٹھان لی ہے جانے دو، واپس لوٹ جاؤ۔ دنیا والوں میں بہت کچھ چلتا رہتا ہے، لیکن محل والوں میں بس ایک چیز چلتی ہے، حکم۔ حکم عدولی پر ایک اور حکم۔ وہاں کے قاعدے قانون نہیں بدلتے، تم دیہاتی ہو، کچھ سمجھتے نہیں ہو۔ کیسے آبنوس نے تمہیں سر پر بٹھالیا پھر سر سے اتار پھینکا۔ مجھ سے پوچھو کہ کیسے لمحوں میں ہم دو کوڑی کے ہو جاتے ہیں۔ جب تک ایک پاؤں پر کھڑے رہتے ہیں اچھے لگتے ہیں، ذرا سا چوک جاتے ہیں تو خطا کار مانے جاتے ہیں۔ دنیا میں غلام اور کم حیثیت کا نصیب کم و بیش ایک جیسا ہوتا ہے شمس! تم مسجد کے امام کے بیٹے ہو، وہ نیک نام مشہور ہیں لیکن ان کی نیکیاں بھی تمہارا مقام نہیں بدل سکتیں۔

☆☆☆

تاج سے روانگی کی صبح عجیب تھی۔ ہر طرف چہل پہل تھی اور بے دلی بھی، جیسے سارا شہر ہی سمیٹا جا رہا ہو۔ یہاں آ کر وہ پاک دامن کی شادی تک کو بھول چکی تھیں۔ وہ یہ بھی بھول چکی تھیں کہ وہ کسی لاہور، کسی دلی اور کسی لکھنؤ سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کے پیچھے خاندان ہے، ان کی واپسی کا انتظار کیا جا رہا ہے۔

انہوں نے بس یہ سوچا کہ یہ ان کی بے فکری کا زمانہ ہے، اس میں آگے اور پیچھے کی کوئی فکر نہ پالی جائے۔ کفایت کو آبنوس سے خاص شاباش ملی تھی، جس پر وہ خوش نہیں ہو سکی۔ دل چاہا پوچھے۔ چار اور سنا دیتیں، تھپڑ مارنے کی کیا ضرورت تھی۔ آپ نازک مزاج لوگ ہیں، دینے پر آئیں تو تخت و تاج دے دیں، ورنہ معمولی خطاؤں پر جان ہی لے لیں۔

اسے یقین تھا، اس نے یہ سب آبنوس سے کہا تو اس کے اپنے گال سرخ ہو جائیں گے۔ آقا کی فطرت سے شناسائی ہو سکتی ہے لیکن اس کے ارادوں سے نہیں۔ غلام فطرت اور ارادے دونوں سے بچ کر رہتے ہیں۔

چراغ ہشاش بشاش اٹھی تھی، رات ایک ڈراونا خواب تھی، اس نے بھلا دی تھی۔ کفایت نے اس کا بخار دیکھا تو وہ غائب تھا۔ اس نے رات ہی رات میں چور بخار اتار پھینکا تھا۔ تمام لوگ واپسی کے لیے تیاریاں کر رہے تھے، کچھ اداس تھے، کچھ پرامید کہ دوبارہ آئیں گے۔ انسان خوش گوار لمحات کو یاد رکھتا ہے، اگر خوشی کا زمانہ آزادی کا زمانہ بھی ہو تو اس کے اختتام پر دل بھر آتا ہے۔

وہ سب جانتے تھے کہ جلد ہی زندگی پرانے معمول پر لوٹ آئے گی۔ تاج کی یادیں ہوں گی، باتیں ہوں گی لیکن دوبارہ یہ زمانہ نہیں ہوگا۔ چراغ نے اپنا سامان خود سمیٹنا شروع کر دیا تھا۔

"یہ میرا کام ہے۔" کفایت نے بڑی حیرت سے اسے کام کرتے ہوئے دیکھا۔

"تم کچھ زیادہ ہی کام کی ہو۔" منہ بنا کر کہا۔

"آپ ناراض ہیں؟"

"تم سے کہا تھا۔ دفع ہو جاؤ کیوں آئی تھیں میرے پیچھے۔"

pklibrary.com

''کیونکہ جس وقت آپ باہر نکلی تھیں اس وقت میں نے کسی کو درخت سے کودتے دیکھا تھا۔''
رات کی بھولی ہوئی باتیں پھر سے سامنے آکر کھڑی ہو گئیں۔اس کی پیشانی پر گرم لہر کوند کر گزری۔
''وہ چور ہی نہیں، بے ایمان بھی ہے، وہ خیمے کے سامنے درخت پر چڑھ کر بیٹھا رہتا ہے۔'' کفایت نے کہا۔
''تمہیں خوش ہونا چاہیے،تم اس کی بہت بڑی حمایتی رہی ہو۔''
''وہ پرانی باتیں ہیں،آج کل مجھے اس سے سخت نفرت (شکایت) ہے۔''
چراغ نے کفایت کی طرف دیکھا۔''یہ نفرت کا سلسلہ کب شروع ہوا؟''
''جب اس نے آپ کو قید کیا، کتنی تکلیف دی آپ کو۔''
''مجھے کوئی تکلیف نہیں پہنچا سکتا۔''اس نے نخوت سے کہا۔
''میں اسے شیر سمجھتی تھی لیکن وہ بھی چال باز لومڑ نکلا، مجھے تکلیف ہوئی، انسان کی کھال میں جانور نہیں سمانا چاہیے۔''
''شیر بھی جانور ہی ہوتا ہے۔''اس نے اپنا بستر نفاست اور صفائی سے باندھ لیا تھا۔
کفایت کان کھجانے لگی۔''شیر کی بات الگ ہے۔''وہ وجہ نہیں سمجھا سکی کہ شیر جانور ہی ہے لیکن اس کی بات الگ کیسے ہے۔ چراغ کا سلیقہ قرینہ دیکھ کر کفایت ششدر رہ گئی تھی۔
''آپ جان بوجھ کر یہ ظاہر کرتی ہیں کہ آپ پھوہڑ ہیں، چچی ٹھیک کہتی ہیں، جو نت نئی شرارتیں کر سکتا ہے،وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔''
''شرارتیں...... پہلے تو تم انہیں فساد کہتی تھیں۔''
کفایت نے آنکھیں مٹکائیں۔ دراصل کہنا اب بھی وہ فساد ہی چاہتی تھی لیکن یہ موقع کچھ مناسب نہیں تھا۔چور کو تھپڑ پڑ سکتا ہے تو اس کے ساتھ تو نہ جانے پھر کیا کچھ ہی ہو سکتا ہے۔اس کا کوئی آگے پیچھے بھی نہیں ہے۔ کفایت اس کی مدد کروانے لگی۔سامان میں ایک کاغذ کے پرزے پر نظر پڑی تو اپنی بدتمیز عادت کے مطابق اسے پکڑ لیا۔
''یہ کاغذ کس سلسلے کا ہے؟''
چراغ نے شدت سے وہ پرزہ اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔اس کے ناخن کفایت کی ہتھیلیوں میں نشان چھوڑ گئے۔وہ آہ بھر کر رہ گئی۔
''چراغ بی بی! یہ ظلم ہے...... یہ زیادتی ہے......''اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔
چراغ کو افسوس ہوا،مٹھی میں بھینچے پرزے کی طرف دیکھا۔
''ہاں یہ زیادتی ہے۔''اس نے زیر لب کہا۔کفایت آستین سے گیلی آنکھیں پونچھتی رہی، اس کا سامان سمیٹتی رہی۔ وہ خاموش اس کی شکل دیکھنے لگی۔کیسی عجیب بات تھی کہ وہ پہلی بار کفایت کی بھیگی آنکھیں دیکھ رہی تھی۔
''تکلیف بری ہوتی ہے نا کفایت؟''
''جن کی زندگیوں میں تکلیفوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے،ان سے کیا پوچھتی ہیں،دو دن خوشیاں ٹھہر جائیں تو ہمیں وہ عجیب لگتی ہیں۔''
چچی کہتی ہیں''کفایت اپنی تنہائی ظاہر نہیں کرتی لیکن اندر ہی اندر وہ بہت کچھ محسوس کرتی ہے۔انسان امیر ہو،غریب ہو لیکن پیشانی پر ہاتھ رکھنے والا کوئی تو ہو۔دل پر چوٹ پڑے اور بھاگتے ہوئے اس کے پاس جائیں،ایسا عزیز کوئی تو ہو۔''
☆☆☆
چور ان کی زندگیوں سے جا چکا تھا،اور وہ جا چکا ہے۔اس کا اندازہ بھی صاف صاف ہو رہا تھا کیونکہ وہ ان سے کچھ ایسا چرا گیا تھا کہ انہیں اپنی زندگیاں خالی خالی لگنے لگی تھیں۔فرنگیوں کے شہر کی چہل پہل ویسی ہی تھی۔ان کی فرنگی چہچہاہٹیں آزاد تھیں۔حیران کن بات تھی کہ ان کے گود کے بچوں کی

pklibrary.com

آنکھوں میں ایسی شناسا چمک تھی جیسے وہ جانتا ہے کہ وہ آقاؤں کی نسل سے ہے۔ حیثیت ایسی چیز ہے جس کا احساس گہوارے میں بھی ہو جاتا ہے۔

فرنگی عورتیں دل لگی کے لیے ڈولی میں بھی سفر کرتی دیکھی گئیں۔ وہ ہنستیں، کھلکھلاتیں اور پھر ڈولی کے پردے کھسکا کر باہر جھانکتیں۔

ڈولی آرام دہ سواری ہے، اور ہندوستان کی پہلی ایسی سواری ہے جو مکمل طور پر عورتوں سے منسوب ہے۔ وہ اس نسوانی برتری پر بہت خوش ہوتی تھیں۔ ان کے لیے حیران کن تھا کہ جس قوم کو وہ گنوار سمجھتے ہیں، وہ عورتوں کے لیے کچھ خاص بھی رکھتے ہیں۔ کفایت کا دل ان کے گھوڑوں پر تھا، ان کا دل ان کی ڈولیوں پر تھا۔ انسان کا دل کتنے رنگ بدلتا ہے۔

دریا کنارے، خیموں کے شہر سے ان کا اسباب سمیٹا گیا تو جیسے ایک زمانہ ہی سمٹ گیا۔ صبح اٹھتے ہی اس دریا کو دیکھنا کیسی حسین عادت بن چکی تھی۔ ملکہ کے مقبرے کے لیے دریا کا کنارا ہی کیوں چنا گیا؟ کیا اس لیے کہ دریا کا بہاؤ علامت ہے کہ وقت کبھی ایک جیسا نہیں رہتا۔ بادشاہ ہو یا فقیر وقت سب بہالے جائے گا۔ جو آج ہے، وہ جلد ہی گزشتہ ہو جائے گا۔

انسان زمین کے اوپر جاہ و جلال سب رکھتا ہے، لباس سے، انداز سے، مرتبے سے، لیکن زمین کے نیچے وہ صرف ایک ہی حیثیت رکھتا ہے، مردہ کی۔ قبریں پر تعیش ہوں یا بدحال، سب پر کتبہ موت کا ہی لگتا ہے۔

''کیسے کیسے نواب بادشاہ اس تاج محل میں آتے ہیں، لیکن ممتاز اور شاہ جہاں کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔ جن کی زندگیوں میں عام انسان ان کے محلوں میں قدم نہیں رکھ سکتا تھا، وہی عام انسان پھٹے پرانے کپڑوں میں ان کی قبروں پر جا سکتا ہے۔ زندگی برابری نہ دے لیکن موت ضرور دیتی ہے۔''

کفایت نے اتنی سنجیدگی سے کہا کہ ان تمام کی گردنیں اس کی سمت گھوم گئیں۔ اس کے کہنے کا انداز کہتا تھا کہ اسے حیثیت کا فرق کھلتا ہے۔ اور حیثیت کا فرق انہیں ہی کھلتا ہے جنہیں کم حیثیت ہونے کا احساس دلایا جاتا ہے۔ وہ سب دریا کے کنارے کھڑی تاج کا آخری نظارہ کر رہی تھیں۔

''سارے فرق زندگی کے ساتھ ہوتے ہیں کفایت!'' کفایت کے انداز سے آبنوس بہت کچھ سمجھ گئی۔

''آپ نے غور کیا کہ ملکہ نور جہاں ملکہ ممتاز کی پھوپھی تھیں، جہاں انہیں بے مثال عروج ملا وہیں ملکہ ممتاز کو بے مثال حیثیت ملی، ایک وہ خاتون کہ ہندوستان میں پہلی بار ان کے نام کے سکے جاری ہوئے، اور دوسری بھتیجی کہ اس کے لیے تاج محل تعمیر ہوا۔ یہ خون کا اثر تھا یا پھر نصیب کا؟''

آبنوس ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گئی۔ ''ایسے اتفاقات حیران کن ہیں، یہ ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ زندگی میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''

''کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ میں آئندہ چند سالوں میں نواب کی بی بی بن جاؤں؟'' کفایت نے دوپٹے کا پلو دانت میں دبا لیا۔

حور نے ہنسی چھپائی لیکن آبنوس نے سنجیدگی سے کفایت کی طرف دیکھا۔ ''کیوں نہیں ہو سکتا ...... لیکن تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے کہ نواب زادیاں خوش باش رہتی ہیں؟ میں تمہیں رشک سے دیکھتی ہوں جو تمہیں حاصل ہے، وہ مجھے میسر نہیں ہے۔''

کفایت نے حیرت سے آبنوس کی طرف دیکھا۔ ''مجھے کیا حاصل ہے؟''

''تمہیں وہ آزادی حاصل ہے جس کا مزا میری حیثیت کی عورت خواب میں تو چکھ سکتی ہے لیکن حقیقت میں نہیں۔''

''مجھے ایسی کڑوی حقیقت نہیں چاہیے، آجائیں میری جگہ، چکھ لیں اس میٹھے پھل کا مزا۔'' اس نے منہ بناتے جل بھن کر کہا۔ ''سب

دولت مند کہتے ہیں کہ ہم سے پوچھو، دولت ہی سب کچھ نہیں ہوتی، ہم غریب کہتے ہیں، ہم سے پوچھو دولت سب کچھ نہ ہو پھر بھی بہت کچھ ہوتی ہے۔"

آبنوس نے کفایت کی ناک پر ہلکی چٹکی بھری۔ "تم دولت کی بات کرتی ہو کفایت! میں شان و شوکت کی گھٹن کی بات کر رہی ہوں۔ اونچے خاندانوں کی اونچی ناک کی کہ دنیا جہاں کی آسائشیں تو ملیں لیکن اپنی دل پسند چیز پر دل مار لیا جائے۔"

کفایت کا منہ بنا ہی رہا۔ "میں نے تو آج تک کسی نواب زادی کو دل مارتے نہیں دیکھا۔" اس نے کن اکھیوں سے آس پاس کھڑی سب لڑکیوں کی طرف دیکھا۔

"کیونکہ وہ حقیقت سے اتنی اچھی طرح سمجھوتا کر چکی ہیں کہ دل آئے بغیر دل مار لیتی ہیں۔" آبنوس نے قہقہہ لگایا۔

کفایت کو آبنوس سے شدید اختلاف تھا کہ اگر ایسا ہے تب بھی اسے یہ قید و بند منظور ہے۔ وہ محلوں میں رہے، بہترین کپڑے پہنے، حکم دے، چیخے چلائے، اپنی مرضی کرے، اور ذرا سی کوتاہی پر شربت سے بھرا گلاس خادمہ کے منہ پر دے مارے۔ "کم بخت ماری، منحوس صورت تجھے تمیز نہیں شربت کیسے پیش کرتے ہیں، دفع ہو جا، تمیز سیکھے بغیر اپنی شکل نہ دکھانا۔"

بدتمیز یعنی چراغ نے کفایت کو منہ بناتے دیکھا تو زیرلب مسکرانے لگی۔ کبھی اسے فرنگن بننا ہے، کبھی اسے نواب زادی ہونا ہے۔ اسے دوربین بھی چاہیے اور گھوڑا بھی۔ اس کا دل ایک جگہ ٹھہر کیوں نہیں جاتا۔ تاج محل کا آخری نظارہ کرنے والوں میں سے وہ سب سے زیادہ خاموش تھی۔ ان سب سے تھوڑی الگ ہو کر کھڑی تھی۔ اس کی نظریں گھوم کر اس سمت جاتی تھیں جس سمت کبھی پھولوں کا ڈھیر بکھرا پڑا تھا اور وہ ان میں چھپ گئی تھی۔ وہ ان سے خوشبو بن کر نکلی تھی۔ اس نے پھولوں میں سے سر نکال کر تاج کو ایک نئے ہی انداز سے دیکھا تھا۔ اسے جھرجھری آ گئی۔ اس نے سر جھٹکا۔

"تاج محل کے بارے میں افواہ ہے کہ اسے بنانے والوں کے ہاتھ کاٹ دیے گئے، اب کیا اس نسبت سے محبت کرنے والوں کے دل بھی کاٹ دیے جاتے ہیں؟"

آبنوس نے سر گھما کر حور کی طرف دیکھا، پھر کن اکھیوں سے کفایت کی طرف کہ تم لوگ تاج کو الوداع کہہ رہی ہو یا طنز کے تیر برسا رہی ہو۔ ایسی کیا دشمنی ہو گئی ممتاز کے محل سے۔

"سچی محبت پر افواہ کی تہمت لگ جانا معمول کی بات ہے۔ شاہ جہاں کی محبت بھی اس تہمت سے پاک نہیں رہی، کہنے والوں نے اسے بہت کچھ کہا کہ کہیں تو شہنشاہ کی محبت کی تذلیل ہو، وہ شرمندہ ہو، رسوا ہو۔ جب محبت کو ہی یادگار کر لیا گیا تھا تو بنانے والے معماروں سے بغض رکھ کر شاہ جہاں کیا کرتا۔ ان ہی معماروں نے بعد میں اور عمارتیں بھی بنائیں۔ شاہجہاں کے اپنے پر کٹے ہوئے تھے، وہ قید میں تھے، کھڑکی سے تاج کو دیکھتا تھا، دوسروں کے ہاتھ کیا کٹواتے۔"

چراغ کچھ کنکر چن چن کر دریا کے پانی میں اچھال رہی تھی، پانی میں انتشار تھا، پھر پرندے تھے جو پھر اڑ اڑ جاتے تھے۔ "محبت پر تہمت کا لگ جانا معمول ہے۔" اس فقرے پر اس کے کنکر پھینکتے ہاتھ لحظہ بھر کے لیے رکے تھے۔ اس نے لمبا گہرا سانس سینے میں اتارا۔ اندر کہیں گھٹن ہوئی۔ سب تاج کی طرف ایسے دیکھ رہی تھیں جیسے آج ان کی زندگی کا ہی آخری دن ہو۔ وہ محبت کا شاہکار بنانے والے کے قید خانے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ بہت دور شاہ جہاں کا قید خانہ دکھائی دیتا تھا۔

"کاش میں اس قید خانے سے آزاد نہ کی گئی ہوتی۔" اس نے سوچا۔

☆☆☆

"اگر تم تاج محل بنواتیں تو معماروں کے ساتھ کیا سلوک کرتیں چراغ؟"

pklibrary.com

آبنوس نے اسے بات چیت میں شامل کرنے کے لیے پوچھا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ وہ کچھ بے زار سی ہے۔ بخار نہیں تھا لیکن جیسے کہیں بھاگ جانے کی جلدی میں تھی۔

"میں ایسا مقبرہ کیوں بنواتی، بلکہ میں تو سارا تاج محل ہی گرا دیتی۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"کیوں؟"

"انہیں ایسے قیامت خیز خیال ہی آسکتے ہیں نا۔" کفایت بڑبڑائی۔ "بلکہ ان کے متعلق یہ افواہ اڑتی کہ انہوں نے معماروں کے ہاتھ کٹوا دیے تو سب اسے فوراً سچ مان لیتے، بلکہ یہ ان کی آئندہ نسلوں کو بھی خاک چٹوا دیتیں کہ وہ اینٹ پتھر سے ہی بدلنے لگتے۔"

کفایت ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر بڑبڑاتی رہی۔ چراغ نے ترچھی کٹیلی نظر سے کفایت کو دیکھا تو اس نے فوراً ہنس کر دکھا دیا کہ میں تو مذاق کر رہی ہوں۔ آبنوس مسلسل سوالیہ چراغ کی طرف دیکھتی رہی کہ مجھے وضاحت دو۔

"آپ ہندوستان کی بہت باتیں کرتی ہیں، آپ کے پاس اس زمین کی حمایت میں بہت کچھ ہے، یہ جو محبت کی یادگار ہے یہ اس زمین کے لیے نہیں ہے۔ یہ رسم و رواج کی زمین ہے، یہاں محبت کا کیا کام؟ اپنے خاندان میں جھانک لیجیے، اپنے شہر میں، اپنے احباب میں، کون محبت کی زندگی جی رہا ہے۔ کسے یہ اختیار ہے کہ وہ دل پسند محبوب چن لے؟ ابھی آپ نے کہا کہ دل آئے بغیر دل مار لینا ہر نواب ذادی کو آتا ہے۔ پھر ایسی جگہ پر تاج محل کا کیا کام؟ یہ بھونڈی حقیقت ہے کہ محبت کی یادگار ایسی سرزمین پر ہے جہاں محبت ہی کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ عشق کے سارے دیوانے اسی زمین پر پتھر کھاتے ہیں، ایسی زمین پر محبت کی بات کیسے ہو سکتی ہے۔"

آبنوس نے گہرا سانس لیا۔ "میں مانتی ہوں لیکن......"

"جس حقیقت کے آگے "لیکن" آجائے اس کے آگے دلائل تو ہو سکتے ہیں لیکن حقیقت میں تبدیلی نہیں۔"

آبنوس نے چراغ کو گہری نظر سے دیکھا۔ "اور تمہیں کس بات نے اس نتیجے پر پہنچا دیا کہ تاج محل ہندوستان کے لیے نہیں ہے؟"

دور شاہجہاں کے قید خانے کی طرف نظر اٹھ گئی۔ "اس حقیقت نے کہ ہم صرف تاج محل کے حسن کے دیوانے ہیں۔ ہم آج بھی سفید سنگ مرمر کا ذکر بے مثال عمارت کے طور پر کرتے ہیں، محبت کی یادگار کے طور پر کتنے لوگ کرتے ہیں؟ ہم خود سے بھی یہ کہنے سے ڈرتے ہیں کہ یہ ایک دل کی دوسرے دل سے محبت کی پاس داری کا زمینی ثبوت ہے۔"

وہ سچ کہہ رہی تھی، لیکن یہ سچ اس نے کیسے جانا؟ وہ حقیقت بیان کر رہی تھی لیکن وہ اس حقیقت سے کس لمحے میں آشنا ہوئی۔ اسے محبت کی سمجھ نہیں رہی تھی پھر کس لمحے نے اسے محبت کی اتنی سمجھ سمجھا دی۔

"اور اسی لیے تم اسے گرا دینا چاہتی ہو؟" آبنوس شاید کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتی تھی۔

"ہم ہندوستانی مغرور لوگ ہیں، عمارتوں پر فخر کرتے ہیں، محبت کرنے والوں کا سر قلم کروا دیتے ہیں۔ ہم جھوٹے اور منافق لوگ ہیں۔ ہمارے قول و قرار میں تضاد ہے، ورنہ تاج محل تعمیر ہونے کے بعد محبت کرنے والا ہر دل مراد پا جاتا۔"

آبنوس چراغ کی بہت ساری باتوں سے اختلاف کرتی تھی لیکن وہ خاموش رہی۔ اس کی نظروں کے سامنے وہ تمام چہرے گھوم گئے جنہیں خاندان کی عزت کے نام پر محبت ترک کرنی پڑی۔ دل مارنے پڑے۔ جس زمین پر دل قاعدے، قانون کے پیروں تلے آکر کچلے جائیں، اس زمین پر دل کے سچے جذبے کی یادگار کی کیا حیثیت ہو سکتی ہے؟

pklibrary.com

"اسے گرا دینا یہ اعلان ہوگا کہ جس جس دل میں محبت کی بنیاد رکھی جا چکی ہے، اس بنیاد کو اکھاڑ پھینکنا چاہیے۔"

ان کی سواریاں تاج کے پہلو سے گزریں تو کفایت نے انگلی سے ایک چھلا کھینچ کر نکالا اور اسے تاج کی طرف اچھال دیا۔

"یہ عہد کا چھلا ہے...... مجھے محبت کی دعا لگے، میرے لیے بھی کہیں کوئی تاج محل بنے۔"

اس نے ایسے چلا کر کہا کہ آبنوس کتنی ہی دیر تک ہنستی رہی۔

"پاگل ملکہ کے مرنے کے بعد بنا تھا یہ۔" حور نے اس کے شانے پر چپت لگائی۔

"منظور ہے...... منظور ہے...... مرنے کے بعد ہی سہی، یہ قدردانی منظور ہے......"

جینے والی نے ایک گہرا سانس لیا، حور کے شانے کے ساتھ سر جوڑ کر آنکھیں موندلیں۔

☆☆☆

لکھنؤ واپسی پر ان کا استقبال ایسے ہی ہوا جیسے ان کی واپسی سالوں بعد ہوئی ہے۔ کئی موسم بیت چکے ہوں۔

اماں اور چچی نے کتنی ہی دیر تک چراغ کو سینے سے لگا کر رکھا۔ وہی کہ کمزور ہو گئی ہو، رنگ پیلا پڑ گیا ہے، مرجھا ہو گئی، تمہارا کسی نے خیال نہیں رکھا، پوچھتی ہوں کفایت سے۔ حور اور نو بہار نے منہ بنالیا کہ ہم بھی مرجھا گئی ہیں، ہم پر بھی کمزوری چھائی ہے، کچھ ہماری بھی خبر لے لیں۔ ان کی ماں ہی ان کی نہیں تھی تو باقی کسی اور پر کیا تکرار کرتیں۔ چچی نے اپنی بیٹیوں کی طرف دیکھا تو ہنس دیں۔ خالہ تک کو بس ایک ہی انسان یاد آتا رہا تھا اور وہ تھی چراغ۔

"نا معلوم کس بزرگ کی دعا لگی ہے انہیں، ہر دل پر قبضہ کر کے بیٹھی ہیں۔" کفایت نے حور کے کان میں کہا۔

"ان ہی بزرگ کی تمہیں بددعا لگی ہوگی، حسد رکھنا گناہ ہوتا ہے۔"

"ابھی جو آپ اپنی والدہ سے شکوہ کر رہی تھیں، وہ تو ثواب کا کام تھا نا۔"

وہ پاک دامن سے ملیں تو اس نے نسترن کی ہدایات پر اتنا زیادہ عمل کر لیا تھا کہ پہچانی نہیں جا رہی تھی۔

"یہ تم ہو پاک دامن؟" چراغ نے گھوم کر اس کا جائزہ لیا۔

پاک دامن نے زیر لب خود کو یاد کروایا کہ مصیبت یعنی چراغ واپس آ چکی ہے، زبان سنبھال کر، ورنہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

"تمہارا سفر کیسا رہا۔" وہ سوال ٹال گئی۔

"یہ وہاں گم ہو گئی تھی اور تمام بنجارے تک یہ جان گئے کہ ایک دیوانی لڑکی کے لیے ہاہا کار مچی ہے۔" حور اس کے بستر پر گر گئی۔

نسترن نے منع کیا تھا کہ کم سے کم لوگوں سے ملنا بلکہ کمرا ہی بند رکھنا۔ لیکن وہ کیا کرتی، کوئی اس کی سنتا ہی نہیں ہے۔ کاش یہ گمشدہ ہی رہتی، اب ضروری تھا کہ اسے ڈھونڈ لیا جاتا۔ وہ زیر لب خود سے کہتی رہی۔ "میری شادی کے بعد مل جاتی۔ ویسے بھی یہ آگ میں ہی کیوں نہ کود جائے، اسے کچھ نہیں ہوتا، یہ بچ بچا کر واپس لوٹ آتی ہے۔ خطا ہے جو آج تک کسی کان نے اس کے زخمی ہونے کی خوش خبری سنی ہو۔ ہمیشہ اس کے دیے زخموں کے بارے میں ہی سنا ہے، ایسی پتھر کی بنی ہے کہ ٹوٹتی ہی نہیں۔"

"تم ہمیں دیکھ کر زیادہ خوش نہیں ہوئیں؟"

چراغ نے اس کے رنگ بدلتے تاثرات کا جائزہ لیا۔

"یہ خوش تو ہے لیکن فکر مند زیادہ ہے، تم آ چکی ہونا، بے چاری کو پھر سے ڈر ہے کہ کچھ ہو نہ جائے۔ اس کی شادی ہے کہ ہو کر نہیں دے رہی۔ انتظار کا زمانہ طویل ہو چکا ہے، اس کے دولہا کا معلوم کرو، بے چارا کہیں بوڑھا نہ ہو چکا ہو۔"

پاک دامن نے مسکرانے کی نقل اتاری۔

"دراصل شادی کا بھی ایک دباؤ ہوتا ہے، نئے گھر

pklibrary.com

میں جانا، پھر رسم و رواج پر پورا اترنا۔ میں اسی دباؤ میں ہوں۔"
"اگر کہو تو تمہیں اس دباؤ سے نکال دوں...... ایک مشورہ دوں...... ایسا کرو شادی سے انکار کردو۔"
پاک دامن دانت پیس کر رہ گئی "منحوس لڑکی پھر الٹی سیدھی باتیں منہ سے نکال رہی ہے۔"
"فرض کرتے ہیں، اس نے شادی سے انکار کر دیا، پھر کیا ہوگا؟ تا عمر اس کی شادی نہیں ہوگی، ہے نا۔" حور نے چراغ کی طرف دیکھ کر آنکھ دبائی۔
"ایسا ہی ہوگا...... خالہ کے پاس رہے گی، ان کی خدمت کرے گی، جنت میں جگہ ملے گی۔"
پاک دامن کا دل لرز کر، بھڑک کر رہ گیا کہ "میں کیوں میکے بیٹھی رہوں، تمہارے منہ میں خاک، ایسی جنت تمہیں ہی مبارک ہو۔"
"شادی والے گھر میں ایسی باتیں نہیں کرتے۔" اس نے کڑے ضبط اور مشکل تحمل سے کہا۔
"جب تم انکار کر دو گی تو کہاں کا شادی والا گھر۔" چراغ نے اس کا پورا ضبط آزما لیا۔
"تم کر دو انکار فرہاد سے شادی سے...... میرے لیے اول فول کیوں نکال رہی ہو...... دشمن کے منہ میں خاک جو میں شادی سے انکار کروں، میں دل و جان سے یہاں سے رخصت ہو کر اپنے گھر جانا چاہتی ہوں، اپنی کالی منحوس زبانیں اندر رکھو، اگر میری شادی میں کوئی رکاوٹ آئی تو میں سب کو بتا دوں گی کہ تم سب نے مجھے بددعا دی تھی۔ یہ تم سب کی نحوست کی وجہ سے ہوا ہے۔ سہیلیاں دلہن کے ناز نخرے اٹھاتی ہیں کہ بے چاری رخصت ہونے جا رہی ہے، تم کیسی سہیلیاں ہو، میرا دل جلاتی ہو۔ مجھے رلاتی ہو، نسترن ٹھیک کہتی ہے، تم سب کی عقلیں گھاس چرنے گئی ہیں۔"
"خود نسترن کی عقل شربت پینے جاتی ہوگی ۔مٹھاس زیادہ ہونے پر منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے وہ خون پی لیتی ہوگی۔" چراغ نے سنجیدگی سے کہا۔ جس پر حور اور نو بہار لوٹ پوٹ ہونے لگیں۔
پاک دامن کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ تین کالی زبانوں سے اس کی شادی کے خلاف منحوس الفاظ نکلے تھے۔ اب وہ کیا کرے؟ کیا نسترن کو ڈھونڈے کہ کوئی توڑ کرو، ٹوٹکا کرو، ان لڑکیوں سے میرا نکاح بچا لو۔

☆☆☆

خالو صاحب چراغ سے آ کر ملے، اس کی سیر کے بارے میں پوچھتے رہے، وہ خوشی خوشی سب بتاتی رہی، پھر ان کا شکریہ ادا کیا۔
"تم وہاں کہیں گم ہو گئی تھیں چراغ! کیا ہوا تھا؟"
اس کی سانس رک گئی۔ لکھنو سے گئے ملازموں میں سے کسی نے بتا دیا ہوگا جبکہ آبنوس نے سختی سے منع تھا۔
"جی......" وہ بس اتنا کہہ سکی۔
"کیا ہوا تھا، بتانا چاہو گی۔"
وہ ہتھیلیاں مسلنے لگی۔ "میں شاہ جہاں کا قلعہ دیکھنے گئی تھی، اتنے بڑے قلعے میں گم ہو گئی تھی۔"
"تم اندر کیسے گئیں؟"
"وہ...... میں نے پہرے دار کو اپنی ایک انگوٹھی دی تھی۔"
وہ پہلے تو اسے دیکھتے رہے، پھر قہقہہ لگایا۔ "کیا تمہیں قلعہ دیکھنے کی ضد ہو گئی تھی؟"
"ہاں...... ضد ہی تھی......" کمزور آواز میں کہا۔
"آبنوس ایسا کرتی تو میں تسلیم کر لیتا، تم زیور دے کر قلعے دیکھنے والوں میں سے نہیں ہو۔ اب سچ بتاؤ۔ کون سی ضد وہاں لے گئی تھی؟"
وہ سر اٹھا کر خالو صاحب کو دیکھنے لگی، آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ "اعتبار کی ضد......"
وہ ناسمجھی سے اسے دیکھ کر رہ گئے، پھر کچھ پوچھنا چاہا لیکن خاموش ہو گئے۔ جب وہ جانے لگے

pklibrary.com

تو اس نے انہیں آواز دے کر روکا۔
"کیا مجھ میں کوئی خوبی نہیں ہے؟" وہ صرف خالو صاحب سے یہ سوال کر سکتی تھی۔
وہ اس کے سوال پر حیران ہوئے۔ "تم پر کسی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ تم بری انسان ہو۔ ایسے سوال انسان تب ہی کرتا ہے جب کوئی اسے یہ یقین دلا چکا ہو کہ وہ صرف برائیوں کا منبع ہے۔"
"کیا ایسا ہے؟"
"تمہارا یہ سوال پوچھنا گواہی ہے کہ تمہیں اچھائی کی فکر بھی ہے۔"
"اگر میں ہمیشہ بری ہی رہی......"
انہوں نے کتنی حیرت سے چراغ کی طرف دیکھا۔ "جس طرح یہ سوال پوچھ رہی ہو، اگر ہو بھی تو زیادہ دیر تک نہیں رہو گی۔"
پھر وہ وہاں سے چلے گئے، وہ اکیلی کھڑی رہ گئی۔ کچھ لمحے گزرے کہ خالو صاحب واپس لوٹ آئے۔ دہلیز پر کھڑے رہ کر پوچھا۔
"یہ احساس تمہیں کس نے دلایا چراغ!؟"
وہ کچھ کہہ نہیں سکی۔ وہ خود نہیں جانتی تھی ایسا کیا ہوا کہ اسے یہ احساس ہونے لگا ہے۔
"اگر کسی صورت حال نے دلایا ہے تو یہ وقتی ہے، اگر کسی انسان نے دلایا ہے تو پھر جلد بدل جاؤ گی۔"
کسی صورت حال نے، یا کسی انسان نے؟

☆☆☆

وہ سب ایسے ہو گئیں جیسے ان کی زندگیوں میں چور آیا ہی نہیں تھا۔ شمس اسی رات غائب ہو گیا تھا۔ اگلے دن کے سورج کے ساتھ کسی نے اس کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ کہیں اس کا نام نہیں سنا تھا۔ نصیر ان کے ساتھ لکھنو واپس آیا تھا۔ کفایت نے شمس کے بارے میں پوچھنا چاہا پھر رہنے دیا۔ شاید وہ نصیر سے کچھ کہہ گیا تھا کہ اس تک نے کفایت سے نہیں پوچھا کہ شمس کہاں غائب ہے، کیا کوئی حکم دیا گیا تھا اسے۔ تو پھر، شمس کون؟ سب بھول گئے۔

کفایت نے ٹوپی پہن کر چچی کو دکھائی تو وہ دیر تک ہنستی رہیں۔
"اگر کوئی فرنگن تمہیں اپنے یہاں رکھے تو تم چلی جاؤ گی؟" چچی نے پان بناتے ہوئے پوچھ لیا۔
"میرا خیال ہے۔ مجھے جانا چاہیے، میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ وہ مجھے کس انداز میں ذلیل کرے گی۔" کن اکھیوں سے چراغ کی طرف دیکھا۔ وہ چچی کے تخت پر کنارے سے بیٹھتی چھلیاں بنا رہی تھی۔
"وہ تمہیں اپنے ہنٹروں سے ذلیل کرے گی، پھر چراغ یاد آئے گی۔"
"چراغ بی بی! آپ ایسی بلا ہیں کہ ایک بار دل کو لگتی ہیں اور پھر یہ دل لگی دل کو ہی کھا جاتی ہے۔"
کفایت نے مذاق میں کہا تھا لیکن چراغ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔
"کیا یہ سچ ہے؟" کفایت سے پوچھا۔
"کیا؟" وہ ڈر گئی کہ اب کیا کہہ دیا۔
"کہ میری یاد دل کو کھا جائے؟"
کفایت نے دانت نکالے۔ "آپ رخصت ہو کر یہاں لکھنو آ جائیں گی تو اپنا کھایا ہوا دل نکال کر دکھاؤں گی۔"
چچی کتنے دل سے ہنسیں۔ وہ ویسے ہی ان سب کی واپسی سے ہشاش بشاش ہو چکی تھیں۔
"ویسے چچی! وہاں ایک فرنگن تھی جس کے حسن سے جل کر چراغ بی بی جلے پاؤں کی بلی بنی گھومتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ وہ چڑیل ہے، اس کے دانت ٹیڑھے ہیں، بال جادوگرنیوں جیسے ہیں۔"
"چراغ کی اس سے کیسی جلن؟ وہ اپنے دیس کی، یہ اپنے گاؤں کی۔" چچی کو حیرت ہوئی۔
"یہ گاؤں سے نہیں لاہور سے ہیں۔"
"زبان نہ پکڑو کفایت! تم بتاؤ چراغ تمہاری اس سے کیسی جلن؟"

pklibrary.com

چراغ نے کفایت کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ کفایت نے اپنی زبان کو سختی سے دانتوں کے نیچے دبا لیا۔ دراصل چور ان کی زندگیوں سے جا چکا تھا، اور وہ دل ہی دل میں طے کر چکی تھیں کہ اسے کسی ذکر میں نہیں لائیں گی۔ ہر انسان جان چکا تھا، کوئی شرارت یا کھیل انہیں بہت آگے لے جا سکتا ہے۔ نقصان سوچ سے زیادہ ہو سکتا ہے۔

"وہ فرہاد صاحب کے دیس سے تھیں نا شاید اس لیے حسد ہوا تھا۔" کفایت نے اپنی جان بچائی۔

چچی کو یہ بات ہضم نہیں ہو سکی، کن اکھیوں سے چراغ کی طرف دیکھا۔ وہ جب سے آئی تھی کچھ بدلی ہوئی تو تھی، وہ سمجھیں کہ شاید آگرہ کے دن یاد کر رہی ہے، اداسی میں ہے۔ کفایت کو الگ لے جا کر پوچھا کہ آگرہ میں کچھ ہوا تو نہیں، کفایت نے ساری اچھی باتیں بتا دیں، دوسری تمام باتیں چھپا لیں۔ فرنگیوں کے یہاں رقص کی بات بھی بتائی، وہاں شمس بھی فرنگی لباس میں آیا تھا، یہ تک چھپا لیا۔ چچی کو معلوم ہی نہیں تھا کہ شمس بھی نصیر کے ساتھ وہاں گیا تھا۔ ان کا خیال تھا۔ بیمار ہے، یہیں ہے۔ وہ لکھنو گیا، زمین پر بھی کہیں موجود ہے، کسی کو خبر نہیں تھی۔

☆☆☆

خالہ کے محل میں سرگوشیاں عام ہونے لگی تھیں کہ فرہاد آنے والا ہے۔ کس نے کہاں سے سنا، یہ کوئی نہیں بتاتا تھا لیکن دعوا سب کا یہی تھا کہ خبر پکی ہے۔ اس نے پہلی بار سنا تو چہرہ بے تاثر رہا، کئی طرح کے پھول تھے جنہیں پرو رہی تھی۔ بے چینی تھی یا شدت کہ اٹھی تو سارے پھول زمین پر گر گئے۔

"کیا واقعی میں فرہاد آ سکتا ہے؟" اس نے پاک دامن سے پوچھا۔

"مجھے تو معلوم ہی نہیں یہ فرنگیوں کا انگلستان یہاں سے کتنا دور ہے، کتنے دن لگتے ہیں، کیا آ سکتا ہے؟" وہ الٹا اس سے پوچھ رہی تھی۔ نا معلوم چہرے پر کیا لگا کر بیٹھی تھی، عجیب بدہیبت سی لگ رہی تھی۔

"فاصلہ تو مجھے بھی معلوم نہیں۔"

"مجھے شادی نہ ہونے کی بد دعائیں دینے والی کو یہ جھوٹی افواہ بن کر بہت خوشی ہو رہی ہوگی۔" پاک دامن نے اسے تنگ کرنا چاہا۔

"تم بھی دے دو بد دعا!" اس نے زیر لب کہا۔

"تمہیں بد دعائیں نہیں لگتیں چراغ! بچپن سے اب تک کتنی بار دے چکی ہوں، ایک نہیں لگی۔"

"شاید ساری ایک ساتھ لگ جائیں۔"

کفایت نے بھی کچھ سن لیا تھا، بالوں کی لٹیں سمیٹتی ہوئی اس کے کمرے میں آئی۔ یہ رات کا وقت تھا۔

"کیا فرہاد صاحب آ رہے ہیں؟"

"خبر نہیں......" وہ بستر پر دراز ہو چکی تھی، اشارہ کیا کہ روشنیاں مدھم کر دو۔

"خبر رکھ لیں...... معلوم ہو خالہ نے یہیں نکاح پڑھوا کر رخصت کر لیا۔" اسے اپنی ہی کوئی فکر تھی۔

"میں نے کہا روشنیاں گل کرو اور جاؤ۔"

"دیکھیں، بارات لاہور آنی چاہیے، میرا خیال ہے لکھنو سے آئے تو ہاتھیوں پر آئے۔ وہ سب سے بڑا دروازہ ہے نا، وہاں سے گزرے گی تو بہت اچھا لگے گا، اسی دن کے لیے تو اسے بنوایا تھا مغلوں نے۔ آپ کی وکٹوریہ کا بہت ذکر ہوتا ہے شہر میں، اب بارات کا بھی ہونا چاہیے، لوگ مدتوں تک، مطلب ذکر کرتے رہیں کہ کیا چراغ کی بارات آئی تھی، کس شان سے اس مصیبت...... مطلب لڑکی کو رخصت کر کے لے گئے ہیں۔" کفایت اپنے ہی خوابوں خیالوں میں تھی۔

"کفایت! دفع ہو جا ورنہ انہی ہاتھیوں کے نیچے آ کر کچلی جائے گی۔"

"اپنی شادی کی باتیں تو خوشی سے کر لیا کریں۔ میں آپ کی جگہ ہوتی تو بہانے بہانے سے اپنی شادی کا ذکر کرتی۔"

یہاں وہاں کی ہانکتی کفایت چلی گئی تو وہ نیم

اندھیرے کمرے کے اندھیرے کو گھورنے لگی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی بارات کھڑی تھی۔ شہر بارات کی آمد سے گونج رہا تھا۔ حویلی کی چہل پہل عروج پر تھی، اور وہ اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی یہ سب دیکھ رہی تھی۔ دیکھ رہی تھی کہ دور دور تک اس کے دل میں خوشی کی کوئی رمق موجود نہیں ہے، وہ تنہا اور بہت اداس ہے۔

☆☆☆

صبح کی آمد ہنگامہ خیز تھی، خالہ کی خلیا ساس کی تشریف آوری کا شور تھا۔ ان کی خاص خادمائیں پہلے ہی آچکی تھیں اور خالہ کی ملازمین پر حکم چلاتی اپنی مالکن کی آمد کی تیاریوں پر ہدایات دے رہی تھیں۔ خالہ کی خاص تک کے منہ اتر گئے تھے، جیسے وہ اس عذاب سے پہلے بھی کئی بار گزر چکی ہوں۔ کفایت اور پرستون کے ساتھ کمر ٹکا کر کھڑی انگور کھا رہی تھی، اور مزے سے نیچے مہریوں کی بھاگ دوڑ دیکھ رہی تھی۔

''لگتا ہے، کوئی جلاد آرہا ہے۔'' اس نے پاک دامن کے کمرے میں آکر سب کو اطلاع دی۔

پاک دامن نے جیسے سکون کا سانس لیا۔ ''جلاد نہیں...... دادی محترم!''

''کون سی محترم؟''

''مل کر دیکھ لینا، سب مرحومین، اور محترمین یاد کروادیں گی، طبیعت باغ باغ ہو جائے گی۔'' پاک دامن نے چراغ پر رکھ کر بات کی۔

''آپ چراغ بی بی کی طرف دیکھ کر بات کر رہی ہیں، کیا وہ چراغ بی بی کو باغ باغ کریں گی؟'' کفایت کو چین نہیں آرہا تھا۔

''آرہی ہیں نا، مل لینا......'' پاک دامن نہ جانے کیوں لطف لے رہی تھی۔

کفایت نے چراغ کی طرف سوالیہ دیکھا، چراغ نے آنکھیں چندھیائیں کہ جاکر معلوم کرو۔

''میں ساری خبر لے کر آتی ہوں، ایسا نہ ہو کہ ہم پر بے خبری میں شب خون مارا جائے۔'' کفایت نیچے کی طرف لپکی۔

''یہ تو جیسے فوج تیار کر لے گی۔'' پاک دامن نے ہونہہ کیا۔ ''پتا نہیں لاہور والے خود کو کیا سمجھتے ہیں۔''

''جو لکھنو والے سمجھنے سے چوک گئے ہیں۔'' چراغ نے بھڑک کر کہا۔

''تم لاہور پر اتنا بھڑکتی کیوں ہو، تم نے خرید رکھا ہے؟ یا اپنی فوج کے ذریعے فتح کیا ہے۔''

''دل دے کر خریدا ہے...... جان دے کر فتح کیا ہے......''

''ہونہہ...... قصے کہانیاں......'' پاک دامن نے منہ چڑایا۔

''اتنے برے برے منہ بنا کر بات کرتی ہو، دو کوڑی کا روپ آئے گا۔''

چراغ نے قریب رکھا آئینہ پکڑ کر سامنے کیا۔ پاک دامن ڈر سی گئی، آئینے میں دیکھا، واقعی حسن میں کچھ فرق تو آگیا تھا۔ خود سے عہد کیا کہ نکاح تک ایسی بچکانہ حرکتوں سے باز رہے گی۔ منہ بنانا چھوڑ دے گی بلکہ چراغ کو منہ لگانا ہی ترک کر دے گی۔

دادی محترم کا احوال کچھ ایسے ہے کہ ان کی پشواز اس قدر بھاری تھی کہ کنیز پیش خدمت (کنیزیں) اسے سنبھالے ہوئے تھیں۔ دو تو پیچھے ان کے دوپٹے کے ساتھ مشغول تھیں۔ انگور کھاتے کفایت نے اپنی انگلی کھالی۔ ہلکی سی چیخ نکل گئی، خالہ کی ملازمہ نے اسے ٹہوکا دیا کہ بی بی آرام سے، ایسے چیخ مار رہی ہو، وہ حلق میں ہاتھ ڈال کر آواز کا ساز نکال پھینکیں گی۔

''کیوں ڈرا رہی ہو......''

''ڈرانا کیسا...... سامنے سے دیکھ کر ڈر نہیں لگ رہا؟''

کفایت نے ناں میں سر ہلایا کہ نہیں لگ رہا۔ چچی نے کفایت کو بلا کر ہدایت دیں کہ ذرا تمیز سے رہنا، اور باقی سب سے بھی کہہ دینا۔ ان خاتون کا

pklibrary.com

خاص دبدبہ ہے، بدتہذیبی پسند نہیں کرتیں۔
"بدتمیزی، بدتہذیبی پسند نہیں کرتیں...... تو کیا چراغ بی بی کو کہیں چھپادیں؟"
چچی نے گھور کر دیکھا۔ "کفایت! کبھی تو اپنی زبان کی قینچی سنبھال لیا کرو۔"
"میں سچ کہہ رہی ہوں...... محل کے پچھلے دروازے سے چراغ بی بی کو لاہور روانہ کردیں۔"
چچی نے بے بسی سے ہونٹ کچلے۔ "کفایت! یہاں آکر تم سب بھول گئی ہو، بہت ہوا۔"
وہ دادی محترم کو دیکھنے کے لیے نشست گاہ آگئی۔ جس تخت پر دادی صاحبہ براجمان تھیں، ان کی خواصیں (خاص ملازمائیں) اس غرض سے دائیں بائیں موجود تھیں کہ دوپٹہ کو درست کرتی رہیں، کیونکہ ذرا سی حرکت سے موتی کمخواب کے بھاری دوپٹہ میں الجھ جاتے تھے۔ پوشاک سرخ کمخواب کی تھی۔ لمبے بال سمیٹ کر دائیں شانے پر رکھے تھے، بال بال موتی پروئے تھے۔ پیشانی پر ایک چھوٹا سا جھومر آویزاں تھا۔ کانوں میں بہت سی بالیاں تھیں، کفایت نے دور سے گننے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ مکمل طور پر گننے کے لیے اسے ان کے قریب جانا پڑتا، اور ابھی وہ اتنی ہمت نہیں رکھتی تھی۔ گلے میں متعدد موتیوں کی مالا، ہار اور نہ جانے کیا کچھ تھا۔
"اس عمر میں اتنا وزن یہ اٹھا کیسے لیتی ہیں۔"
کفایت کی زبان سے نکل گیا، وہ بھی اس کے ساتھ محل کی ملازمہ کھڑی ہے جبکہ وہ دادی کی ملازمہ تھی، اس نے گھور کر کفایت کی طرف دیکھا کہ حد ادب، کون ہو تم ناہنجار لڑکی۔
ناہنجار لڑکی نے دانت نکال کر دکھائے کہ معذرت منہ سے نکل گیا، میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ ان کے پیچھے دو ملازمہ مورچھل (پنکھا) جھلا رہی تھیں۔ موسم ٹھنڈا تھا، مورچھل کی ضرورت نہیں تھی، لیکن شاید مکھیاں اڑانے کا اہتمام کررہی تھیں۔
"مکھیاں آکس پر رہی ہیں، دادی پر یا ان کے زیورات پر۔" کفایت نے حور کے ساتھ مل کر تبصرہ شروع کیا۔
"میرا خیال ہے اس سرخ غازے پر جوان کے گالوں پر چمک رہا ہے۔" حور ان کے حضور سلام پیش کر آئی تھی۔ اب ماں کی ہدایت پر شرافت سے دادی سے بہت دور کونے میں ایک نشست پر بیٹھ گئی تھی۔ کفایت اس کے پیچھے کھڑی بڑبڑ کررہی تھی۔
"شاید انہیں تمنا ہے کہ انہیں ملکہ عالیہ سمجھا جائے۔ بہت خوف ناک سا دبدبہ ہے ان کا۔ یہ اس عمر میں ایسے کپڑے پہنتی ہیں تو ہماری عمر میں تو غضب کرتی ہوں گی۔"
کچھ خواتین عمر کی ہر بہار کو پر بہار رکھتی ہیں۔ وہ وہاں موجود کسی بھی نوعمر لڑکی سے زیادہ پرکشش اور خوب صورت لگ رہی تھیں۔ وہ اس حقیقت کا ثبوت تھیں کہ حسن عمر سے زیادہ دل کا محتاج ہے۔
"ہماری عمر میں غضب کیا ہوتا تو اس عمر تک شوق ختم ہو چکا ہوتا، لگتا ہے، چار دن پہلے ہی انہیں یہ سہولت نصیب ہوئی ہے۔"
"یہ چراغ بی بی کی کون سی والی ساس ہوں گی؟"
"یہ اس کی آگ بگولہ ساس ہوں گی۔" حور کی بات پر بے اختیار کفایت کی ہنسی نکل گئی۔ چچی نے دور سے ہی کفایت کو گھورا کہ دفع ہو یہاں سے۔ تم سب ایک جیسی ہو، موقع محل نہیں دیکھتیں۔ کفایت چپکے سے وہاں سے کھسک گئی۔
"یا اللہ ایسی چار پانچ اور ساسیں چراغ بی بی کی زندگی میں آجائیں تو ہم سب کے دل کے ارمان پورے ہو جائیں۔ ہمارے تمام زخموں کی دوا ہو جائے گی۔" باہر آکر دل سے دعا کی۔

☆☆☆

چچی ٹھیک کہتی ہیں کہ شادی سے پہلے اپنے سسرال نہ جاؤ، ہزار طرح کی احتیاط کرنی پڑتی ہے جن کی تمہیں ابھی عادت نہیں ہے۔ تھک جاؤ گی۔ چراغ کو پہلی بار چچی کی بات یاد آئی۔
اس کا دل نہیں تھا کہ سسرالیوں کے نازنخرے

pklibrary.com

اٹھائے۔ خالہ اور پاک دامن کی بات اور تھی، اب شادی کا سلسلہ باقاعدہ ہونے ہی والا ہے تو اسے بہت سے لوگوں سے ملنا ہوگا۔ خالہ دادی ساس کے بارے میں مشہور تھا کہ اتنی نازک مزاج ہیں کہ انہیں یہ تک خبر ہو جاتی ہے کہ جس برتن میں کھانا پکا ہے، اس کی قلعی کتنی مدت پرانی ہو چکی ہے۔ وہ بد قلعی برتنوں میں تیار کھانوں سے ہاتھ کھینچ لیا کرتی تھیں۔ اسی لیے اس عمر میں بھی صحت اتنی برقرار تھی کہ سہارے کی چھڑی کے بغیر چلتی پھرتی تھیں۔ موقع ملتا تو دوڑ بھی لیتیں، چراغ کے ساتھ آنکھ مچولی بھی کھیل لیتیں۔ ان کے لیے بے تکلف کھانوں سے دستر خوان سج گیا تھا۔ کیا تھا جو انہوں نے نہیں کھایا تھا۔ کیا تھا جو دستر خوان پر چھوڑ دیا گیا تھا۔

اب چراغ کو ریشمی رومال میں سونے کے سکے رکھ کر دادی صاحبہ کے حضور پیش کرنے تھے، یہ عزیز داری کی باقاعدہ سلامی ہے۔ چچی آئیں چراغ کو خاص ہدایتیں دیں کہ کیسے عزیز داری پیش کرنی ہے۔ چراغ کئی بار یہ عزیز داری پیش ہوتے دیکھ چکی تھی، وہ بے نیازی سے سنتی رہی کہ چچی میں سب جانتی ہوں۔ لیکن چچی کر کے دکھاتی رہیں کہ کیسے آداب کرنا ہے، کتنا جھکنا ہے، عزیز داری کا رومال کیسے پیش کرنا ہے، کتنا مسکرانا ہے۔

"کم بولنا، جتنا وہ پوچھیں اس کا کم سے کم الفاظ میں جواب دینا۔ دیکھو چراغ! ذرا ٹھیک زبان میں بات کرنا۔"

"کیا میری زبان ٹیڑھی ہے چچی؟"

"تیز ہے...... لمبی ہے......" پاک دامن نے پیچھے سے صدا لگائی۔

"چراغ! زبان و بیان کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔"

"میں گا کر امیر حمزہ پڑھ کر سنا دوں؟"

"خدا کے لیے چراغ! کچھ لحاظ رکھنا، اپنی خالہ کی ناک نہ کٹوا دینا، کتنا پیار کرتی ہیں تم سے۔" چچی نے لجاجت سے کہا۔

وہ اپنی طبیعت کے خلاف تیار ہوتی رہی، بال بنائے، چچی کے دیے زیور پہنے، چچی کو کر کے دکھایا کہ کیسے رومال پیش کرنا ہے۔ پاک دامن سمیت وہ سب ہنستی رہیں۔ انہیں بڑا لطف آ رہا تھا۔ کفایت تک طنزیہ ہنس رہی تھی۔

"پھنس گئیں آپ چراغ بی بی! آخر اللہ سب کی ہی سنتا ہے۔"

وہ بڑی دھیمی لیکن متوازن چال چلتی ہوئی نہ جانے یہاں وہاں کہاں کہاں کے رشتے سے مل کر بنی دادی صاحبہ کے سامنے پیش ہوئی۔ اس کی چال ایسی تھی کہ اماں کو بھی ہنسی آ گئی۔ اسے بھی اتنے اچھے انسانی انداز میں چلتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ خاتون تخت پر تکیہ نشین تھیں۔ وہ کچھ ایسی دم دار تھیں کہ دوسروں کا دم نکال دینے پر قادر تھیں۔ ہونے والی بہو انہیں سلام پیش کرنے آ رہی ہے تو انہوں نے چہرے کے خطوط تیکھے اور تیز دھار کر لیے۔

"آداب! آداب عالی، آداب معلیٰ، آداب محترم......"

انہوں نے ابرو اچکا کر اسے دیکھا۔ "طے نہیں کر پا رہیں کہ میں کس آداب کے لائق ہوں؟"

"طے پا گیا ہے، اسی لیے سب ہی آداب آپ کی نذر کر رہی ہوں ملکہ عالیہ!"

ایک مسکراہٹ ان کے چہرے پر پھیل گئی۔ انہیں بات پسند آئی۔ چراغ کی آنکھیں چمکنے لگیں، جنہیں چچی نے دیکھ لیا، ان کی ہتھیلی پر پسینہ نمودار ہوا۔ مسئلہ یہ تھا کہ یہ وہ رسمیں تھیں جنہیں اسے ہی پورا کرنا تھا، وہ چراغ کو چھپا نہیں سکتی تھیں، وہ چراغ کو انکار کرنے کے لیے نہیں کہہ سکتی تھیں۔ اسی لیے کہا تھا کہ ایک ہی بار شادی ہو کرنا آنا، اچھی طرح سے سیکھ کر، لیکن یہ چراغ۔

اس نے جھک کر ہاتھ سے آداب کہا۔ دوسرے ہاتھ میں ریشمی رومال جس میں سونے کے کئی سکے تھے، ان کو ہتھیلی پر رکھ کر ان کے سامنے پھیلا دیا کہ انہیں قبول کریں۔ لیکن ہوتا یہ کہ وہ آگے بڑھ

pklibrary.com

کر قبول کرتیں، الٹا وہ پیچھے تکیے سے جالگیں۔
"اتنی عمر ہوگئی میری، نکاح سے پہلے یہ عزیز داری کبھی وصول نہیں کی۔" خالہ کی طرف دیکھ کر بھرپور انداز میں جتایا۔
چراغ سمجھ گئی کہ ان بے چاری کی اتنی عمر ہو چکی ہے طنزیہ انداز اپنائے ہوئے، اب کیسے جان چھڑوا لیتیں۔
"کیا یہ بہتر نہیں رہا کہ اس عزیز داری کا اعزاز وقت سے پہلے پالیا ورنہ کون جانتا ہے کہ آپ۔"
دربار نما کمرے میں سناٹا پھیل گیا۔ اماں کا دل دھنک سے رہ گیا۔ اسے سوچ سمجھ کر جواب دینے نہیں آتے تھے، جو منہ میں آیا کہہ دیا۔
"یعنی میں زندہ رہتی یا نہ رہتی......" انہیں برا تو بہت لگا لیکن وضع داری تھی کہ ایسے ظاہر کیا کہ جیسے بڑھاپے کا عندیہ نہیں دیا گیا۔ بلکہ یہ طے پا گیا کہ اگر بہو صاحبہ ایسی منہ زور ہیں تو پھر ایسے ہی سہی، چلو ان کی منہ زوری تمام کرتے ہیں۔
"تم جانتی ہو کہ شادی سے پہلے سسرال آنا بد شگونی مانا جاتا ہے۔" اب شاید وہ دو بدو جنگ پر اتر آئی تھیں۔
اس نے بے زاری سے چچی کی طرف دیکھا۔ "پاک دامن میری بچپن کی سہیلی ہے، میں اس کی شادی میں آنا چاہتی تھی۔ خوشیوں میں شرکت بدشگونی کیسے ہو سکتی ہے؟ ہم فرنگیوں کی آزاد خیالی کی بات کرتے ہیں، ہمیں اپنی تنگ نظری پر بھی نظر ڈالنی چاہیے۔"
"فرنگیوں کا کیا ذکر، ہم ان قابض بے شرم لوگوں کو کیا جانتے ہیں جو تہذیب جانتے ہیں نہ انہیں تمیز ہے۔"
لکھنو والے ہمیشہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکاری رہنے والے تھے کہ اب فرنگی ان کے آقا ہیں۔ ان کی نوابی، ان کے محل سب وہیں قائم ہیں، لیکن تخت و تاج منتقل ہو چکا ہے۔ اب ہندوستان میں دھات کے سکے تو کئی چلتے ہیں، لیکن حکم کا سکہ صرف فرنگی کا چلتا ہے۔ نسل در نسل حاکم، نواب در نوابی، پھر یہ کیسے تسلیم کر لیا جاتا کہ ایک دوسری قوم ان پر حکم چلانے کی اہلیت حاصل کر چکی ہے۔
"تمیز تہذیب تو الگ بات ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ہندوستان کے حاکم ہیں۔" چراغ بھانپ گئی کہ یہی ان کی دکھتی رگ ہوگی۔
خلیا دادی نے ایک تیز کٹیلی نظر سے خالہ کو دیکھا۔ "تمہاری بہو فرنگیوں کی حمایتی لگتی ہیں۔"
"خالہ چپ تھیں، کیا کہتیں، چراغ کو آنکھ سے اشارہ کیا کہ ہر جگہ حقیقت بیان نہیں کرتے، بزرگوں سے اختلاف رکھو لیکن ان کی دل آزاری سے باز رہو۔ موقع محل دیکھ لیتے ہیں۔ عزیز داری تمام کرو اور جاؤ چراغ۔"
"یہ حمایت نہیں حقیقت شناسی ہے، آپ کو عجیب لگا تو جانے دیں، میں ویسے بھی نادان ہوں۔" چراغ نے شانے اچکائے۔
"نادان کی زبان آفت کی پرکالہ ہے۔" وہ استہزائیہ ہنسیں، ان گنت زیورات میں لرزا طاری ہوا۔
اسے دادی کا طنز برا لگا بلکہ سب طنز برے لگے تھے۔ وہ ان کے سامنے کھڑے کھڑے تھک چکی تھی، پھر جھک کر رومال بھی پیش کیا تھا۔ اب خالہ عزیز داری قبول ہی نہیں کر رہی تھیں۔ دراصل یہ بھی ایک طرہ ہے کہ سامنے والا جھک کر غلاموں کی طرح کھڑا رہے۔ کفایت تک کو برا لگا کہ دیکھو چراغ کو کیسے مؤدب کھڑا کر رکھا ہے۔ تھک کر چراغ نے ہتھیلی پر پھیلے رومال کی طرف اشارہ کیا۔ پھر نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے منہ سے وہ آواز نکل گئی جو کوچوان گھوڑوں کو تیز دوڑانے کے لیے زبان گول کر کے نکالتے ہیں۔
"دادی جان......" آنکھوں سے رومال کی طرف اشارہ اور منہ سے وہ بدہیت آواز کہ رومال سمیٹ لیجیے۔
"بہت خوب! کیا تہذیب ہے تمہاری، کیا سر

pklibrary.com

نکالا ہے تم نے......'' انہوں نے طنز کیا۔
چراغ نے پورے دانت نکال دیے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی نانی صاحبہ نے اس کی پیش خدمت ہتھیلی پر اپنا ہاتھ رکھ دیا، یعنی عزیز داری قبول کی۔ رومال سمیٹ کر اپنی ہتھیلی پر پھیلا کر جائزہ لینے لگیں۔ اس کے جھکے ہوئے سر پر پیار دیا، پیشانی کو چوما۔ لیکن کچھ ایسے ہوا کہ اس نے سر اٹھایا ہی تھا کہ اسے زوردار چھینک آ گئی۔
بعدازاں اماں برہم ہوئیں، چچی رو دینے کو ہو گئیں لیکن وہ حلف اٹھانے کے لیے تیار تھی کہ چھینک لانے میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ جلدی سے ایک طرف ہو کر چھینک لیتی لیکن چھینک ایسی طوفانی اور موسلا دھار تھی کہ اسے موقع نہیں مل سکا اور ساری نشست گاہ اس قیامت سے دہل کر رہ گئی۔ دادی کے دائیں بائیں مورچھل پکڑنے والیوں کے ہاتھ تک ساکت ہو گئے۔ چھینٹے اڑ کر دادی کے چہرے تک گئے۔
ریشمی رومال گر گیا، سکے پھسل گئے دادی کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلیں جبکہ بہت دور کھڑی کفایت نے ایسی ہلاکت خیز، جنگجوانہ چھینک پر زور سے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارا۔
''اب عزیز داری مکمل ہو گئی، سونے کے سکوں کے ساتھ چاندی کی برسات بھی مل گئی۔''
سب دادی صاحبہ کی طرف دیکھ رہے تھے......
سب چراغ کو گھور رہے تھے......
خالہ رو دینے کو ہو گئیں...... اماں فوت ہونے کو ہو گئیں......
ایک کی بیٹی، دوسری کی بہو۔ کیا جو چراغ ان کا نام روشن کر دینے پر کمربستہ تھی۔ اس نے دوپٹے کے پلو سے اپنا منہ صاف کیا، ناک کو بھی رگڑا۔ اور اسی پلو سے خالہ بیگم کے انگارہ چہرے کو صاف کر دیا۔ مسکرا کر دکھایا۔ پھر معصومیت سے جھکی اور ہاتھ سے پھسل کر گرا ریشمی رومال اور سکے سمیٹنے لگی۔
ہم خوں بہ خوں......
ہم جنوں بہ جنوں......
سر اٹھا کر اس نے خالہ کی طرف دیکھا اور کہا۔
☆☆☆
وہ خوں بہ خوں......
وہ جنوں بہ جنو......
آبنوس اپنے سسرال گئی تھی، واپسی پر اسے یہ معاملہ معلوم ہوا تو وہ خاصی محظوظ ہوئی۔ وہ خلیا دادی سے آداب تسلیمات کر چکی تھی۔ وہ بھی خفا خفا رہیں، کھانے پینے سے ہاتھ کھینچ لیا، سر شام ہی سونے کے لیے چلی گئیں۔ عندیہ یہ تھا کہ وہ واپس بھی جا سکتی ہیں۔ آبنوس ان کی عادت سے واقف تھی اور یہ بھی کہ وہ کچھ ضروری، غیر ضروری شوق رکھتی ہیں، لیکن دل کی اچھی ہیں۔ ایاں اور چچی نے چراغ پر صرف ایک قہر آلود نظر ڈالی تھی۔ تاریخ گواہ تھی کہ اسے کتنا بھی پھٹکار لیا جائے وہ کرتی اپنی مرضی ہے۔ جبکہ وہ انہیں سمجھاتی رہی کہ سب کچھ آپ کے سامنے ہی ہوا تھا، میں نے بالکل ویسے ہی عزیز داری حاضر جناب کی تھی جیسے آپ نے کہا تھا۔ پر ان دونوں نے اس سے منہ پھیر لیا۔ کفایت کو اشارہ کیا کہ اسے کہیں ایسی جگہ لے جاؤ کہ اس کی شکل دکھائی نہ دے۔
''انہیں لاہور بھجوا دیں۔'' کفایت کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔
''ساتھ اپنا بھی سامان باندھ لینا۔''
کفایت کی ہنسی گم ہو گئی۔ یعنی کرے چراغ بھرے کفایت۔ کس لیے؟
''یہ ظلم نہیں ہونے دوں گی میں۔'' وہ سوچ دماغ میں رہی تھی لیکن نکل زبان سے گیا، وہ بھی انگلی لہراتے ہوئے۔ چچی نے اس انگلی کو ہی پکڑ کر کھینچ دیا۔ ''اپنی شکل گم کر لے کفایت! سب ایک جیسی ہو۔''
چراغ کا مزاج بھی برہم تھا کہ میرا قصور ہی کیا ہے۔ اماں ناراض، خالہ تک بدگماں، کتنا ظلم تھا۔
''کچھ بزرگوں کا ادب لحاظ بھی ہوتا ہے بی بی!

انہیں عزیزی پیش کرنا روایت ہے، کچھ تو روایتوں کا احترام کرو۔"

"میں نے کہاں گستاخی کی، ایک تو لکھنؤ والوں کی ناک بہت اونچی ہے۔"

"تمہاری حرکتیں بہت تیکھی ہیں۔ لکھنؤ کی کیا بات کرتی ہو، جیسے لاہور والوں کو تو جینے دیتی ہو۔"

"انہوں نے مجھ پر طنز کیوں کیے۔"

"شیر، دل رکھتی ہو، آگ میں بھی کود جاتی ہو، چار چھ طنزوں نے تمہارا کیا بگاڑ لیا۔ سب کے ساتھ زبان چلانا کہاں کا طریقہ ہے۔"

نسترن نے پاک دامن کو اچھے سبق یاد کروا دیے تھے کہ بی بی سسرال میں کیسے کیسے رہنا ہو گا۔ وہی سبق وہ چراغ کو سنا رہی تھی۔

"جوان ہو، خوبصورت ہو، ہر شے پر حق رکھتی ہو، تمہارا زمانہ ہے، حکمرانی کرنے کے لیے تیار ہو، ہر طرح سے دست بردار ہو چکے عمر رسیدہ لوگوں کو کچھ رعایتیں بھی نہیں دو گی۔ اپنے تخت چھوڑنے آسان نہیں ہوتے۔ خاندان کے بزرگ اپنے اختیارات اگلی نسلوں کے لیے چھوڑ دیتے ہیں، کیا ایسا کرنا آسان ہے؟"

کمرے میں آبنوس آئی، اسے اپنے سامنے بٹھا کر سمجھانے لگی۔

"عمر رسیدہ...... اتنے ہار سنگھار کے ساتھ عمر رسیدگی کچھ ہضم نہیں ہو رہی۔"

آبنوس نے گہرا سانس لیا۔ "ہار سنگھار کسی بھی عمر میں ہو، وہ گناہ نہیں ہوتا، تم اتنی تنگ نظر کب سے ہو گئی ہو۔"

"آپ بھی ان نک چڑھی خاتون کی حمایت کر رہی ہیں۔"

"میں خالہ دادی کے اس بھرم کی جس پر وہ زندہ ہیں کی حمایت کر رہی ہوں۔ اگر کسی کو یہ بھرم ہے کہ بچے بڑے، بوڑھے سب میری عزت کرتے ہیں، نئی نویلی دلہنیں خوشی سے مجھے عزیز داری پیش کرتی ہیں، تو اس بھرم کو توڑ دینا کم ظرفی ہے

چراغ! اگر تمہیں کسی پر یہ مان ہو کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے، تمہارے نخرے اٹھاتا ہے، اور پھر وہی انسان یہ مان توڑ دے تو کیسا لگے گا؟"

وہ لاجواب ہو گئی۔ ایک اعتبار کا مان اس کا بھی ٹوٹا تھا۔ پاک دامن نے آبنوس کو اشارے سے اکسایا کہ اسے تھوڑا اور پھٹکار دیا جائے۔ آبنوس نے شرارت سے ہونٹ بھینچ لیے۔

"پاک دامن مجھے اشارے کر رہی ہے کہ میں تمہیں اچھی طرح سے ذلیل کروں۔"

پاک دامن کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ وہ رو دینے کو ہو گئی کہ خطا ہے جو کوئی ایک بھی نیک، شریف انسان اس محل میں پایا جاتا ہو۔ چراغ نے گردن گھما کر پاک دامن کی طرف دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔

"نئے لوگ پرانے لوگوں کی قدر نہیں کرتے، جب خود پرانے ہو جاتے ہیں، تب سمجھتے ہیں۔ ایسے ہی جیسے ہم نے اپنی حکمرانی کی قدر نہیں کی اور دیکھو چھن گئی نا۔ گئے ہاتھ سے سب تاج و تخت۔"

دل کی سلطنت، دل کے تخت و تاج، ان کی ناقدری کی جائے تو سب چھن جاتا ہے۔ پھر انسان غلام بن جاتا ہے، اور قید کے دن کاٹتا ہے۔

☆☆☆

رات خاموشی سے بہت کچھ سوچتے ہوئے گزر گئی۔ صبح وہ باغ کی سمت آئی۔ خالہ دادی کا تخت باغ میں لگا تھا، وہ ناشتہ کر چکی تھیں، سفید پھولوں کا ڈھیر قریب رکھا تھا، شاید خالہ نے انہیں خوش کرنے کے لیے رکھوائے تھے۔ مور چھل والیاں غائب تھیں، شاید مکھیاں ناپید ہو چکی تھیں۔ ان کا صبح کا لباس ہلکا پھلکا تھا، زیورات میں بھی خاصی کمی آ چکی تھی۔ جو اہتمام نئی نویلی بہو پر دھاک بٹھانے کے لیے کیا تھا، اب اس سے دل اچاٹ ہو چکا ہو گا۔ اسے آتے دیکھ کر خالہ کا کے چہرے کا رنگ بدل ہو گیا، چراغ کو بھی تھوڑا ڈر لگا لیکن وہ بہت کوشش سے اپنے اندر پیدا کی گئی شرافت کو لیے آگے بڑھی۔ آداب کہا۔

"دادی صاحبہ آپ سے عرض کر رہی ہوں۔"

pklibrary.com

☆☆☆

خالہ دادی کو راضی کرنے کا یہ نقصان ہوا کہ وہ گاہے بگاہے اسے پیغام بھیج کر بلوا لیا کرتیں اور اپنے زمانے کی باتیں سنایا کرتیں۔ اب ان کا زمانہ کچھ اتنا لمبا تھا کہ ختم ہونے میں نہیں آتا تھا۔ کچھ انہیں مبالغے کی بھی عادت تھی۔

بہت سی باتیں چراغ کے حلق سے نیچے نہیں اترتی تھیں جیسے کہ ان کی شان میں کروائے گئے ہاتھیوں کے رقص کی بات۔ ہاتھیوں سے جنگ کی بابت سب جانتے تھے، لیکن یہ ہاتھیوں کے رقص کا قصہ صرف خالہ دادی کے پاس ہی تھا۔ وہ جمائیاں روکتی۔ بڑی کوشش کرتی کہ چہرے سے بے زاری ظاہر نہ ہو۔ یہ سسرال کے ساتھ نباہ کتنا مشکل ہے۔

''اکیلے انسان کا جینا آسان ہے، سارے خاندان کو خوش رکھنا بڑا محال ہے۔'' پاک دامن نے یاد دلایا۔

انہوں نے اسے اپنے زیورات میں سے کئی قیمتی چیزیں۔ ایب وہ لوگوں کے تحفے دریا کے پانی کی نذر کر دیا کرتی تھی، ان تحائف کا کیا کرتی جو اس کے مزاج کے بالکل الٹ تھے، یہ وزنی وزنی انگوٹھیاں جن کے ساتھ کسی نہ کسی نواب کا نام یا کوئی تاریخ منسلک تھی۔ دل چاہا کفایت کو دے دے لیکن مجبور انگلیوں میں پہن کر انہیں دکھانی پڑیں۔

☆☆☆

بیرام کی آمد کی اطلاع تھی، مہتاب کتنی خوش تھی، اس نے اپنے شوہر کو ایک خط بھی لکھا تھا جس کا کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ اس کی آمد کا سن کر اس کا چہرہ چمکنے لگا تھا۔ چراغ کو حیرت تھی کہ فرہاد کے آنے کا سن کر اس کا چہرہ ایسے کیوں نہیں ہو سکا تھا۔ وہ گہری سوچ میں چلی گئی کہ کیا وہ ایک بے حس لڑکی ہے۔ وہ اپنے علاوہ ہر انسان سے نفرت کرتی ہے۔ وہ خود پسند اور خود غرض ہے۔

بیرام آیا، اس سے آگرہ کا احوال سنتا رہا۔ وہ بتاتے بتاتے درمیان میں خاموش ہو ہو جاتی تھی۔

''آپ لاہور سے آئے ہیں؟'' وہ پوچھنا کچھ اور چاہتی تھی۔

وہ ہنسا۔ ''کیسا سوال ہے...... ہاں میں لاہور سے آ رہا ہوں۔''

''وہاں سب ٹھیک تھا؟''

''لاہور میں...... میرا خیال ہے، سب قلعے اور دروازے سلامت ہیں، تمہیں سلام کہہ رہے تھے۔''

وہ زیر لب ہنس کر رہ گئی۔ اندر ہی اندر شرمندہ ہو رہی تھی۔

''تمہیں وکٹوریہ یاد آ رہی ہے؟''

وہ تو وکٹوریہ کو بھول بھی چکی تھی۔

''ہاں......''

''تم نے ہی یہاں آنے کی ضد کی تھی۔''

''غلط کی تھی......''

چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''تم نے آج تک اپنی کسی بات کو غلط نہیں کہا چراغ! کیا ہوا ہے تمہیں، کسی نے کچھ کہا ہے؟''

وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ ''نہیں...... میرا مطلب یہاں بہت پابندیاں ہیں۔''

بیرام چند لمحے خاموش ہو گیا۔ ''اماں سے بات کروں، وہ خالہ سے بات کریں گی۔''

بیرام بات کو کہاں سے کہاں لے گیا تھا۔ ''نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔'' اسے بہتر لگا کہ وہ خاموش ہو جائے۔

''آپ آبنوس کو پسند کرتے تھے؟'' چراغ کو

(اتنا ادب دکھا رہی ہوں، اتنی تمیز سے پیش آ رہی ہوں، جواب تو دیں)

"تسلیمات۔" نہ کم نہ زیادہ، بس اب جاؤ۔

"مزاج عالی، مزاج مبارک...... مزاج شریف کیسے ہیں؟"

اس کا بھی جواب نہیں ملا تو وہ ان ہی کے تخت کے کنارے پر بیٹھ گئی جب کہ اصولاً اسے کسی دوسری نشست پر بیٹھنا چاہیے تھا۔ خالہ بے چاری اپنا دل سنبھال کر ادھر ادھر ہو گئیں۔ آبنوس باغ میں مہریوں سے کچھ کام کروا رہی تھی۔ ان کی طرف مزید کئی طرح کے پھول بھجوا دیے کہ ماحول اچھا رہے گا۔ چراغ نے خوش رنگ پھول اپنے سامنے رکھ لیے۔ خالہ دادی نے کن اکھیوں سے چراغ کی طرف دیکھا کہ کتنی شرافت سے بیٹھی ہے، جیسے اس سے معصوم اور پری صفت کوئی نہیں۔

"آپ سے ایک کام تھا۔" پھولوں میں سے ایک پھول اٹھا کر اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔

"فرمایئے......" (فرمایئے اور نظروں سے دور ہو جایئے، خدارا)

"آپ شاید ناراض ہو جائیں۔"

"آپ کو اس کی کیا پرواہ، آپ کام عرض کیجیے۔"

"مجھے معاف کر دیجیے۔" اس نے ہاتھ میں پکڑا پھول ان کے سامنے پیش کر دیا۔

خالہ دادی کو ہر چیز کی توقع تھی سوائے اس ایک معافی نامے کے۔ ایک نظر پھول کو دیکھتیں، ایک نظر چراغ کو۔

"ہم سے بہت گستاخیاں ہوئیں، ہمارے سب قصور جانے دیجیے، اپنی محبت کی نظر کرم سے، ہماری تمام خطائیں معاف فرمایے۔"

اس کی اردو پر خالہ دادی نے اپنی ہنسی چھپانے کی سر توڑ کوشش کی۔ یہ تو انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ منہ چڑھی بیٹی اور بہو ہے، نازنخروں میں رہی ہے، کسی کو گھاس تو کیا ڈالے گی، الٹا ناک چنے چبوائے گی۔ ان کی عمر کے لوگوں کے پاس ایک عزت کا ہی تو بھرم ہوتا ہے، باقی سب کچھ تو وقت کے ساتھ جا چکا ہوتا ہے۔

"ہماری محبت کی کیا قدر۔" ذرا نروٹھے پن سے کہا۔

وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی اور پھول کو ان کے کان کے پاس بالوں میں لگا دیا۔ "محبت اپنی قدر خود کرواتی ہے۔"

وہ دنگ رہ گئیں۔ ہاتھ بڑھا کر بالوں میں لگے پھول کو محسوس کیا۔

"بہت پیاری لگ رہی ہیں آپ۔" (زیوارت ذرا کم پہنا کریں)۔ مسکرا کر کہا۔

کفایت چچی کو اندر سے بلا کر لائی تھی کہ دیکھیں، آپ کی لاڈلی اب مزید کوئی کارنامہ سرانجام دینے والی ہے، اسے روک لیں، میں کسی صورت واپس لاہور نہیں جاؤں گی۔ میں کسی کے کیے کی سزا نہیں بھگتوں گی، غریب ہوں تو کیا ہوا، انسان تو ہوں۔

لیکن باغ کے منظر نے چچی کو حیران کر دیا کہ خالہ دادی چراغ کے ہاتھ کی پشت چوم رہی ہیں۔ آبنوس چلتی ہوئی دونوں کے پاس آئی، چراغ کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اپنی طرف متوجہ کیا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں بہت کچھ کہہ سن لیا۔ پھر تینوں باتیں کرنے لگیں۔ اب چراغ جو کچھ بھی بول رہی تھی خالہ دادی اس پر واری صدقے ہو رہی تھیں۔ کفایت کا منہ بن گیا۔

"مجھے ہمیشہ سے یقین ہے کہ ان کے پاس کوئی جادو ہے۔ بگاڑ بھی آسانی سے لیتی ہیں اور سنوار بھی جلدی سے لیتی ہیں۔ ایک مجھ کم بخت کو ہی کوئی ہنر نہیں آتا، جب سے پیدا ہوئی ہوں، ایسی ہی پھوہڑ اور نانبجار ہوں۔ دکھ ہیں کہ جان نہیں چھوڑتے۔ مصیبتیں ہیں کہ میری ہی دہلیز پکڑ کر بیٹھ گئی ہیں۔"

وہ ہاتھ جھلا جھلا کر بڑبڑ کرتی رہی۔

pklibrary.com

اچانک یاد آیا، پوچھ لیا۔
اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔
"نہیں......"
"میں نے آپ کا ایک خط پڑھا تھا۔" صاف گوئی سے بتا دیا۔
بہرام نے ہونٹ بھینچ لیے۔ "میں جو چیز پسند کرتا ہوں، اسے حاصل کر لیتا ہوں۔"
چراغ کو اپنے آغائی کے سخت لب و لہجے سے خوف آیا اور پہلی بار آیا۔

☆☆☆

دونوں بہن بھائیوں کو باغ میں ٹہلتے، باتیں کرتے، اوپر کھڑی آبنوس دیکھ رہی تھی۔ وہ اس انسان کو پندرہ سال بعد دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کی شادی سے چند دن پہلے چپکے سے اس کے کمرے میں آیا تھا اور اس سے کہا تھا کہ وہ اس شادی سے انکار کر دے، کیونکہ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ حویلی سے اس کے لیے رشتہ بھی بھیجا گیا تھا، جس پر انکار ہو گیا۔ اس رات وہ اسے اپنی محبت کا یقین دلاتا رہا اور پھر ناکام لوٹ گیا۔
وہ باغ سے جانے لگا تو اوپر کھڑی آبنوس پر نظر پڑی۔ سر کے اشارے سے آداب کہا۔ کچھ سوچ کر اوپر کی سمت بڑھ گیا۔
"کتنی مدت بعد تمہیں دیکھ رہا ہوں، بیوہ ہو کر بھی حسین ہو۔"
آبنوس نے لب بھینچ لیے۔ ان کی آخری ملاقات اچھے انداز میں تمام نہیں ہوئی تھی۔ ان کی آئندہ ملاقات بہتر کیسے ہو سکتی تھی۔
"میں بیوہ ہوں پھر بھی حسین ہوں، خوش ہوں، مہتاب کا شوہر حیات ہے پھر بھی اس پر بیوگی چھائی رہتی ہے، اپنی بیوی کو انسان نہیں سمجھتے، یا اسے صرف سجانے کے لیے حویلی میں رکھا ہے۔"
"تم اتنی تلخ کیوں ہو رہی ہے...... اپنی بدنصیبی کا بدلہ دوسروں کا دل کڑوا کر کے نہ لو۔ سنا تھا جو عورتیں جوانی میں بیوہ ہو جاتی ہیں، وہ ایسے ہی کاٹ کھانے کو دوڑتی ہیں، لیکن تم سے یہ امید نہیں تھی۔" اس نے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔
"تم حقیقت بیان کرنے کو تلخی کہتے ہو۔"
"تمہیں کسی بڈھے، رنڈوے امیر زادے سے شادی کر لینی چاہیے تھی۔ کسی کی دوسری تیسری بیوی بن ہی جاتیں، ایسے اکیلی نہ ہوتیں۔ اب دیکھو نا کبھی یہاں خالہ کے پاس ہوتی ہو، کبھی وہاں اپنے میکے میں ہوتی ہو۔ تم کتنے ہی بڑے بڑے محلوں میں رہو، پھر بھی بیوہ اور بے گھر ہی کہلاؤ گی۔"
آبنوس کے دل کو شدید تکلیف پہنچی۔
"اتنے زیورات پہن کر رکھتی ہو، شاید ت اس حقیقت قبول نہیں کر سکیں کہ تم بیوہ ہو چکی ہو۔"
"تمہیں کسی نے دوبارہ یاد دلایا کہ تمہاری سوچ آج بھی گھٹیا ہی ہے۔"
اس نے قہقہہ لگایا۔ "دیکھو خود کو آبنوس! تمہارا غرور کم نہیں ہوا...... دیکھو خود کو آئینے میں...... یہ جوزیوارت تم نے پہنے ہیں، یہ غلامی کی علامت ہیں، ہم مردوں نے تمہیں نکیل ڈالنے کے لیے بنوائے تھے۔" اب وہ اسے طیش دلا رہا تھا۔
"ان مردوں نے بنوائے غلامی کی نیت سے ہوں گے، میں نے پہنے آزادی سے ہیں۔"
اس نے جان دار قہقہہ لگایا کہ وہ اسے آگ بگولہ کرنے میں کامیاب ہو چکا ہے۔
"سنا ہے کہ پہلے پہل مردوں نے جو جوتے پہنے تھے، وہ عورت کی کھال سے بنے پہنے تھے۔"
ایک لحہ سناٹا......
"شاید ایسا ہی ہو گا، لیکن کس عورت کی کھال کے بنے پہنے تھے...... بیوی کی کھال کے یا بہن کی کھال کے؟"
بہرام کا چہرہ تمتما گیا۔ ایک چراغ اس کی دکھتی رگ تھی۔ ایک چراغ پر وہ کوئی بات نہیں سن سکتا تھا۔
(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)
☆☆

مکمل ناول

نمرہ احمد

گیارہویں قسط

ہر سانس کے ساتھ کھو جاتا ہے گزرا ہوا لمحہ۔
اور شروع ہوتا ہے ایک نیا لمحہ۔
ہم سانس اندر کھینچتے ہیں۔
اور اسے باہر خارج کر کے ماضی کے لمحے کو
چھوڑ دیتے ہیں۔

اب وہ ہمارے لیے فنا ہو چکا ہے۔
اور یہ کرتے ہوئے ہم فنا کر دیتے ہیں اس
انسان کو جو ہم ایک لمحہ پہلے تھے۔
ہم سانس اندر کھینچ کے، نئے لمحے میں سانس
لے کر،

pklibrary.com

اس شخص کا استقبال کرتے ہیں جو ہم بنتے جارہے ہیں۔
اور یوں ہم اسی عمل کو دہراتے رہتے ہیں۔
یہی مراقبہ ہے۔
یہی تجدید ہے۔
یہی زندگی ہے۔
(لاماسوریاداس)

مبین منزل میں بنے بیڈرومز میں واحد ماہی کا کمرا تھا جس کی کھڑکی عقبی صحن میں کچن گارڈن کی طرف کھلتی تھی۔ چند روز قبل وداع ہوئی فاختہ کی قبر بھی وہیں تھی۔ اس کی مٹی کا رنگ اطراف جیسا ہوگیا تھا اور اس پہ ننھی ننھی سی گھاس اُگ رہی تھی۔ مالا کھڑکی سے نظر آتی اس قبر کو دیکھ رہی تھی جب معید کھنکھارا۔

''تم نے فیصلہ کرلیا ہے؟''

اس نے چہرہ موڑ کے اپنے بھائی کو دیکھا۔ وہ اس کے سامنے بیٹھا سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔ ساتھ براجمان ماہی، گود میں رکھی چاولوں کی پلیٹ میں سے کھاتے ہوئے ان کی طرف متوجہ تھی۔ وہ تینوں اس وقت ماہی کے کمرے میں تھے جس میں جگہ جگہ بے بی فیڈرز، فارمولا ملک کے ٹن، اور ایسی دیگر اشیاء بکھری تھیں۔

''زیاد اور میں نے مل کر فیصلہ کیا ہے۔ ہم دونوں کو اپنی آئندہ زندگی کے لیے یہ بہترین لگا ہے۔'' وہ پراعتماد تھی۔ معید نے ایک اطمینان بھری سانس خارج کی اور دھیرے سے مسکرادیا۔

''مجھے زیاد ہمیشہ سے پسند رہا ہے۔ ویل مینرڈ۔ اچھی جاب کرتا ہے۔ ڈیسنٹ ہے۔''

''ڈیسنٹ ہے لیکن.....'' ماہی نے چاولوں کا چمچہ منہ میں رکھا۔ وہ دونوں اس کے لیکن پہ چونک کے اسے دیکھنے لگے۔ وہ گڑبڑا گئی اور جلدی جلدی چاولوں کو حلق سے نیچے اتارا۔ پھر پانی کا گھونٹ بھرا اور کھنکھاری۔

''لیکن تمہیں زیاد سے بہتر بھی کوئی مل سکتا ہے۔''

''تمہیں زیاد میں کیا برائی نظر آتی ہے؟'' وہ چونکی۔ ماتھے پہ لکیریں ابھریں۔ اسے ماہی کا انداز پسند نہیں آیا تھا۔

''زیاد ذرا....'' ماہی الجھ کے رک گئی۔ جیسے کچھ حلق میں اٹک جاتا تھا۔ جیسے کوئی سوچ جکڑ لیتی تھی۔ ''مجھے نہیں معلوم۔ بس سوچ لو۔''

''تم بھی سوچ لو ماہی۔ سفید چاول کھائے جا رہی ہو۔ جانتی ہو یہ صحت کے لیے کتنے نقصان دہ ہوتے ہیں؟'' معید نے اس کی پلیٹ کو افسوس سے دیکھا۔ ماہی کے ماتھے پہ بل پڑے۔ زور سے چمچہ پلیٹ میں رکھا۔

''سب میرے کھانے کے پیچھے کیوں پڑے ہیں؟'' وہ مزید کچھ کہتی لیکن فون بجنے لگا۔ ایک خفا نظر دونوں پہ ڈال کے پلیٹ اور فون اٹھائے وہ وہاں سے اٹھ آئی۔

''خالہ کی کال ہے۔ میں سن کے آتی ہوں۔''
جاتے جاتے بھی معید کو شدید بری طرح گھورا تھا۔

''کون سی خالہ؟'' معید نے غائب دماغی سے پوچھا۔ مالا نے خفگی سے اسے دیکھا۔

''ہماری کتنی خالائیں ہیں معید؟ ایک ہی تو ہیں۔ ماں اور نورِ جہاں خالہ کی سب سے بڑی بہن۔ ثمر جہاں۔''

''ایسے کہو ثمر خالہ۔ ماہی کی ساس۔ تم لوگ بھی ہر پڑوسن کو خالہ بنالیتی ہو۔ مجھے کیا پتا۔'' وہ ہنس دیا اور مالا افسوس سے اسے دیکھ کے رہ گئی۔

''خالہ کا طرزِ تخاطب ہم صرف ثمر خالہ کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ تمہیں سگی خالہ اور پڑوسنوں میں فرق معلوم ہونا چاہیے۔ رشتے داریاں یاد رکھنا صرف لڑکیوں کا فرض نہیں ہوتا۔''

وہ دونوں اب آپس میں الجھ رہے تھے۔
اور کچن میں کھڑی ماہی موبائل کان سے لگائے سادگی سے اپنی ساس کو بریفنگ دے رہی تھی۔

''ابھی نگینہ آنٹی نے صرف فون پہ معید اور مجھ

pklibrary.com

سے بات کی ہے۔ اگلے ہفتے وہ انکل کے ساتھ پاکستان آئیں گی تو ہم بات پکی کریں گے۔''

''نگینہ کے گھر رشتہ کیوں کر رہے ہو تم لوگ؟'' خالہ جھنجلائیں۔ ماہی چونکی۔

''کیوں؟ کیا ہوا؟''

''وہ لوگ مالا کے قابل نہیں ہیں۔ اتنی جلدی مت کرو۔''

''مگر خالہ... زیاد میں کیا برائی ہے؟'' ماہی الجھ سی گئی۔

''مالا کو اس سے بہتر بر مل سکتا تھا۔'' وہ افسوس سے بولیں۔ ماہی نے بے اختیار لاؤنج کے پار اپنے کمرے کے بند دروازے کو دیکھا۔ ابھی یہی تو اس نے بھی کہا تھا۔

''آپ مالا سے بات کر کے دیکھیں۔''

''میں خود آ کے اس سے بات کروں گی۔''

''مگر آپ نے دو ماہ بعد آنا ہے۔ فون پہ بات کرلیں۔'' وہ بے چین ہوئی۔

''یہ باتیں فون پہ نہیں ہوتیں۔ اور تم لوگ فوراً جواب نہ دو۔ تھوڑا وقت مانگو۔ دو تین ماہ تو لڑکی والوں کی چوکھٹ پہ لوگ جوتے گھساتے ہی ہیں۔'' وہ آرام سے بولیں۔ ماہی نے بے اختیار ماتھے کو چھوا۔

وہ واپس آئی تو قدرے غائب دماغ سی لگ رہی تھی۔

''خالہ کیا کہہ رہی تھیں؟'' مالا نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ سوچ میں گم دھپ سے صوفے پہ بیٹھی۔

''خالہ چاہتی ہیں کہ ہم ان کے آنے کا انتظار کریں اور رشتہ ان کی موجودگی میں طے ہو۔ ہماری طرف سے کسی بڑے کا ہونا بھی ضروری ہے۔'' اس نے الفاظ جوڑے۔

''میں ہوں نا۔'' معید کو کچھ برا لگا۔ ''اور ماموں بھی آجائیں گے۔ مسئلہ کیا ہے؟''

''خالہ ابھی لمبا سفر نہیں کرسکتیں۔ ان کے گھٹنے کی سرجری ہوئی ہے نا۔ ماں کی ڈیتھ پہ بھی اسی لیے نہیں آسکیں۔ ہم ان کا انتظار کرسکتے ہیں۔ جنوری کے آخر تک وہ آجائیں گی اور میں تو مارچ تک یہیں ہوں۔'' بظاہر اس نے لاپرائی سے شانے اچکائے البتہ کمرے میں پھیلا تناؤ سب محسوس کرسکتے تھے۔

''نگینہ آنٹی کینسر پیشنٹ ہیں۔ ان کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ وہ دو ماہ میں شادی کی بات کر رہی تھیں۔ اور تم کہہ رہی ہو ہم رشتہ تک طے نہ کریں۔'' معید خفا ہوا۔ ماہی نے شانے اچکا دیے۔

''ٹھیک ہے۔ جیسے تم لوگ کہو۔'' کمرے میں چند لمحے کے لیے تناؤ بھری خاموشی چھا گئی۔ پھر ماہی کو جیسے کچھ یاد آیا۔

''ویسے نگینہ آنٹی چند دن پہلے پاکستان تھیں نا۔ جب انہوں نے حور کو گھٹی دی تھی۔ پھر واپس کیوں چلی گئیں؟''

''وہ ہر مہینے صرف پانچ دن کے لیے پاکستان آتی ہیں۔ یہ ان کی پرانی روٹین ہے۔''

''تھکتی نہیں ہیں اتنے ٹریول سے؟ بیمار بھی ہیں۔''

''میں نے بھی زیاد سے یہی پوچھا تھا۔ لیکن وہ کہہ رہا تھا کہ تین گھنٹے کی تو فلائٹ ہے۔ اور نگینہ آنٹی کو اپنا لاہور والا گھر بہت عزیز ہے۔ یہاں آکے وہ بہتر محسوس کرتی ہیں۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور نرمی سے ماہی کو دیکھا۔

''خالہ جب بھی آئیں، موسٹ ویلکم۔ لیکن میں اپنی زندگی کے فیصلے اپنے رشتے داروں کے فلائٹ شیڈول کے مطابق نہیں کرسکتی، ماہی۔ میں فیصلہ کرچکی ہوں۔'' اس کا انداز نرم مگر دوٹوک تھا۔ ماہی کا سر اثبات میں ہل گیا۔ جب مالا فیصلہ کرلے تو کوئی چیز اس کو اس فیصلے سے نہیں ہٹا سکتی تھی۔

☆☆☆

''کیا میں نے درست فیصلہ کیا ہے؟''

اس دوپہر صفورا اور وہ ایک ریسٹوران میں

pklibrary.com

آمنے سامنے بیٹھی تھیں۔ان کے اوپر شیشے کی چھت بنی تھی جس پہ جگہ جگہ بوگن ویلیا کے گلابی پھول نظر آرہے تھے۔دیواریں بھی شیشے کی تھیں جو کہیں سے اونچے پودوں سے ڈھکی تھیں۔اور کہیں سے سرما کی نرم دھوپ کو اندر آنے کا راستہ دے رہی تھیں۔

اس نے صفورا سے یہ سوال اپنے لنچ کو دیکھتے ہوئے پوچھا تھا جو اس کے سامنے اَن چھوا رکھا تھا۔

صفورا اپنے لنچ کی تصویر کھینچ رہی تھی کیونکہ وہ اپنا کھانا انسٹا گرام کے اجنبیوں کو دکھانا فرض سمجھتی تھی۔اس سوال پہ چونک کے چہرہ اٹھا کے اسے دیکھا۔مالا کی آنکھیں پلیٹ پہ جھکی تھیں۔سیاہ بال چہرے کے دونوں اطراف میں گر رہے تھے۔سبز کارڈیگن کے اندر جھانکتے سفید کرتے کے گریبان پہ سیاہ فاختہ والا لاکٹ جگمگا رہا تھا۔کچھ تھا کشمالہ کے چہرے پہ جو اداس کر دینے والا تھا۔

''بہترین فیصلہ ہے۔زیاد کے بارے میں جتنا میں نے تم سے سنا ہے وہ ایک شاندار انتخاب ہے۔اپنے فیصلے پہ شک کیوں کر رہی ہو؟'' صفورا نے چھری کانٹا پلیٹ میں چلانا شروع کر دیا۔

''کہیں میں جلد بازی سے کام تو نہیں لے رہی؟ یعنی دو ماہ میں شادی۔'' اس نے نگاہ اٹھا کے صفورا کو دیکھا۔وہ کانٹے کو چکن فلے میں گاڑے، چھری سے ایک ٹکڑا کاٹ رہی تھی۔

''انتظار کس کا کرنا ہے؟امی رہیں نہیں۔یہاں رہ کے کیا کرو گی۔دبئی جاؤ اور نئی زندگی شروع کرو۔'' پھر اس کا چہرہ دیکھ کے صفورا نے ہاتھ روکا اور ایک گہری سانس لی۔

''تم بتاؤ، مالا۔تم جلد بازی کیوں کر رہی ہو؟''

اور وہ جیسے ایک دم سے بولنے لگی۔

''کیونکہ میں لاہور میں مزید نہیں رہنا چاہتی۔یہاں ہر طرف ماں کی یادیں ہیں۔ڈپریشن ہے۔ایک طویل عرصے سے کوئی میرا تعاقب کرتا آیا ہے۔میں اس سب سے پیچھا چھڑانا چاہتی ہوں۔''

''اب تو وہ تعاقب نہیں کر رہا نا؟'' صفورا نے فکرمندی سے اسے دیکھا۔اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

''نہیں۔کیونکہ میں نے اس کا تعاقب چھوڑ دیا ہے۔''

ذہن کے پردے پہ باتھ روم کے نل والا واقعہ لہرایا۔اور اسٹوڈیو میں پڑا کارٹن جس میں اس نے عامل کے متعلق جمع کی گئی معلومات کو سیل بند کر دیا تھا۔وہ باب ختم ہو چکا تھا۔

''میں نے دبئی میں کچھ جگہوں پہ جاب کے لیے اپلائی بھی کیا ہے۔'' اس نے بالآخر چھری کانٹا اٹھایا۔

''پھر مسئلہ کیا ہے؟''

''کچھ ہے میرے اندر جو مجھے کہتا ہے کہ زیاد میرے لیے بہترین چوائس نہیں ہے۔'' وہ الجھی ہوئی لگ رہی تھی۔

''کیا تمہیں زیاد سے محبت ہے؟''

''کیا مجھے زیاد سے محبت ہے؟'' اس نے الٹا سوال کیا۔

''نہیں ہے؟'' صفورا نے بغور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''پتا نہیں۔'' اس نے بال کان کے پیچھے اڑسے۔سبز آنکھوں میں اداسی سی تھی۔

''مجھے اس کے لیے ایک بے چین کر دینے والی کشش محسوس ہوتی ہے۔جیسے کچھ کھینچتا ہوا اس کی طرف۔وہ سامنے ہو تو سب سے اہم وہی لگتا ہے۔اسے دیکھتے ہی خواہش ہوتی ہے کہ جلد سے جلد میں کوئی فیصلہ کروں ورنہ میں اسے کھو دوں گی۔''

''شروع شروع میں محبت ایسی ہی ہوتی ہے۔'' اس نے لاپروائی سے اسٹیک کا ٹکڑا منہ میں رکھا۔

''واقعی؟'' وہ دھیرے سے ہنسی۔''میں سمجھی محبت مختلف محسوس ہو گی۔''

''مختلف کیسے؟''

مالا نے تھوڑی پہ ہاتھ رکھا اور نظریں اٹھا کے

pklibrary.com

چھت سے لٹکتی بوگین ویلیا کی بیلوں کو دیکھا۔
"میں سمجھتی تھی کہ محبت بے چین اور جلد بازی کروانے والی نہیں ہوگی۔"
"پھر کیسی ہوگی؟"
"بے چینی، سکون کا الٹ ہے۔ کھودینے کا ڈر، تحفظ کا الٹ ہے۔ میں سمجھتی تھی محبت میں کھودینے کا ڈر نہیں ہوگا۔ سکون ہوگا۔ تحفظ ہوگا۔"
(وہ کار کی پچھلی سیٹ پہ بیٹھی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ اور کیف خاموشی سے ڈرائیو کررہا تھا۔ کھڑکی کے باہر کنال کے ساتھ لگے درخت بھاگتے دکھائی دے رہے تھے۔ ہر طرف خاموشی تھی۔)
"میں سمجھتی تھی محبت کمفرٹیبل کردینے والی ہوگی۔ آنکھوں کی ٹھنڈک ہو جیسے۔ تحفظ کا احساس۔"
(وہ کار کا دروازہ کھولے کھڑا تھا۔ اور وہ دھوپ میں کھڑی تھی۔ قریب آئی تو دھوپ کا راستہ رک گیا۔ ہر طرف چھایا تھی۔)
"میں سمجھتی تھی کہ میں اپنی محبت کے ساتھ جہاں بھی ہوں گی، خوش ہوں گی۔ مجھے خوشی کی تلاش میں ایک نئے شہر جا کے نئی زندگی نہیں بسانی پڑے گی۔"

(وہ دونوں عثمان کی بیٹھک میں موڑھوں پہ بیٹھے تھے۔ سامنے مٹی کے پیالوں میں مہک اڑاتی چائے اور نان خطائیاں رکھی تھیں۔ وہ چائے سے اٹھتے دھوئیں کو دیکھتے ہوئے کچھ کہہ رہا تھا اور وہ مسکرا کے اسے سن رہی تھی۔)
"دیکھو میری ارینج میرج ہوئی تھی۔ میرا تجربہ مختلف تھا۔" صفورا کے چھری کانٹا چلانے کی آواز سے کوئی فسوں سا ٹوٹا۔ وہ چونک کے اس کی طرف متوجہ ہوئی۔
"یہ بے چینی وغیرہ شادی سے پہلے ہوتی ہے۔ شادی کے بعد زندگی میں ٹھہراؤ آجاتا ہے۔ ایک ہی انسان سے روز لڑائی اور روز صلح ہوتی ہے۔ وہ ایک اچھا انسان ہے۔ تمہیں خوش رکھے گا۔ ویسے بھی مرد کی شکل کون دیکھتا ہے۔"
"شکل؟" وہ ایک دم چونکی۔ "زیاد کی شکل کو کیا ہوا؟"
"نہیں دراصل...." صفورا گڑبڑا گئی۔ "میرا مطلب تھا، تمہارے مقابلے میں بہت پرنس چارمنگ نہیں ہے لیکن اچھا ہے۔ ڈیسنٹ ہے۔ اور شکلیں کہاں میٹر کرتی ہیں یار۔ اخلاق اچھا ہونا چاہیے۔"
"یعنی تمہیں وہ نارمل لگتا ہے؟" وہ قدرے خفا ہوئی اور اپنے کھانے پہ جھک گئی۔ "مجھے تو وہ بہت ہینڈسم لگتا ہے۔"
"یہی تو محبت ہے۔ نارمل انسان بھی بہت اچھا لگتا ہے۔" صفورا ہنس دی تو وہ بھی مسکرا دی۔
"زیاد تھوڑا تلخ ہے۔ اس کی منگیتر کی موت کا ٹراما ابھی تک تازہ ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ محبت سے اس کو فکس کرلوں گی۔"
اس بات پہ صفورا چونکی۔ پھر کھنکھاری۔ "مالا... کوئی عورت کسی مرد کو جوڑ نہیں سکتی۔ نہ heal (شفا) کرسکتی ہے۔ نہ فکس کرسکتی ہے۔ شادی کے بعد وہ بدلے گا نہیں۔ تھوڑا بہت تمہارے طریقے پہ ڈھل جائے گا۔"
ویٹر ڈرنکس کی ٹرے اٹھائے ان کے قریب آیا اور ادب سے ایک گلاس صفورا کے سامنے رکھا۔
"غلط۔ محبت انسان کو بدل بھی سکتی ہے اور فکس بھی کرسکتی ہے۔ محبت ہی تو ہیل (شفا) کرتی ہے۔ یہ سب سے بڑا مرہم ہوتی ہے۔" وہ مسکرا کے اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ ہوئی۔ صفورا کچھ کہنے لگی تھی لیکن اسی وقت ویٹر دوسرا گلاس رکھنے جھکا ہی تھا کہ گلاس ہاتھ سے سلپ ہوا۔ بہت سا منٹ مارگریٹا کشمالہ کے کندھے پہ جا گرا۔
"اندھے ہو گیا؟ دیکھ نہیں رہے؟" صفورا ایک دم غرائی۔
"صفورا... اٹس او کے۔" اس نے ہاتھ اٹھا کے اسے آنکھوں میں خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ پھر

pklibrary.com

نیپکن اٹھایا اور پرسکون انداز میں اپنا کندھا صاف کیا۔
"سوری میم۔ رئیلی سوری۔" کمزور سا ویٹر گھبرا کے جلدی جلدی معذرت کرنے لگا۔
"کوئی بات نہیں۔ دوسری ڈرنک لے آئیں۔ میں اسے واش کر لیتی ہوں۔" وہ نرمی سے کہتی اٹھ کھڑی ہوئی۔
وہ ریسٹ روم سے واپس آئی تو دیکھا' صفورا کے پاس مینیجر اور ویٹر کھڑے معذرت کر رہے تھے۔ اور وہ خفگی سے ان کو ڈانٹ رہی تھی۔
"اٹس او کے' صفورا۔ جانے دو۔" وہ واپس بیٹھی اور ان کو جانے کا اشارہ کر دیا۔ صاف نیپکن گود میں بچھایا۔ پھر محسوس ہوا' صفورا اسے ناراضی سے گھور رہی تھی۔
"اسے سزا ملنی چاہیے تھی' مالا۔ ورنہ سیکھے گا کیسے؟"
"اس نے میرا کارڈیگن خراب کیا۔ اور تمہاری ڈانٹ نے اس کا پورا دن خراب کر دیا۔ حساب برابر۔ اب اپنی انا کے پیچھے میں کسی غریب کو اس کی نوکری سے نہیں نکلوا سکتی۔"
وہ پلیٹ اپنی طرف کھسکائے' کھانا وہیں سے شروع کر چکی تھی۔
"انا کہاں سے آ گئی درمیان میں؟" صفورا خود بھی ریستوران مینیجر تھی۔ اس کو یہ بات بالکل پسند نہیں آئی تھی۔
وہ جواباً دھیرے سے ہنس دی۔
"ہنسی کیوں؟"
"کچھ نہیں۔ کچھ یاد آ گیا تھا۔" وہ مسکراہٹ دبائے سر جھکا کر کھانے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اس کا دل اب ہلکا پھلکا تھا۔ وہ درست فیصلہ کر رہی تھی۔

☆☆☆

"ناممکن۔ ایک دم ناممکن۔"
روم نمبر ۵۵۵ کی کھڑکی کا بلائنڈ اوپر اٹھا تھا جس کے باعث بظاہر تیز لیکن درحقیقت ٹھنڈی دھوپ اندر داخل ہونے کا راستہ بنا چکی تھی۔ سورج کسی ہمسایہ عمارت کی اوٹ میں تھا' اس لیے دھوپ کا رخ ترچھا تھا۔ وہ صرف کھڑکی کے ساتھ رکھے کاؤچ تک پہنچ پا رہی تھی جس پہ بیربل فرید چپ چاپ' گہری سوچ میں ڈوبا بیٹھا تھا۔
دیوار پہ لگے کاغذ' میزوں پہ بکھرے دستے' سب کچھ ایسے صفائی سے سمیٹا جا چکا تھا کہ جیسے کچھ پھیلایا ہی نہ ہو۔ ماہر بیڈ کی ٹیک سے کمر ٹکائے' ٹانگیں لمبی کیے نیم دراز تھا۔ سر پیچھے تکیے پہ تھا اور آنکھیں دائیں بائیں ٹہلتے چنگیز پہ جمی تھیں۔
"ناممکن۔ کوئی کسی پہ محبت کا جادو کیسے کر سکتا ہے؟" چنگیز جھنجھلا گیا تھا۔
"جیسے شمس نے میری ماں پہ کروایا تھا۔"
"ہو سکتا ہے تمہاری ماں کو شمس کی کوئی خوبی اچھی لگی ہو۔"
"شمس میں کوئی خوبی نہیں تھی۔" وہ سپاٹ نظروں سے چنگیز کو دیکھ رہا تھا۔ "سرکار اس جادو میں ماہر ہے۔ وہ کسی پہ بھی سحر عشق کروا سکتا ہے۔"
"سرکار کا کوئی ای میل ایڈریس نہیں مل سکتا؟ میرے تو سارے مسئلے حل ہو جائیں۔" سوچ میں ڈوبا بیربل کھنکھارا۔
لیکن کوئی اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔
"تمہیں کیسے معلوم سرکار اس جادو میں ماہر ہے؟" چنگیز اب مشکوک نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ماہر نے شانے اچکائے۔
"میں نے دو جمع دو چار کیا ہے۔ اس البم میں میری ماں کی تصویر بھی تھی' اور کشمالہ کی بھی۔ میں سمجھتا تھا کہ البم والی عورتوں کو سرکار نے مروا دیا ہے یا مرواتا ہے۔ اس لیے میں کشمالہ کی حفاظت کرنا چاہتا تھا۔ تاکہ اس کے ساتھ وہ نہ ہو جو میری ماں کے ساتھ ہوا تھا۔ لیکن میں غلط تھا۔" اس نے چچ کی آواز نکالی۔ گویا خود پہ افسوس کیا۔
"یعنی البم والی عورتوں پہ دراصل سرکار نے جادو کیا تھا؟"

''بالکل۔اس نے مختلف کلائنٹس کے لیے مختلف عورتوں پہ سحرِ عشق کیا تھا۔سرکار ایک ٹروفی کلیکٹر بھی ہے۔اپنے ہر شکار کا حساب رکھتا ہے۔''

''میں نہیں مانتا۔کوئی کسی کے دل میں اپنی محبت جادو کے ذریعے نہیں پیدا کرسکتا۔'' چنگیز نے ناک سے مکھی اڑائی۔

''درست۔'' اس نے سر تائید میں ہلایا تو وہ دونوں چونک کے اسے دیکھنے لگے۔

''کیا مطلب؟''

''سحرِ عشق کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔کیونکہ کوئی انسان جادو کے ذریعے کسی کے دل میں اپنی محبت پیدا نہیں کرسکتا۔'' وہ ٹیک لگائے' سنجیدگی سے ان سوالات کے جواب دے رہا تھا۔

''لیکن تم نے کہا سحرِ عشق اثر کرتا ہے۔'' سب سے زیادہ مایوسی بیربل فرید کو ہوئی تھی۔

''سحرِ عشق، عشق نہیں ہوتا۔سحر ہوتا ہے۔ایک الوژن۔محبت کا ایک سراب۔ایک مصنوعی احساس جو ساحر محبوب کے دل میں جگاتا ہے۔محبوب اس کو محبت سمجھتا ہے اور....'' اس نے تھوک نگلا۔''اور اپنے ساحر کو اپنی زندگی میں شامل کرلیتا ہے۔جیسے ہماری ماں نے کیا۔''

''ایک ہی بات ہے۔محبت ہو یا اس کا احساس۔''

''ایک بات نہیں ہے' بیربل۔محبت ہمیشہ کے لیے ہوتی ہے۔سحر الوژن ہے۔دور سے لگتا ہے سڑک پہ پانی پڑا ہے۔لیکن قریب آؤ تو پانی نہیں ہوتا۔صرف دھوپ کا الوژن ہوتا ہے۔''

''یعنی سحرِ عشق جلدی ٹوٹ جاتا ہے۔''

''میں نہیں مانتا۔'' چنگیز نفی میں سر ہلاتے ہوئے کرسی پہ بیٹھا۔''تم صرف زیاد سلطان سے جیلیس ہو۔اور ہسپتال کے اس بند کمرے کی قید نے تمہارے ذہن پہ برا اثر ڈالا ہے۔''

''ایسے مت کہو' چنگیز۔'' بیربل برا مان گیا۔''اس کے ذہن پہ اثر بہت پہلے سے ہے۔ہسپتال کے کمرے کا کیا قصور؟''

ماہر نے جواباً بس ایک نظر اسے دیکھا اور کندھے اچکا دیے۔

''واللہ ماہر فرید کبھی غلط نہیں ہوتا۔''

''تم یہ ثابت کرسکتے ہو؟'' چنگیز نے ٹانگ پہ ٹانگ جمائی اور سنجیدگی سے اسے دیکھا۔وہ کچھ کہنے لگا لیکن چنگیز نے ہاتھ اٹھا کے اسے روکا۔''اور یہ مت کہنا کہ وہ ہینڈسم نہیں ہے۔جب کسی لڑکی کو کسی آدمی سے محبت ہوجائے تو وہ اس کو ہینڈسم ہی لگتا ہے۔میں نے اس کی تصویر دیکھی ہے۔وہ بدصورت نہیں ہے۔''

''میں نے کب کہا بدصورت ہے۔صرف ہینڈسم نہیں ہے۔وہ خود کو بدصورت سمجھتا ہے اسی لیے اس نے جادو کا سہارا لیا ہے۔''

''کیا تم یہ ثابت کرسکتے ہو؟'' اس نے چبا چبا کے اپنی بات دہرائی۔''کیونکہ اگر وہ واقعی جادو کروا رہا ہے' تو تمہیں اس لڑکی کو بچانا ہوگا۔کیا کہہ کے بچاؤ گے؟ کہ واللہ ماہر فرید کبھی غلط نہیں ہوتا؟''

''میں ثابت کرسکتا ہوں۔'' اس کا انداز اٹل تھا۔

''کیسے؟''

''نمبرز سے۔سارے کھیل نمبرز کے ہیں۔'' وہ پہلی دفعہ ہلکا سا مسکرایا۔اس کے گال پہ لگے کٹ کا نشان ویسا ہی تھا البتہ چہرے کے نیل قدرے مندمل ہوئے دکھائی دیتے تھے۔

''یعنی؟''

''میں اتنا جانتا ہوں کہ سرکار ایک ہائی پروفائل جادوگر ہے۔اس کے کلائنٹس پوری دنیا میں پھیلے ہیں۔اور وہ بااثر لوگ ہیں۔کچھ بھی کرسکتے ہیں۔'' اس نے ابرو سے پلستر میں لپٹی ٹانگ کی طرف اشارہ کیا۔''کیونکہ وہ امیر لوگ ہیں۔اس کا مطلب ہے کہ سرکار اپنے کام کی بھاری فیس لیتا ہے۔زیاد نے بھی دی ہوگی۔ہے نا؟''

''زیاد کی بینک اسٹیٹمنٹ۔'' چنگیز نے

pklibrary.com

چونکا۔ ''یقیناً کوئی منی ٹریل ہوگا۔''
''جادوگروں کو عموماً ماہانہ پہ منٹ کی جاتی ہے۔ زیاد کے اکاؤنٹ سے ہر مہینے ایک خاص رقم کی ٹرانزیکشن کی جاتی رہی ہوگی۔ مجھے صرف اس اکاؤنٹ کو ڈھونڈنا ہے جہاں وہ رقم جاتی ہوگی۔''
''کیا معلوم وہ کیش دیتا ہو؟''
''ہاں ہوسکتا ہے۔ لیکن تب بھی ہر ماہ اکاؤنٹ سے رقم نکلوانے کا اندراج ہوگا۔ یوں میری بات ثابت ہوجائے گی۔''
''اس کے بینک اکاؤنٹس دبئی اور پاکستان دونوں ملکوں میں ہوں گے۔ اسٹیٹمنٹ کیسے نکلواؤ گے؟'' چنگیز اب اس کی بات پہ سوچنے لگ گیا تھا۔
''اس کی فکر مت کرو۔'' بیربل ہنسا۔ ''ہمارے پاس ایک ایسا انسان ہے جو کسی کے بارے کچھ بھی معلوم کرکے دے سکتا ہے کیونکہ اس کے ہر اہم ملک کے ہر اہم عہدوں پہ دوست موجود ہوتے ہیں۔''
''کون؟'' چنگیز چونکا۔
''زارا۔'' وہ اب سر جھکائے زارا کو میسج لکھ رہا تھا۔
چنگیز بڑبڑا کے رہ گیا۔
''ویسے جنرل نالج کے لیے پوچھ رہا ہوں....'' بیربل سرسری سے انداز میں کھنکھارا۔ ''سرکار کی فیس کتنی ہوگی؟''
''بیربل۔'' اس کی آواز بلند ہوئی۔ بیربل نے فوراً سے ہاتھ اٹھا دیے۔
''مذاق کررہا تھا یار۔'' پھر کسی خیال سے چونکا۔ ''تم نے کہا سحرِ عشق کا انجام بہت بھیانک ہوتا ہے؟ مگر کیسے۔''
ماہر فرید نے ایک گہری سانس کھینچی۔ اور پھر وہ کہنا شروع ہوا۔

☆☆☆

کیف کی وِلا نما عمارت کے اندر لہلہاتے سرسبز پودے خاموشی سے ورکرز کو کام کرتے دیکھ رہے تھے۔ شبنم اپنے ڈیسک کے ساتھ کھڑی کاغذات کے ایک پلندے پہ سر جھکائے ہوئے تھی جب قریب آتے قدموں کی آہٹ پہ چونکی۔ سر اٹھا کے دیکھا تو اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔
عبدالمالک فرید لفٹ سے باہر آتے دکھائی دے رہے تھے۔ گرے سوٹ، سفید شرٹ، ڈائمنڈ ٹائی پن، اور سلور بالوں کو جیل سے جمائے ان کا چہرہ ہمیشہ کی طرح بے تاثر تھا۔ شبنم ایک دم سیدھی ہوئی۔ نگاہوں نے ان کا پیچھا کیا یہاں تک کہ وہ سیدھا زارا کے آفس کی طرف بڑھ گئے۔
شبنم اب کے قدرے تجسس سے اس سمت میں دیکھنے لگی۔ مالک بے ''کیف'' کو اس قابل سمجھیں کہ خود وہاں تشریف لائیں، یہ ہر روز نہیں ہوتا تھا۔ کچھ تو تھا۔
انہوں نے شیشے کا دروازہ دستک کے ساتھ کھولا تو اپنی کرسی پہ بیٹھی زارا جھنجھلائی ہوئی ساتھ کھڑے ملازم سے کہہ رہی تھی۔
''ایک ڈھنگ کا قہوہ نہیں بنا سکتے تم لوگ؟ لے جاؤ اس کو۔'' انگلیوں سے ننھی سی پیالی پرے دھکیلی۔ ملازم معذرت کرتا ہوا جلدی سے کپ اٹھانے لگا۔ قہوے کے چند قطرے چھلک گئے۔ زارا نے ان کو آتے دیکھا تو خاموش ہوئی۔ لگتا تھا جیسے کافی دیر سے اس کی کلاس لی جارہی ہو۔
وہ بغور اس کی پیشانی کے بل دیکھتے ہوئے سامنے آئے اور کرسی کھینچی۔
''اپنی (شدید انا) shallow ego کی وجہ سے اس کو نوکری سے نکالو گی کیا؟'' ساتھ ہی ملازم کو ابرو سے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ جلدی جلدی ٹرے سمیٹتا باہر کو لپکا۔
''آپ کیسے آئے، بابا؟''
اس کے کھلے بال دونوں کندھوں پہ کرلز میں سیٹ تھے۔ بنا آستین کے سفید بلاؤز پہنے، جس کے گریبان پہ سنہری زنجیر جھول رہی تھی، ایکرلک ناخنوں کو سبز نیل پالش سے رنگے، وہ گھنی مصنوعی پلکیں جھکائے باپ کو دیکھنے کے بجائے کاغذات

pklibrary.com

الٹ پلٹ رہی تھی۔ ماتھے کے بل ہنوز قائم تھے۔
"کیونکہ فون پہ لگا تم اپ سیٹ ہو۔" ان کی آنکھیں کسی بھی تاثر سے عاری تھیں۔ جیسے برف کی ایک جھیل ہو۔
زارا نے آنکھیں اٹھا کے انہیں شکایتی نظروں سے دیکھا۔
"ماہر سے ملے آپ؟ اس کے دوستوں نے میرا داخلہ بند کر رکھا ہے۔ عجیب لوگ۔" ناپسندیدگی سے جھرجھری لی۔
"کیوں رہ رہی ہو ان عجیب لوگوں میں؟ واپس آجاؤ۔" وہ بغور اس کو دیکھ رہے تھے۔ ہمیشہ کی طرح اس دفعہ اس نے ٹھنڈے انداز میں ہنس کے ان کی بات ہوا میں نہیں اڑائی۔
اس نے فائل بند کی اور پیچھے کو ٹیک لگائی۔ چہرہ ناراض ناراض سا تھا۔
"میں یہاں خوش ہوں۔"
"اس کی زندگی میں تم کہیں نہیں ہو زارا۔" پہلی دفعہ ان کی آواز میں دکھ سا ابھرا۔ جیسے برف کی جھیل میں شگاف ظاہر ہوا ہو اور ایک پتا اوپر تیرنے لگے۔
"میں اس کی بیسٹ فرینڈ ہوں۔"
"تم اس کی زندگی میں کہیں نہیں ہو۔" وہ آگے کو جھکے اور بات دہرائی۔
زارا کی آنکھوں میں گلابی سی نمی ابھری۔
"آپ غلط ہیں۔ وہ آخر میں میرے پاس ہی آئے گا۔"
"تم اپنی زندگی ضائع کر رہی ہو۔ میرے ساتھ واپس چلو۔"
"تاکہ اپنی بہنوں کی طرح شادی اور بچوں میں زندگی ضائع کروں؟ کیوں بابا؟ آپ کو تو اپنے جیسی بیٹی چاہیے تھی۔"
"تمہیں اب تک معلوم نہیں ہوا کہ مجھے کیسی بیٹی چاہیے تھی۔" وہ دھیرے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ برف واپس جم گئی۔ پتا کہیں نیچے منجمد ہو گیا۔
وہ ابھی دروازے تک پہنچے تھے جب زارا نے لب کھولے۔
"اس نے مجھے ایک آدمی کی بینک اسٹیٹ منٹ نکلوانے کے لیے کہا ہے۔ زیاد سلطان۔"
وہ ہینڈل پہ ہاتھ رکھے رکھے مڑے۔
"کیا پوچھنا چاہتی ہو؟"
"کیا ماہر یہ سب کسی لڑکی کی وجہ سے کر رہا ہے؟" وہ بنا پلک جھپکائے باپ کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ وہاں صرف برف تھی۔
"ہاں۔ اور اس لڑکی کا نام ہلال ہے۔" ذرا سے شانے اچکائے۔
"وہ ہلال کے لیے یہ سب نہیں کر رہا۔" وہ ایک دم درشتی سے بولی۔ گلا رندھ گیا۔ "کوئی لڑکی بھی ہے جس سے وہ لاہور میں ملا تھا۔ اور آپ جانتے ہیں اسے۔"
وہ خاموشی سے اسے دیکھے گئے۔ ہاتھ ابھی تک ہینڈل پہ تھا۔
"سوال یہ ہے کہ آپ اس لڑکی کو پروٹیکٹ کیوں کر رہے ہیں؟" اس کی گیلی آواز بلند ہوئی۔
"ڈی جی صاحب کی بیٹی کی سالگرہ ہے۔ ضرور جانا ورنہ وہ برا مانے گا۔" ایک ایک لفظ چبا چبا کے کہا اور دروازہ کھول کے باہر نکل گئے۔ شبنم جو تجسس سے اس طرف دیکھ رہی تھی، جلدی سے فائل میں چہرہ چھپائے رخ موڑ گئی۔

☆☆☆

ہسپتال کے پرائیوٹ روم نمبر ۵۵۵ میں اس صبح خاموشی پھیلی تھی۔ نہ کسی مشین کی آواز تھی، نہ انسان کی۔ وہاں کوئی موجود نہ تھا سوائے بستر پہ ٹیک لگائے نیم دراز مریض کے۔ گال پہ زخم کا نشان ویسا ہی تھا۔ آنکھ تلے نیل بھی جامنی پڑ چکے تھے۔ وہ موبائل اسپیکر پہ رکھے، دوسری جانب جاتی گھنٹی سن رہا تھا۔ اسکرین پہ "ون ان ففٹی" جگمگا رہا تھا۔
وہ چند لمحے ان الفاظ کو دیکھے گیا۔ اسکرین

دھیرے دھیرے پگھلنے لگی۔ یہاں تک کہ وہ پگھلی چاندی کی طرح سارے پہ چھا گئی۔ اس منظرنامے سے دھوئیں کا ایک مرغولہ اٹھا۔ سفید آسمان میں سیاہ دھواں۔ اور وہ وہیں رقم ہو گیا۔

یہ منظر اس پینٹنگ میں پینٹ کیا گیا تھا جو برسوں پہلے اس روز رابیل کے اپارٹمنٹ کی دیوار پہ دکھائی دے رہی تھی۔

رابیل اس پینٹنگ تلے بچھی کرسی پہ بیٹھی تھیں۔ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے' کانوں میں ننھے ہیرے پہنے' ان کا چہرہ سپاٹ اور سرد تھا۔

"ماں پلیز... میں پھر سے آیا ہوں۔ آپ کی منت کرنے۔" وہ ان کے سامنے بیٹھا تھا۔ کلین شیو اور کم عمر چہرہ۔ ماتھے پہ بکھرے بال۔ آنکھوں تلے حلقے۔

"شمس سے شادی نہ کریں۔ وہ آپ کو ہرٹ کردے گا۔"

اس نے دونوں ہاتھوں سے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ لہجے میں لجاجت تھی۔ بے چین نگاہیں ان کی سرد آنکھوں پہ جمی تھیں۔

"تمہیں کیسے معلوم؟" لہجہ سرد تھا۔

"میں لوگوں کے بارے میں کبھی غلط نہیں ہوتا۔ شمس سب کچھ پلاننگ کے تحت کررہا ہے۔ وہ صرف آپ کی دولت کی وجہ سے آپ کے ساتھ ہے۔"

"یعنی تمہیں اپنی ماں اتنی ارزاں لگتی ہے کہ کوئی اس کا ساتھ اس کے اپنے لیے نہیں چاہ سکتا؟"

"جو چاہتا تھا' اسے آپ نے چھوڑ دیا۔" اس کی آواز بلند ہوئی۔

"اور وہی تمہیں یہ سب سکھا کے یہاں بھیجتا ہے۔ ہے نا؟" انہوں نے بے رخی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ وہ انہیں دیکھ کے رہ گیا۔

"میرے بیمار باپ کے پاس سکھانے کے لیے وقت نہیں ہے۔"

"تم مجھے شمس کے خلاف کیوں کررہے ہو؟ تم اس کو جانتے تک نہیں ہو۔"

"ہر کوئی ماہر فرید کی بات کا اعتبار کرتا ہے۔ آپ کیوں نہیں کرتیں؟"

دیوار پہ لگی پینٹنگ کا رنگ سنہری پڑنے لگا۔ یہاں تک کہ وہ سونے کی طرح پگھلنے لگی۔

اس پگھلے سونے میں ایک دھوپ سے بھری صبح ابھرنے لگی۔

وہ دونوں دہلی گیٹ کے سامنے کھڑے تھے۔ وہ ماتھے پہ ہاتھ کا چھجا بنائے اس کو دیکھ رہی تھی۔

"کیا آپ مجھ پہ بھروسا کرتی ہیں؟"

"ہاں۔"

"وہ آپ کو ہرٹ کرے گا۔"

"تم مجھے زیاد کے خلاف کیوں کررہے ہو؟"

سبز آنکھوں میں شک تھا۔ "تم اس کو جانتے تک نہیں ہو۔"

دھوپ ٹھنڈی ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ وہ سفید ہو گئی۔

ماہر نے آنکھیں کھولیں۔ وہ روم نمبر ۵۵۵ میں لیٹا تھا۔ اور اسپیکر فون پہ ماہ بینہ بیبن ہیلو کہہ رہی تھی۔

"ماہر فرید کا کوئی اعتبار نہیں کرتا۔ لیکن ایک کوشش کرنا چاہتا تھا۔" اس کی آواز دھیمی تھی۔

"کیسی کوشش؟" وہ اس اچانک سی فون کال پہ حیران ہوئی تھی۔

"اگر میں تمہیں کہوں کہ میں جانتا ہوں کہ تمہاری ماں اور بہن پہ جادو کروانے والا سرکار کا کلائنٹ کون ہے..... تو؟"

"کبیرہ تائی ہیں۔ مجھے معلوم ہے۔"

ماہر فرید نے گہری سانس اندر کھینچی۔

"تم کئی برس سے انہی کو اپنا دشمن گردانتی آئی ہو۔ اگر میں کسی اور کا نام لوں تو مان لوگی؟"

"مجھے ثبوت چاہیے ہوگا۔" اس کا انداز قطعی تھا۔ ماہر کے لب "اوہ" میں سکڑے۔

"یعنی تمہیں میرا اعتبار نہیں ہے؟"

pklibrary.com

"ہمارے اوپر جادو کروانے والی' میری ماں کی سب سے بڑی دشمن کبیرہ تائی ہی ہیں۔ میں کیسے یقین کرلوں کہ کوئی اور یہ کرسکتا ہے۔ ناممکن۔"

"زیاد . . . زیاد سلطان۔" وہ ایک دم بولا۔ "اگر میں کہوں کہ وہ تمہاری فیملی کا سب سے بڑا دشمن ہے' تب؟"

چند لمحے کے لیے لائن خاموش ہوگئی۔

"پھر سے سگار پینے لگے ہیں؟"

"مذاق نہیں کررہا۔ سچ کہہ رہا ہوں۔ زیاد سلطان سرکار کا کلائنٹ ہے۔"

"ماہر صاحب... میری بات سنیں۔" اس کی آواز سے چھلکتا غصہ سات سمندر پار بھی اپنی حدت سے سارے کمرے کو دہکا گیا تھا۔ "آپ نے مالا کو دھوکہ دیا' میں نے اس بات کو جانے دیا۔ کیونکہ مجھے آپ کی نیت پہ کبھی شک نہیں ہوا تھا۔ آپ کی وجہ سے مالا اور میری لڑائی ہوئی۔ اس بات کو بھی میں نے جانے دیا۔ لیکن اب آپ زیادتی کررہے ہیں۔ آپ اس شخص پہ الزام لگا رہے ہیں جس سے میری بہن شادی کرنے جارہی ہے۔"

غصہ۔ دکھ۔ حیرت۔ اس کے لہجے میں کیا نہیں تھا۔

"میں غلط نہیں ہوں۔ زیاد تمہاری کہانی کا ولن ہے۔" وہاں صرف ہٹ دھرمی تھی۔

"آپ یہ سب مالا اور زیاد کی شادی روکنے کے لیے کررہے ہیں نا؟"

"مجھے اس سے فرق نہیں پڑتا کہ وہ اپنی زندگی میں کیا کرتی ہے۔ لیکن اگر وہ اس شخص سے شادی کرتی ہے جو میرے دشمن کا کلائنٹ ہے' تو میرا فرض ہے کہ میں اسے یہ غلطی کرنے سے روکوں۔"

"مالا اپنا خیال خود رکھ سکتی ہے۔ آپ کو میرے یا اس کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ایک منٹ فون مت رکھنا۔" وہ واقعی فون رکھنے والی تھی جب وہ تیزی سے بولا۔

"کیا زیاد تمہارے لیے کچھ لاتا ہے؟ کچھ میٹھا؟ ہر دفعہ ایک ہی چیز؟" وہ سوچ سوچ کے کہہ رہا تھا۔ "چاکلیٹس.... یقیناً چاکلیٹس...."

اب کے خاموش ہونے کی باری ماہی کی تھی۔

"آپ کو کیسے معلوم؟" اسے اچنبھا ہوا۔

"اسی لیے تم اس کا دفاع کررہی ہو کیونکہ وہ ان چاکلیٹس کے ذریعے تمہاری مخالفت کو پہلے ہی حمایت میں بدل چکا ہے۔ میں مزید کوشش نہیں کروں گا۔ لیکن اگر میں تمہارے پاس ثبوت لے کر آؤں تو مان جاؤ گی؟"

لائن خاموش ہوگئی۔ جیسے وہ خود بھی مخمصے میں پڑ گئی ہو۔

"جب ثبوت ہوگا' تب بات کریں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ تب تک اس کی لائی ہوئی چاکلیٹس مت کھانا۔ ان میں جادو ملا ہوتا ہے۔"

"اُف...." ماہی نے زور سے بٹن دبا کے کال کاٹی۔

"اس نے تمہارا یقین نہیں کیا؟" بیربل ابھی ابھی کمرے میں آیا تھا۔ فریج سے ایک کین نکالا اور اس کے سامنے بیٹھا۔

"مجھے معلوم تھا وہ یقین نہیں کرے گی۔ وہ اس کا ہونے والا بہنوئی ہے۔ وہ اس کے مقابلے میں میری کیوں سنے گی؟"

"پھر اسے یہ سب کیوں بتایا؟"

"تاکہ اس کے دل میں شک کا بیج ڈال سکوں۔ اور...." لاپرواہی سے شانے اچکائے۔ "وہ یہ نہ کہہ سکے کہ میں نے اسے وارن نہیں کیا تھا۔"

اس نے موبائل ایک طرف ڈال دیا۔ بیربل جو کین لبوں تک لے جارہا تھا' رک کے اسے دیکھنے لگا۔

"بس؟ تم مزید کچھ نہیں کروگے؟"

"نہیں۔ اب جو کرنا ہے انہوں نے خود کرنا ہے۔" اس نے سائیڈ ٹیبل پہ رکھی ایک کتاب اٹھالی اور بک مارک لگا صفحہ کھولا۔

pklibrary.com

"وہ لڑکی ایک ٹال' ڈارک اور ناٹ سو ہینڈسم ولن سے شادی کرنے جارہی ہے۔ تم اس کو بچاؤ گے نہیں؟"

"کوئی انسان کسی کو نہیں بچا سکتا۔ اسے اپنے آپ کو بچانا ہے اور مجھے اپنی بہن کو ڈھونڈنا ہے۔ مالک درست کہتا تھا۔ میرے جذبات درمیان میں نہیں آنے چاہیے تھے۔ ویسے بھی سحرِ عشق کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔" وہ کتاب کھول کے چہرے کے سامنے کر چکا تھا۔ بیربل ٹھہر کے اسے دیکھنے لگا۔

"کیا مطلب؟ تم نے خود کہا تھا کہ جادوگر کسی پر بھی سحرِ عشق کروا سکتے ہیں۔"

"ہاں۔ یہ نہیں کہا تھا کہ وہ کامیاب ہوتا ہے۔ بلکہ....." اس نے پڑھتے ہوئے صفحہ پلٹایا۔ "سحرِ عشق کا انجام وہ نہیں ہوتا جو تم سوچ رہے ہو۔"

اس کے لب ہل رہے تھے اور نیل زدہ آنکھیں صفحے پہ جمی تھیں۔

☆☆☆

دو ماہ بعد۔

وہ ایک سرد اور تاریک کمرہ تھا۔ اس میں کوئی فرنیچر نہ تھا سوائے ایک پلنگ کے۔ مالا اس پلنگ پہ بیٹھی تھی۔ گھٹنے سینے سے لگائے' خوف سے چوکھٹ کو دیکھتی ہوئی۔

چوکھٹ پہ دروازے کی جگہ ایک پردہ لگا تھا۔ پردہ دھیرے دھیرے ہوا سے لہرا رہا تھا۔

اس کی خوف زدہ آنکھیں پردے پہ جمی تھیں۔

دفعتاً پردے کے پیچھے سے ایک ہاتھ نکلا۔ ننھا سا بوڑھا ہاتھ۔ اس نے پردہ مٹھی میں دبایا۔ وہ اس کے سیاہ لمبے ناخن دیکھ سکتی تھی۔ اس نے گھٹنے مزید سینے سے لگائے۔ خود کو اپنے ہی بازوؤں میں لپیٹا۔

ہاتھ اب پردہ سرکا رہا تھا۔ ایک ایک انچ۔ ایک ایک سانس۔

پھر اس نے سر نکال کے اندر جھانکا۔

یہ وہی بچہ تھا۔ وہی منحوس صورت بچہ جس کے کان لمبے' سر بڑا اور گول چہرہ تھا۔ بال غائب اور آنکھوں کی جگہ سیاہ گڑھے تھے۔

وہ اس کو دیکھ کے مسکرایا۔ کھوکھلی آنکھیں چمکنے لگیں۔

ایک چیخ کے ساتھ وہ جاگی۔

وہ اپنے بیڈروم میں تھی۔ بھاری کمبل اوپر ڈالے' نیم گرم کمرے میں' کسی دوسرے کی موجودگی کے بغیر۔

اس نے کمبل اوپر سے ہٹایا۔ اپنی گردن کو چھوا۔ سارا وجود پسینے میں تر تھا۔

اس کی انگلیاں کپکپا رہی تھیں۔ دل زور سے دھڑک رہا تھا۔

اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ سب کچھ نارمل تھا۔ سوائے اس کے۔

اس نے پیر نیچے اتارے اور آگے بڑھ کے بتی روشن کی۔ ایک دم سارے میں روشنیاں سی پھیل گئیں۔

کمرے کے ایک کونے میں شاپنگ بیگز کا ڈھیر لگا تھا۔ گو کہ وہ سلیقے سے رکھے تھے لیکن بہت جگہ لے رہے تھے۔ وہ ننگے پیر چلتی سنگھار میز تک آئی۔ اپنا عکس دیکھا۔ اس کا چہرہ بے داغ تھا۔ سپید اور خوبصورت۔ سبز آنکھیں البتہ خوف سے بھری تھیں۔

آئینے کے کونے میں چند اسٹکی نوٹس لگے تھے۔ ان پہ کرنے کے کام لکھے تھے۔

چند کاموں کو لائن لگا کے کاٹ دیا گیا تھا۔ باقی ویسے ہی تھے۔

نکاح کا جوڑا پک کرنا ہے۔

ویڈنگ رنگ خریدنی ہے۔

اس سے مزید کام نہیں پڑھے گئے۔ نظریں نیچے پھسل گئیں۔ میز پہ سامنے نکاح کا کارڈ رکھا تھا۔ سفید کارڈ پہ سنہری رنگ سے عبارتیں لکھی تھیں۔ کارڈ کے اوپری حصے پہ ایک بے بی پھول چسپاں تھا۔ ننھا سا پھول۔ اس نے انگلیاں پھول پہ

pklibrary.com

پھیریں۔ نیچے نکاح کی تاریخ نظر آرہی تھی۔

آج سے ٹھیک دس دن بعد زیاد اور اس کی شادی تھی۔ صرف نکاح کا فنکشن ہونا تھا۔ اور اسی شام رخصتی۔ گزشتہ دو ماہ سے شادی کی تیاریوں کے لیے بازاروں کے چکر لگاتے لگاتے اس کے ذہن نے وہ سب فراموش کر دیا تھا۔ وہ احساس کہ کوئی تعاقب کر رہا ہے۔ کوئی اس کو نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ وہ سب اسے بھول گیا تھا۔

وہ واقعات ہونے بھی ختم ہو گئے تھے۔ اب نہ کوئی خون کے چھینٹے تھے۔ نہ کھلتے بند ہوتے پانی کے نل۔ زندگی سکون میں تھی۔ اس نے بوڑھے جادوگر کا پیچھا چھوڑ دیا تھا۔ اور یقیناً اس نے بھی مالا کا پیچھا ترک کر دیا ہوگا۔

لیکن آج کچھ نیا ہوا تھا۔

کئی ماہ بعد وہ خواب پھر سے دکھائی دیا تھا۔

وہی منحوس بچہ۔ چیلنجنگ

لیکن وہ اس کے قریب نہیں آرہا تھا۔ جیسے فاصلے پہ گھات میں بیٹھا ہو۔ کسی شے کا منتظر۔

اپنے عکس کو دیکھتی اس کی نظریں گردن میں جھولتی چین پہ ٹھہر گئیں جن میں سیاہ فاختہ پروئی ہوئی تھی۔ اس نے دو انگلیوں سے فاختہ کو تھاما اور آنکھیں بند کر کے گہری سانس اندر کھینچی۔

پھر جب وہ سانس باہر خارج ہوئی تو اس کا خوف کم ہونے لگا تھا۔

صرف تین سانسیں کشمالہ مبین کو پرسکون کر سکتی تھیں۔

چند لمحوں بعد وہ بیڈ پہ بیٹھی فون کان سے لگائے زیاد کو اپنا خواب سنا رہی تھی۔ زیاد اسے ہمیشہ کہتا تھا کہ اگر اسے دوبارہ برے خواب آنے لگیں تو وہ اس سے شیئر ضرور کرے۔ شاید وہ دونوں مل کے اس کا کوئی مطلب نکال سکیں۔

"یقیناً کبیرہ آنٹی پھر سے شروع ہو گئی ہیں۔" زیاد نے سنتے ہی تبصرہ کیا۔ "ہمارے خاندان میں جادو کے لیے وہی مشہور ہیں۔ وہ اپنی بیٹی کی شادی مجھ سے کروانا چاہتی تھیں۔ ایسا نہیں ہو سکا۔ اس لیے اب وہ میرا اور آپ کا رشتہ ختم کروانے کے لیے پورا زور لگائیں گی۔ نکاح میں دس دن رہ گئے ہیں۔ ایک دفعہ نکاح ہو جائے تو ان کے جادو نہیں چل سکیں گے۔"

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ زیاد درست کہہ رہا تھا۔ یہ سب کبیرہ تائی کر رہی تھیں۔ اور اگلے دس روز تک کرتی رہیں گی۔ اسے تیار رہنا تھا۔

اس نے ایک نظر کمرے میں رکھے شاپنگ بیگز کو دیکھا۔ سب کچھ پرفیکٹ تھا۔ سوائے... چہرہ موڑ کے بیڈ کی دوسری سائیڈ کو دیکھا جو خالی تھی... سوائے اس ایک کمی کے جو اب ابد تک پوری نہیں ہوگی۔ ماں نہیں تھیں۔ لیکن نگینہ آنٹی تو تھیں نا۔ وہ بھی ماں کی طرح بیمار تھیں۔ وہ ان کی خدمت کر کے ان میں اپنی ماں ڈھونڈ سکتی تھی۔ وہ اداسی سے مسکرا دی۔

☆☆☆

لاہور کے آسمان پر پھیلی گدلی اسموگ نے مبین منزل کی کھڑکیوں کو دھندلا دیا تھا۔

آنسوؤں سے بجی اسٹوڈیو کی کھڑکی کے اندر شام کی مناسبت سے سفید بتیاں جلی تھیں اور چند نفوس اندر کام کرتے دکھائی دیتے تھے۔ ایک چوکی پہ مالا بیٹھی ایک بڑے سے چوکور فریم پہ سر جھکائے ہوئے تھی جس کے اوپر ایک ریشمی کپڑا کھینچ کے لگایا گیا تھا۔ اس پہ جگہ جگہ سفید آؤٹ لائن سے کچھ پھول بنائے گئے تھے۔ وہ چھوٹا برش انگلیوں میں تھامے احتیاط سے پھولوں میں رنگ بھر رہی تھی۔

فریم کے اس پار وہی پٹھان بچہ بیٹھا تھا۔ چہرہ ہتھیلیوں میں گرائے وہ ناخوشی سے ریشم پہ ابھرتے پھولوں کو دیکھ رہا تھا۔ ہر پھول کے آدھے حصے میں سفید رنگ بھرا تھا اور باقی آدھا خالی تھا۔

"یہ اچھے نہیں لگ رہے مالا باجی۔ کوئی مسئلہ ہے۔"

مالا نے نظریں اٹھا کے اسے دیکھا اور

pklibrary.com

مسکرائی۔ ماتھے پہ سبز ریشمی رومال باندھے وہ بالوں کو جوڑے میں لپیٹے ہوئے تھی۔ حسب معمول ایک گال پہ پینٹ کا دھبہ تھا اور انگلیاں بھی رنگین ہو رہی تھیں۔

"رنگ سارے مسئلے حل کر سکتے ہیں' طوطی۔"

اس نے دوسرا برش اٹھایا اور سرخ پینٹ میں ڈبو کے پھول کے خالی حصے کو بھرنا شروع کیا۔

اس بچے کا اصل نام نہ جانے کیا تھا لیکن وہ خود کو طوطی خان کہتا تھا۔ اور اس وقت اس کی آنکھیں تحیر سے طوطے کی طرح پھیل گئیں۔

"واہ۔" سبز ساڑھی کے کپڑے پہ سرخ اور سفید پھول بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔

(سرخ رنگ یاد رہ جانے والا رنگ ہے۔) وہ برش کو پھر سے سرخ رنگ سے رگڑ رہی تھی جب دور کہیں یادوں میں سے ایک آواز ابھری۔ اس کے ہاتھ سست ہوئے۔ لیکن اس نے سر جھٹک دیا۔ اسے اب سر جھٹکنے کی عادت ہو چکی تھی۔

نئی ای میل کی ٹون نے اسے متوجہ کیا تو اس نے برش رکھا اور فون اٹھاتے ہوئے گال پہ آئی لٹ کان کے پیچھے اڑسی۔ سرخ دھبہ کان کے قریب لگ گیا لیکن اسے پرواہ نہیں تھی۔ اس کی آنکھیں ای میل پڑھتے ہوئے بے یقینی اور خوشی سے چمکنے لگی تھیں۔

"مالا.. تمہیں خالہ بلا رہی ہیں۔ کوئی بات کرنی ہے۔" ماہی نے چوکھٹ میں آکے دروازہ بجایا تو اس نے خوشی سے تمتماتا چہرہ اٹھا کے اسے دیکھا۔

"مجھے دبئی میں جاب مل گئی ہے۔" اس کے گال گلابی ہو رہے تھے۔ "ایک دوست کے کزن کا ریسٹوران رینوویٹ ہو رہا ہے۔ میں ایک ماہ بعد جوائن کر سکتی ہوں۔"

"مبارک ہو۔" ماہی سوچ سوچ کے کہنے لگی۔ "لیکن اتنی جلدی؟ ابھی شادی بھی نہیں ہوئی اور جاب؟"

بچہ باری باری دونوں کے چہرے دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

"میں شادی اسی لیے کر رہی ہوں تا کہ ایک نئے شہر میں نئی زندگی شروع کر سکوں۔ اور جاب اس زندگی میں میرے لیے بہت ضروری ہے۔ خالہ سے کہو میں آرہی ہوں۔" وہ مطمئن تھی۔

نیچے آئی تو ثمر جہاں خالہ لاؤنج میں ہی بیٹھی تھیں۔ وہ حورِ جہاں جیسی ہی دکھتی تھیں۔ سبز آنکھیں۔ سرخ وسفید رنگت۔ البتہ جسم متوازن تھا۔ موٹاپہ نہیں چڑھا تھا۔ امریکہ میں رہ کے خود کو فٹ اور جوان رکھے ہوئے تھیں۔ باب کٹ بال ہیئر بینڈ سے پیچھے کر رکھے تھے۔

وہ بڑے صوفے کے ایک کنارے پہ بیٹھی تھیں۔ مالا آکے دوسرے کنارے پہ بیٹھی اور نرمی سے پوچھنے لگی۔

"آپ نے بلایا تھا خالہ؟" ثمر جہاں نے ایک نظر اسے دیکھا۔ وہ سیاہ ٹراؤزر اور لمبی قمیض پہ ڈھیلا ڈھالا کارڈیگن پہنے' جوڑا بنائے' ماتھے پہ سبز رومال لپیٹے بیٹھی سادگی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ ثمر جہاں دو روز پہلے امریکہ سے آئی تھیں اور جیٹ لیگ کی وجہ سے زیادہ وقت آرام کرتی رہی تھیں۔ کھل کے بات کرنے کا موقع آج ملا تھا۔

"مالا تم اس رشتے سے خوش ہو؟" انہوں نے الفاظ جوڑے۔ ماہی بھی خاموشی سے سامنے والے صوفے پہ آکے بیٹھ گئی۔

"ظاہر ہے میں خوش ہوں۔ کیوں؟" اس نے چونک کے انہیں دیکھا۔ پھر ماہی کو۔

"مالا... بیٹے... میرا نہیں خیال زیادہ تمہارے لیے ایک اچھی چوائس ہے....." وہ اس کی طرف پہلو موڑ کے بیٹھیں۔ چہرے پہ تفکر تھا۔ "ان کی فیملی ہم سے بہت مختلف ہے۔ اور یہ نگینہ....." ان کے لہجے میں ناپسندیدگی ابھر آئی۔ "وہ مجھے کبھی بھی پسند نہیں رہی۔"

ماہی نے گردن بالکل جھکا دی۔ وہ اس وقت مالا سے کوئی نئی لڑائی افورڈ نہیں کر سکتی تھی۔

"نگینہ آنٹی بہت اچھی اور نیک خاتون

ہیں۔" اس کو بہت برا لگا۔ ہر لڑکی کی طرح اپنے ہونے والے سسرال کی برائی اسے اپنی برائی لگی تھی۔

"اللہ معاف کرے لیکن لوگ جیسے نظر آتے ہیں ویسے ہوتے نہیں ہیں۔" خالہ نے ناک سے مکھی اڑائی۔

"نگینہ آنٹی آپ کو کیوں نہیں پسند؟" وہ بغور خالہ کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔

"کیونکہ وہ بہت چالاک عورت ہے۔ ہم ایک زمانے سے اس کو جانتے ہیں۔ وہ تمہاری ماں کو بھی پسند نہیں تھی۔"

"نہیں تو۔ وہ اتنے مہینے سے ہمارے گھر آ جا رہی ہیں۔ ماں نے ہمیشہ ان کو ویلکم کیا ہے۔" اس کا لہجہ دفاعی تھا۔

"نہیں ماما۔ خالہ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ماں کو پہلے نگینہ آنٹی پسند نہیں تھیں۔ یہ تبدیلی عزہ کی شادی سے آئی ہے۔" ماہی کھنکھاری۔

عزہ اس کی وہ کزن تھی جس کی شادی اٹینڈ کرنے وہ کیف کے ساتھ اسلام آباد سے لاہور آئی تھی اور پھر لاہور سے نکل نہیں سکی۔ اسی شادی پہ وہ براہ راست پہلی دفعہ زیاد اور نگینہ آنٹی سے ملی تھی۔ اس سے پہلے ماموں کے ٹیرس سے اس نے براؤنی کھاتے ہوئے ان کو صرف دیکھا تھا۔

ادھر ماہی کہہ رہی تھی۔

"عزہ کی شادی پہ نگینہ آنٹی ایک لمبے عرصے بعد ماں سے ملی تھیں اور انہوں نے سب کے سامنے کبیرہ تائی سے ملنے سے انکار کر دیا۔ اس وجہ سے ماں کا دل ان کی طرف سے نرم ہوا۔ اور پھر ماں برین ٹیومر کی مریضہ تھیں۔ ان کا دماغ ٹھیک سے فیصلے نہیں کر پا رہا تھا۔ ورنہ انہوں نے ڈھکے چھپے الفاظ میں مجھے ہمیشہ یہی بتایا تھا کہ انہیں نگینہ آنٹی نہیں پسند۔"

"مجھے ایسا کچھ یاد نہیں۔" اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ گفتگو مشکل ہوتی جا رہی تھی۔

"کیونکہ تمہاری ماں کی غیبت کی عادت نہیں تھی۔ اس کو کوئی پسند نہ ہوتا تو اس سے دور ہو جاتی تھی۔ خاموشی سے۔ تمہاری طرح۔" خالہ نے بغور اسے دیکھا۔ اس کے اعصاب تن گئے تھے۔ اسے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

"ویسے نگینہ آنٹی ہیں تو اچھی۔" ماہی سوچ کے بولی۔ "ہماری ماؤں کو بہت سے لوگوں سے مسئلے ہوتے ہیں۔ ضروری نہیں ہے کہ وہ لوگ برے ہوں۔ نگینہ آنٹی نے حور کو اتنا پیار کیا تھا' پھر اسے گھٹی بھی دی۔"

"ہم نگینہ آنٹی کو کیوں ڈسکس کر رہے ہیں؟ میری شادی زیاد سے ہو رہی ہے۔" اس نے زور دے کر یاد دلایا۔

"زیاد ایک بہت عام سا انسان ہے' بیٹا۔ اس میں کوئی ایسے ہیرے نہیں جڑے کہ تم اس کے بارے میں سوچو بھی۔ اوپر سے اس کے ماں باپ کا عجیب ٹاکسک سا رشتہ ہے۔ شادی سے پہلے ہمیشہ دیکھتے ہیں کہ مرد کن حالات میں بڑا ہوا ہے۔ ٹاکسک حالات میں بڑے ہونے والے مرد ٹاکسک ہوتے ہیں۔ عباد کو دیکھو۔ اگر آج وہ ماہی کے ساتھ اچھا ہے تو اس لیے کہ اس کے گھر کا ماحول صحت مند تھا۔"

"ہر انسان کے اندر بچپن کا ٹراما ہوتا ہے' خالہ۔ ہم بھی تو بغیر باپ کے بڑے ہوئے ہیں۔ کیا ہم ٹاکسک ہیں؟ شادی کے بعد دو لوگ ایک دوسرے کی محرومیوں کو پورا کرتے ہیں۔ اس کے ماں باپ کی سزا اس کو کیوں دیں؟" وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

"بیٹے تمہیں زیاد سے اچھا رشتہ مل سکتا ہے۔"

"اچھا ... کون؟" وہ چونکی۔ پہلی دفعہ اسے خالہ کی بات سمجھ میں آنے لگی۔

انہوں نے گہری سانس لی۔ چند لمحے کا وقفہ کیا۔ اب کے ماہی بھی چونکی۔ کچھ تھا جو وہ نہیں جانتی تھی۔

"میرے جیٹھ کا بیٹا ہے۔ فائق۔ عباد کا فرسٹ کزن۔ امریکہ میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ہے۔ اس کی ماں نے مجھے تمہارے لیے کہا ہے۔ وہ بہت

pklibrary.com

اچھا' بہت قابل لڑکا ہے۔"
"فائق کی تو پچھلے سال ڈائیورس ہوئی ہے خالہ۔" ماہی بے یقینی سے بولی۔
"ڈائیورس کا کیا ہے۔ ہوتی رہتی ہیں۔ مرد پہ کوئی دھبہ تھوڑی لگ جاتا ہے۔" خالہ نے اسے گھورا۔
وہ اپنی جگہ بالکل شل ہوگئی۔ خالہ اس کو زیاد کے مقابلے میں ایک طلاق شدہ آدمی کا رشتہ قبول کرنے کے لیے کہہ رہی تھیں؟ وہ بھی اس کی شادی سے دس دن پہلے؟
"طلاق کو لوگوں نے taboo (ممنوع) بنا لیا ہے۔ ایسی بری چیز نہیں ہوتی طلاق۔ ٹاکسک رشتے میں رہنے سے بہتر ہے بندہ طلاق لے کر الگ ہوجائے۔ اور فائق کی بیوی ہی کوئی سائیکو تھی۔ شکر ہے اس نے جان چھڑالی۔ وہ ہر لحاظ سے زیاد سے بہتر ہے۔ تم اس سے بات کر کے تو دیکھو۔" خالہ اسے پھر سے سمجھانے لگیں۔
اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے۔ بہت کچھ اندر ایک دم سے ابلنے لگا تھا۔ لیکن پھر... اس نے کچھ نہیں کہا۔ بس ایک گہری سانس ناک سے اندر کھینچی اور لبوں سے خارج کردی۔ سینے میں ابلتا لاوا ٹھنڈا ہوگیا۔
"میں جانتی ہوں کہ آپ میری بھلائی چاہتی ہیں' خالہ۔" اس نے نرمی سے ان کے ہاتھ تھامے۔ "آپ سے پہلے مجھے کئی کزنز نے بھی یہی کہا ہے۔ کہ زیاد اور میرا جوڑ نہیں ہے۔ لیکن میرے نزدیک وہ ایک اچھا انسان ہے۔ پھر شادی ایسا جوا ہے جسے میں اپنی مرضی سے کھیلنا چاہتی ہوں۔ اگر زیاد ایک غلطی ہے تو یہ میری غلطی ہونی چاہیے۔ کسی انسان کی گارنٹی نہیں ہوتی۔ کوئی شادی کے بعد کچھ بھی نکل سکتا ہے۔"
"زندگی اتنی قیمتی ہے کہ اس میں تجربے نہیں کرنے چاہئیں' مالا۔" خالہ نے افسوس سے اسے دیکھا۔
"میں نہیں سمجھتی کہ میں غلطی کر رہی ہوں۔ لیکن اگر آپ کو لگتا ہے کہ یہ ایک غلطی ہے تو کم از کم یہ میری غلطی ہوگی۔" اس نے اسی نرمی سے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ سے علیحدہ کرلیا۔ اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ خالہ یاسیت سے اسے دیکھے گئیں۔
"ماں نگینہ آنٹی کو کیوں پسند نہیں کرتی تھیں؟" مالا کے جانے کے بعد ماہی سوچ میں گم بولی۔
"کیونکہ تمہاری ماں اللہ کا بہت ذکر کرتی تھی۔ اور جو بہت ذکر کرنے والے لوگ ہوتے ہیں نا' انہیں اشارے مل جاتے ہیں۔ انگریزی میں جسے تم وائبز کہتی ہو۔" پھر کچھ یاد آنے پہ خفگی سے ماہی کو گھورا۔
"اور تم نے بھی پکڑ کے اسی عورت سے بیٹی کو گھٹی دلوادی۔"
"وہ... انہوں نے خود کہا تھا۔" وہ گڑبڑا کے کھڑی ہوئی۔
حور کا فیڈر لینے وہ کچن تک آئی تو دیکھا' کاؤنٹر پہ زیاد کی لائی چاکلیٹس کا ایک باکس ادھ کھلا رکھا تھا۔ ذہن میں ماہر کا کہا فقرہ گونجا لیکن اس نے سر جھٹکا اور ایک چاکلیٹ نکال کے ریپر اتارنے لگی۔
"خوامخواہ جیلس ہے وہ۔ ہونہہ۔" ریپر ڈسٹ بن میں اچھالا اور چاکلیٹ منہ میں رکھتی وہ آگے بڑھ گئی۔

☆☆☆

"کیف" کی بالائی منزل پہ بنے آفس کیبن اس صبح خالی تھے کیونکہ سارا عملہ لفٹ کے سامنے ہجوم کی صورت کھڑا تھا۔ اشتیاق بھری نظریں دھاتی دروازوں پہ جمی تھیں۔ اسی لمحے لفٹ کی گھنٹی بجی۔ دروازے الگ ہوئے اور ماہر فرید نظر آیا۔
سیاہ سوٹ کے اندر سفید شرٹ پہنے' گیلے بال پیچھے کو جمائے' وہ ویسا ہی تھا۔ سوائے رخسار پہ لگے زخم کے نشان کے۔ یا پھر کہنی کے ساتھ لگی بیساکھیوں کے۔
"خوش آمدید ماہر بے۔" پرجوش استقبال۔

pklibrary.com

آفس واپسی کی مبارک۔ صحت یابی کی دعائیں۔ ایک ساتھ بہت کچھ اس کی طرف آیا۔ ماہر نے بدقت مسکرا کے سر کو خم دیا۔ پھر نگاہ میں کچھ اٹکا۔ مین ہال کی دیوار کے ساتھ پھولوں کی سجاوٹ کی گئی تھی۔ ساتھ ہی کچھ سوئیٹس رکھی تھیں۔

''یہ سب کس نے کیا ہے؟'' اس نے شبنم کی طرف دیکھا جو سب سے آگے تھی۔ مسکرا کے سینے پہ ہاتھ رکھا۔

''میں نے۔''

''گڈ۔ یہ فضول خرچی تمہاری تنخواہ سے کٹے گی۔'' ایک برہم نظر اس پہ ڈال کے وہ بیساکھی کے سہارے آگے بڑھا۔

''اور آپ سب اپنی نشستوں پہ جائیں۔ آپ کو کمپنی اس وقت کے لیے پے کرتی ہے۔''

وہ سب مسکراہٹیں دبائے ادھر ادھر بکھر گئے۔ درمیان میں راستہ چھوڑ دیا۔ وہ آگے بڑھا اور شبنم مسکرا کے اسے آفس تک جاتے دیکھتی رہی۔ جب وہ اندر چلا گیا تو وہ اسٹاف کی طرف پلٹی اور ہتھیلی پھیلائی۔

''میں شرط جیت گئی۔ ماہر بے کوا یکسیڈنٹ بھی مشین سے انسان نہیں بنا سکا۔ میرے پیسے!'' مسکرا کے آنکھیں گھمائیں۔ اور بہت سے ہاتھ بے اختیار جیبوں کی طرف بڑھ گئے۔

وہ آفس میں داخل ہوا تو زارا پہلے سے اندر موجود تھی۔ وزیٹرز چیئر پہ بیٹھی وہ اسی کی منتظر تھی۔

''کیا تمہیں اتنی جلدی آفس جوائن کرنا چاہیے تھا؟'' وہ خفگی سے کہتی کھڑی ہوئی۔ ماہر نے جواب نہیں دیا۔ وہ بیساکھی سے لنگڑا کے چلتا کنسول ٹیبل تک آیا جو کہ کھڑکی کے قریب تھی۔ کھڑکی میں رکھا کیکٹس کا پودا سوکھ سڑ چکا تھا۔ ماہر نے اسے نہیں دیکھا۔ وہ سر جھائے دراز کھول رہا تھا۔ بیساکھی پہ گرفت ڈھیلی ہوئی تو وہ پھسل کے نیچے جا گری۔

''مجھے میرا جواب مل گیا ہے۔'' وہ قریب آئی اور جھک کے بیساکھی اٹھائی۔ پھر سیدھے ہوتے ہوئے ناراضی سے اسی دیکھا۔

''تم ورک فرام ہوم بھی کر سکتے تھے۔ میں تمہیں ہر چیز گھر پہ مہیا کر دیتی۔''

''اور ڈوپامین؟ اس کا کیا؟'' وہ مسکرا کے دراز سے لائٹر نکال رہا تھا۔ زارا اسے دیکھ کے رہ گئی۔

''جو ڈوپامین رش مجھے چاہیے' وہ گھر بیٹھے نہیں مل سکتا۔'' اس نے لائٹر جلایا اور قطار میں رکھی کینڈلز میں سے ایک کا ڈھکن اٹھایا۔ صندل وڈ۔

''(ڈوپامین انسانی دماغ میں پیدا ہونے والا ایک کیمیکل ہے جو انسان کو اچھا محسوس کرواتا ہے۔ اور اپنے پسندیدہ کاموں کے درمیان میں ریلیز ہوتا ہے۔)

لائٹر کے شعلے نے موم بتی کے دھاگے کو چھوا اور اس نے آگ پکڑ لی۔ پل بھر میں موم پگھلنے لگی۔

''تم ہمارے بارے میں سوچتے ہو کبھی؟''

وہ میز تک آ رہا تھا جب زارا دھیرے سے بولی۔ وہ چونکا۔ بیساکھیاں کوٹ اسٹینڈ کے ساتھ رکھیں (ایک پھر سے پھسل گئی) اور ناسمجھی سے اسے دیکھا۔

وہ ابھی تک دور کنسول ٹیبل کے ساتھ کھڑی تھی۔ بل دار بال دونوں شانوں پہ گر رہے تھے۔ براق سفید مڈی ڈریس میں ملبوس' گریبان پہ جھولتی سنہری زنجیریں' ناخنوں پر فیروزی نیل پالش اور سفید لانگ بوٹس پہنے' وہ بظاہر ہمیشہ جیسی ہی تھی لیکن کچھ تھا جو بدلا ہوا لگتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ملال تھا۔ یا شاید گلہ۔ وہ فیصلہ نہیں کر سکا۔

''کیا مطلب؟''

''کبھی تم ہمارے بارے میں سوچتے ہو' ماہر؟''

وہ قدم قدم چلتی آگے آ رہی تھی۔ صندل وڈ کی خوشبو موم کی قید سے آزاد ہو کے سارے میں پھیلنے لگی۔ وہ ٹیک لگائے' آنکھوں کی پتلیاں سکوڑے غور سے اسے دیکھے گیا۔

''میں جو لندن سے آئی ہوں اس کمپنی کے لیے۔ اور یہ لوگ جو (دروازے کی طرف اشارہ کیا)

pklibrary.com

دن رات اس کمپنی کے لیے کام کر رہے ہیں۔ اگر کیف ڈوبا تو ہم سب کے کیریئرز کا کیا بنے گا؟"

"تم کافی دن سے مجھے اپ سیٹ لگ رہی ہو۔ کیا ہوا ہے؟" وہ قدرے حیران تھا۔

"کیونکہ تم اس کمپنی کو وقت نہیں دے رہے۔"

"وقت دینے ہی آفس آیا ہوں۔ اور..." وہ متعجب ہوا۔ "ابھی تم کہہ رہی تھیں مجھے گھر پہ ہونا چاہیے تھا۔"

"تم کیف پہ کام کرنے آفس نہیں آئے۔ مجھ سے یہ پوچھنے آئے ہو کہ مجھے زیاد سلطان کی بینک اسٹیٹمنٹ میں کیا ملا؟"

وہ میز کے کناروں پہ ہاتھ رکھے کھڑی بہت بے بسی بھری برہمی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ماہر نے "اوہ" کہہ کے ایک گہری سانس خارج کی۔

"کیا ملا؟" مسکرا کے سامنے رکھا لیپ ٹاپ کھولا۔ دوسرا ہاتھ بڑھا کے ڈیسک ٹاپ آن کیا۔ بیک وقت بہت سی اسکرینز جل اٹھیں۔

"تمہیں اپنے اس جنون کے علاوہ کسی کی فکر نہیں ہے ماہر۔"

"وہ جنون نہیں ہے۔ وہ میری بہن ہے۔" وہ ایک دم درشتی سے بولا۔ مسکراہٹ غائب ہوئی اور ماتھے پہ بل پڑ گئے۔

"وہ بہن جو مر چکی ہے۔ اس کی تلاش میں ہم سب تمہارے آلۂ کار بنے ہوئے ہیں۔ رہی زارا تو زارا کا کیا۔ زارا اسی چیز میں تو اچھی ہے۔ ایک کال کرو اور زارا کام کر دے گی۔ فلاں کا پتا کرواؤ۔ فلاں کی بینک اسٹیٹمنٹ نکلواؤ۔" اس کی آواز بھیگنے لگی۔

"تمہیں آلۂ کار بننے سے منع کر دینا چاہیے تھا۔ میں کسی اور سے کہہ دیتا۔" وہ بے نیازی سے اپ کی بورڈ پہ انگلیاں چلا رہا تھا۔ اسکرین کی نیلی روشنی اس کے چہرے پہ پڑ رہی تھی۔

"بابا ٹھیک کہتے ہیں۔ تمہیں میری پروا نہیں ہے۔"

"زارا کیوں صبح صبح مجھ سے لڑ رہی ہو؟" اس نے کراہ کے اسکرین فولڈ کی۔ پھر بے بسی سے اسے دیکھا۔ سر میں درد ہونے لگا تھا۔

"تم میں اور کبیرہ سادان میں کوئی فرق نہیں ہے۔" وہ افسوس سے اسے دیکھ رہی تھی۔

ماہر فرید کے چہرے پہ ناگواری بکھری۔ جیسے کچھ کڑوا مشروب پی لیا ہو۔

"مجھے اس سے کیوں ملا رہی ہو؟"

"کیونکہ اسی سے سب شروع ہوا تھا۔ تم نے اس کے بارے میں مجھے معلومات لینے کے لیے کہا۔ اور میں نے تمہاری مدد کر کے تمہیں مزید اس جنون کی دلدل میں دھکیل دیا۔ اسی کی وجہ سے تم بار بار لاہور جاتے ہو۔ اور تمہارے ساتھ یہ سب (بیساکھی کی طرف اشارہ کیا) ہو رہا ہے۔"

"زارینہ فرید...." اس نے آنکھیں بند کر کے کنپٹیوں کو سہلایا۔ "میں کبیرہ کے لیے لاہور نہیں جاتا۔ میں اس کے بارے میں صرف اس لیے جاننا چاہتا تھا تاکہ دیکھ سکوں کہ اس کے اور میرے خاندان کے درمیان کوئی مشترک کڑی ہے یا نہیں۔ اور یقین کرو ہمارے درمیان کچھ مشترک نہیں ہے۔ میں اپنے جس دشمن کو ڈھونڈ رہا تھا اس کا کبیرہ سے تعلق نہیں ہے۔"

"جھوٹ مت بولو۔ تم میں اور اس عورت میں بہت کچھ مشترک ہے۔ لیکن خیر.... مجھے کیا۔" اس نے میز پہ رکھے کاغذات کا ایک پلندہ اس کی طرف دھکیلا۔

"زیاد سلطان کی بینک اسٹیٹمنٹس۔ مت پوچھنا کہ مجھے کیسے ملیں۔ بہت وقت لگا۔ لیکن مل گئیں۔" لہجہ جتاتا ہوا تھا۔ "اور ان میں ایسا کچھ نہیں ہے جو مشکوک ہو۔ وہ کسی کو ایک مخصوص رقم نہیں بھیجتا۔ بلکہ وہ زیادہ پیسے خرچ نہیں کرتا۔ کنجوس ہے۔"

ماہر نے تیزی سے پلندہ اٹھایا اور نگاہ پہلے صفحے پہ دوڑائی۔

"کوئی بڑی رقم جو اس نے نکلوائی ہو؟" وہ

pklibrary.com

صفحات پلٹتا رہا تھا۔ زارا نے افسوس سے اسے دیکھا۔
"کہا نا۔ کنجوس ہے۔ زیادہ پیسے خرچ نہیں کرتا۔"
"یہ ایک اکاؤنٹ سے اسے ہر ماہ ایک بڑی رقم بھیجی جا رہی ہے۔" اس نے پین سے ایک جگہ اشارہ کیا۔
"یہ اس کی ماں کا اکاؤنٹ ہے۔ ماما ز بوائے۔ ابھی تک اپنی ماں سے خرچہ لیتا ہے۔" زارا نے کندھے اچکائے۔ وہ ابھی تک خفا خفا سی تھی لیکن وہ جیسے اسٹیٹمنٹ کی طرف متوجہ تھا۔
"بہت پیسہ ہے اس کی ماں کے پاس۔" وہ بڑبڑایا۔ یونہی چہرہ اٹھا کے کچھ سوچنے لگا۔ نگاہیں کنسول ٹیبل پہ جلتی صندل وڈ کی موم بتی پہ جمی تھیں۔
"کیا ہوا؟"
"اس کی ماں..." اس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ "اس کی ماں سے میں ملا تھا۔ کب؟"
اور اگلے ہی لمحے اسے یاد آیا۔ وہ باہر لان میں تھا۔ وہ دن جب وہ کشمالہ مبین کی نوکری چھوڑ رہا تھا۔ وہ اسے کھڑکی سے اندر بیٹھی دکھائی دی تھیں۔ سفید دوپٹے والی باوقار سی عورت۔ دونوں کی نگاہیں ملیں۔ پھر انہوں نے اسے بلایا تھا۔ کیوں؟ کچھ منگوایا تھا انہوں نے۔ ہاں۔ اسے یاد آیا۔ جائے نماز۔ وہ جائے نماز لے کر اندر آیا۔ انہوں نے شکریہ کہا۔ اس نے جائے نماز ساتھ رکھی۔ اور واپس مڑا۔ انہوں نے اسی وقت جائے نماز اٹھائی۔ ان کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے ٹکرایا تھا۔ ہلکا سا لمس۔ جیسے راہ چلتے بہت سے لوگوں کے ہاتھ ٹکرا جاتے ہیں۔ اور وہ باہر نکل آیا تھا۔ وہ زیاد اور مالا کے رشتے کی بات کر رہی تھیں۔ اور اس کے دل پہ جیسے گھونسا سا لگا تھا۔ اسے وہ گھونسا ابھی تک یاد تھا۔ جیسے کوئی جسمانی تکلیف ہو۔ اسی رات وہ اپارٹمنٹ جا کے شدید بخار میں مبتلا ہو گیا تھا۔
"اس کی ماں کے پاس زمینوں سے ٹھیکوں کی آمدنی آتی ہے۔ کہو تو اس کو چیک کروں؟" وہ قدرے طنز سے بولی۔ ماہر فرید نے سر جھٹکا۔
"اونہوں۔ اس کی ماں بے ضرر سی گھریلو عورت ہے۔ رہنے دو۔" وہ اسٹیٹمنٹ کے صفحے پلٹتا رہا تھا۔ اسے جیسے شدید مایوسی ہوئی تھی۔
"آخر زیاد کیسے سرکار کی فیس ادا کرتا ہوگا؟ کوئی حساب ہونا چاہیے تھا' نمبرز کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔ شاید وہ کسی اور صورت میں پے منٹ کرتا ہو۔" وہ خود سے بڑبڑا رہا تھا۔ سر اٹھایا تو دیکھا' وہ ابھی تک خفا نظر آ رہی تھی۔ ماہر کی پیشانی کے بل ڈھیلے ہوئے۔
"زارا..." وہ نرمی سے گویا ہوا۔ "میں نے تمہیں کبھی اس شہر میں آنے کے لیے مجبور نہیں کیا تھا۔ تم جب بھی واپس جانا چاہو' جا سکتی ہو۔ میں اتنا خود غرض نہیں ہوں کہ اپنی نئی کمپنی کی وجہ سے تمہارے کیریئر کے اہم سال ضائع کرواؤں۔ میں تمہیں نہیں روکوں گا۔ میں کسی کو بھی نہیں روکا کرتا۔"
"اور یہی تمہارا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ تم کسی کو نہیں روکتے۔ اور اسی وجہ سے ایک دن تم اکیلے رہ جاؤ گے۔"
وہ جیسے ایک دم پھٹ پڑی۔ پھر تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔
کاغذ اس کے ہاتھ میں رہ گئے۔ وہ جہاں بیٹھا تھا' وہیں سن ہو گیا۔
زارا کی چند لمحے پہلے کہی بات نے ایک دم اسے جھنجھوڑ دیا تھا۔
وہ درست کہہ رہی تھی۔ اسے پہلے کیوں اندازہ نہیں ہوا؟
اس نے کاغذات کا پلندہ پرے کیا اور تیزی سے انٹرکام کا ریسیور اٹھایا۔
"شبنم... مجھے ایک کیئر ٹیکر چاہیے۔ پروفیشنل نرس۔"

☆☆☆

اس صبح اپنے کمرے سے نکلنے سے پہلے کشمالہ

pklibrary.com

مبین نے مسکرا کے آئینے پہ چسپاں فہرست کی ایک سطر کاٹی تھی۔

ویڈنگ رنگ کی خریداری۔

جیولرز کی سفید محل جیسی عمارت سڑک پہ دور سے ممتاز دکھائی دے رہی تھی۔ سامنے پارکنگ لاٹ تھا جس کے اندر کار کھڑی کر کے وہ چند منٹ سے داخلی دروازے کے باہر کھڑی تھی۔ بار بار کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھتی۔ دھند اور سردی بڑھ گئی تھی۔ وہ سادہ سبز لباس پہ بھوری لیدر جیکٹ پہنے کھڑی ہاتھوں کو آپس میں رگڑ رہی تھی۔ قمیض کے گریبان پہ فاختہ والا لاکٹ جگمگا رہا تھا۔ کھلے بال ٹھنڈی ہوا سے پیچھے کو اڑ رہے تھے اور متلاشی نظریں پارکنگ لاٹ پہ جمی تھیں۔

تب ہی وہ اسے نظر آیا۔ چہرے پہ مسکراہٹ در آئی۔

''میں لیٹ ہو گیا۔'' زیاد سلطان مسکراتے ہوئے اس کی طرف آرہا تھا۔ خالہ کی باتیں اور سارے خدشے ہوا ہونے لگے۔

''نہیں۔ مجھے جلدی پہنچنے کی عادت ہے۔'' کہتے ہوئے لبوں سے دھواں سا نکلا۔

''ویڈنگ رنگ آپ اپنی پسند سے بھی لے سکتے تھے۔''

وہ دونوں عمارت میں ساتھ ساتھ داخل ہوئے۔

''آپ کا تحفہ۔ آپ کی پسند۔'' وہ مسکرا کے بولا۔ ٹرٹل نیک سوئیٹر کے اوپر اس نے کوٹ پہن رکھا تھا جو سامنے سے کھلا تھا۔ وہ اسے آج بھی ہمیشہ کی طرح اچھا ہی لگا تھا۔

''آپ کے بال بہت خوبصورت ہیں۔'' آگے بڑھتے ہوئے اس نے چہرہ اس کی طرف جھکا کے دھیرے سے کہا۔ ''لیکن مجھے زیادہ خوبصورت تب لگتے ہیں جب آپ اونچی پونی بناتی ہیں۔''

وہ ہلکا سا ہنس دی۔ ''وہ تو محض کام کرتے ہوئے بناتی ہوں۔ ورنہ مجھے اونچی پونی نہیں پسند۔''

جیولرز کی عمارت اندر سے روشنیوں سے منور تھی۔ ٹائلز سے سجی دیواریں، سیاہ اور سنہرے رنگ کے امتزاج کا ڈیکور، باوردی سیلز مین، عود کی خوشبو۔ ہر شے اعصاب پہ رعب طاری کرتی تھی۔

''ہیلو کشمالہ میم۔''

''میم بہت عرصے بعد آئیں۔''

اسے ہر طرف سے سلام کیا جا رہا تھا۔ بوڑھا چوکیدار، ویلکم ڈیسک پہ بیٹھی لڑکی، سیلز مین، سب کے سر جھکا کے استقبال کرنے کے انداز میں شناسائی تھی۔ وہ مسکرا کے سب کو سر کے خم سے جواب دے رہی تھی۔

زیاد سامنے ہال کی طرف بڑھنے لگا جہاں طویل شوکیسز بنے تھے لیکن اس نے روک دیا۔

''یہ گولڈ سیکشن ہے۔ ہم اوپر ڈائمنڈ سیکشن میں جائیں گے۔'' وہ مسکرا کے لفٹ کی طرف بڑھ گئی۔ زیاد کی مسکراہٹ قدرے پھیکی ہوئی۔ البتہ سر ہلا دیا اور اس کے پیچھے ہولیا۔

''آپ ان کی پرانی کلائنٹ ہیں غالباً۔'' گردن گھما کے اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے وہ سرسری سا بولا۔ جیسے بالکل بھی متاثر نہ ہوا ہو۔

''کہتے ہیں کسی کے خاندانی ہونے کا پتا اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کا ملازم اور اس کا جیولر کتنا پرانا ہے۔'' کشمالہ مبین نے مسکرا کے کندھے اچکا دیے۔ لفٹ کے دروازے کھلے تو وہ اسی اعتماد سے آگے بڑھ گئی۔ اسے معلوم تھا اسے کہاں جانا ہے۔ وہ اس کے چہرے پہ پھیلا غیر آرام دہ سا تاثر نہیں دیکھ سکی تھی۔

بالائی منزل سلور اور نیلے رنگ سے سجی تھی۔ یہاں ہر طرف ہیرے کے زیورات شوکیسز میں دکھائی دے رہے تھے۔ ہال کے وسط میں نیلے مخملیں صوفوں سے بنا ایک سٹنگ ایریا تھا۔ وہ دوسرے کسٹمرز کی طرح شوکیسز کی طرف نہیں گئی۔ سیدھا سٹنگ ایریا تک آئی اور ایک صوفے پہ بیٹھ کے ٹانگ پہ ٹانگ جمالی۔

pklibrary.com

سوئیٹرز نے پیچھے ایک سینئر جیولر ایک کسٹمر کو کچھ دکھا رہے تھے۔ اس پہ نظر پڑی تو مسکرا کے سر کو خم دیا۔ پھر اپنے کسٹمر کو دوسرے جیولر کے حوالے کر کے شائستگی سے معذرت کرتے ہوئے وہاں سے اٹھ آئے۔

"کشمالہ جی۔ کیسی ہیں آپ؟"

وہ ان کے سامنے والے صوفے پہ آ بیٹھے۔ وہ پرسکون نظر آ رہی تھی۔ البتہ زیاد قدرے تکلف سے بیٹھا تھا۔ نگاہیں اطراف کا جائزہ لے رہی تھیں۔

"آپ کی والدہ کا بہت افسوس ہوا۔" جیولر اس سے تعزیت کر رہے تھے۔ مالا نے تھوڑی قدرے جھکا دی۔ اس ذکر سے ملنے والی تکلیف کبھی پرانی نہیں ہو سکتی تھی۔

"بہت نیک خاتون تھیں۔ بہت اچھی۔ جب بھی آپ کے ساتھ آئیں' ایک خوشگوار تاثر چھوڑ کے گئیں۔ ان کی موت پہ ایک دنیا روئی ہوگی۔"

زیاد سلطان کے چہرے پر سے سایہ سا گزرا۔ اس نے ٹائی ڈھیلی کرنے کے لیے گردن کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن احساس ہوا کہ بنا ٹائی کے ہی گھٹن محسوس ہو رہی ہے۔

"آپ اپنے ڈائمنڈز یہیں سے خریدتی ہیں؟" اس نے مداخلت کی۔ وہ جو تعزیت کے جواب میں ماں کے لیے کچھ کہنے والی تھی' زیاد کو دیکھ کے جواب دینے لگی۔

"جی۔ کیونکہ ڈائمنڈ جیولری ایک اچھی انویسٹمنٹ ہوتی ہے اگر جیولر اچھا ہو۔ یہی ڈائمنڈز امریکہ اور کینیڈا سے آدھی قیمت پہ سیل میں بھی مل جاتے ہیں لیکن میں ان کو بیچ نہیں سکتی۔ اس کے برعکس' لاہور کے تمام بڑے جیولرز ڈائمنڈ جیولری ایک سال بعد اسی قیمت پہ واپس لے لیتے ہیں یا ہم اس کی جگہ کچھ اور خرید سکتے ہیں۔ جب دل بھر گیا تو واپس کر کے کچھ اور لے لیا۔"

"امریکہ کینیڈا کے سیل والے ڈائمنڈز کا ذکر نہ ہی کریں۔" سوٹ میں ملبوس سینئر جیولر نے منہ بنایا۔ "ان کو اس کے پیچھے رکھو (ایک عدسہ اٹھا کے لہرایا) تو دوبارہ دیکھنے کا جی نہیں کرتا۔ خیر... کیا دیکھنا چاہیں گی آپ؟"

نگاہیں گھما کے باری باری دونوں کو دیکھا۔ ایک تمکنت سے بیٹھی سبز آنکھوں والی لڑکی جس کے لمبے بال چہرے کے دونوں اطراف میں گر رہے تھے' اور ساتھ غیر آرام دہ سا بیٹھا بے کشش چہرے والا نوجوان۔

"ویڈنگ رنگ۔" وہ کھنکھارا۔ ایک ملازم ان کے سامنے بھاپ اڑاتے کافی کپ رکھ رہا تھا۔ کشمالہ نے شائستگی سے معذرت کر لی۔

"میں باہر کسی کو کافی کا کہہ آئی ہوں۔ تھینکس۔"

"ون کیرٹ؟ ٹو کیرٹ؟" جیولر کی بظاہر مسکراتی لیکن اندر تک ایکس رے کرتی نظریں زیاد سلطان پہ جمی تھیں۔

"جو بہترین ہو۔" زیاد نے جواباً مسکرا کے مالا کی طرف دیکھا۔ اس کا اعتماد بحال ہو رہا تھا۔

"بہترین۔ او کے۔"

تھوڑی دیر بعد نیلے مخمل کے ڈسپلے کیس ان کے سامنے میز پہ رکھے تھے جن میں درجنوں انگوٹھیاں جگمگا رہی تھیں۔ چھت پہ نصب روشنیوں نے ہیروں کی چمک کو کئی گنا بڑھا دیا تھا۔ زیاد نے دیکھا' مالا کے ہاتھوں میں پہلے سے چار انگوٹھیاں' کانوں میں ڈائمنڈ ٹاپس اور کلائی میں ہیروں سے جگمگاتا نازک سا بریسلیٹ موجود تھا۔ ان سب کی چمک اسے مزید غیر آرام دہ کر رہی تھی۔

"ویڈنگ رنگ صرف ایک (ایک نگ والی انگوٹھی) solitaire کی ہونی چاہیے۔ اس کیس میں صرف سولیٹرز ہیں۔ اور یہ آپ کو پسند آئے گا۔"

جیولر نے ایک انگوٹھی اٹھائی اور اس کی طرف بڑھائی۔

"ون کیرٹ۔ بلیو ڈائمنڈ۔ یہ ابھی حال ہی میں امپورٹ میں آیا ہے۔"

ان دونوں کی نگاہیں اس کی طرف بلند ہوئیں۔ وہ ایک نیلی چمک والا چوکور solitaire تھا جو انگوٹھی میں مرصع تھا۔

"بہت خوبصورت۔" وہ زیر لب بڑبڑائی۔

"کیا قیمت ہوگی اس کی؟" زیاد انگوٹھی کو دیکھ رہا تھا۔

"آپ کے لیے..." جیولر نے کیلکولیٹر اٹھایا۔ چند کیز دبائیں۔ پھر سر اٹھا کے عام سے انداز میں بولا۔

"گیارہ لاکھ۔ اور یہ تھرٹی پرسنٹ ڈسکاؤنٹ کے بعد کی قیمت ہے۔"

زیاد سلطان کے ابرو استعجاب سے اٹھ گئے۔ البتہ وہ ہلکا سا ہنس دی۔

"یہ بہترین ہے' تنویر بھائی۔ لیکن مجھے بہترین نہیں چاہیے۔ ایسی انگوٹھی کی توقع میں اپنے فیانسی سے نہیں کرتی۔ اپنی کمائی سے کرتی ہوں۔ اب آپ مجھے وہ دکھائیں جو مجھے پسند آئے گا۔"

جیولر مسکرا کے اب اس کو کچھ دوسری انگوٹھیاں دکھا رہا تھا۔ گاہے بگاہے کن انکھیوں سے وہ زیاد کو بھی دیکھ لیتا جو ہنوز اسی چوکور ہیرے والی انگوٹھی کو دیکھ رہا تھا۔

"وہ بہترین تھی۔" زیاد سرگوشی میں بولا۔

"نہیں۔ وہ بہت مہنگی ہے۔ گیارہ لاکھ میں ہم ہنی مون ٹرپ پلان کر سکتے ہیں۔"

مالا نے ایک انگوٹھی ڈسپلے کیس سے نکالی اور انگلی میں پہن کے ہاتھ اونچا اٹھا کے دیکھا۔

اس کے وسط میں ایک سادہ سفید موتی لگا تھا۔ اور دائیں بائیں دو ننھے ننھے ہیرے۔

"یہ کیسی ہے؟" وہ قدرے پرجوش سی ہوئی۔

"یہ تو موتی ہے۔"

"مجھے دکھاوے کے لیے ایک کیرٹ نہیں لینا۔ وہ لینا ہے جو منفرد اور خوبصورت ہو۔ آرٹسٹک ہو۔ ایسا ڈیزائن جو گفتگو کرتا ہو۔"

"نہیں۔ امی کو اچھا نہیں لگے گا اگر میں آپ کو موتی کی رنگ دوں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا اور جیولر کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ خاموش ہوگئی۔

"میں امی کے ساتھ دوبارہ آؤں گا اور ہم وہی بہترین والا ون کیرٹ خریدیں گے۔"

جیولر نے مسکرا کے سر کو اثبات میں ہلایا۔

"ویسے آپ کے ڈائمنڈز اصلی ہوتے ہیں نا؟ یو نو ...پاکستان میں کسی چیز کا بھروسہ نہیں ہوتا۔"

وہ جو موتی والی انگوٹھی واپس رکھ رہی تھی' چونک کے اسے دیکھنے لگی۔ اس کی ٹون میں ہلکا سا طنز تھا۔

"ڈونٹ وری۔ آپ کو ڈائمنڈ کا GIA سرٹیفکیٹ ساتھ ملے گا۔ یوں سمجھ لیں کہ ہر ڈائمنڈ کے اوپر لیزر کی مدد سے اس کا نمبر لکھا ہوتا ہے۔ آپ اس ڈائمنڈ کو دنیا میں کہیں بھی لے جا کے چیک کروا سکتے ہیں۔"

زیاد سلطان نے ہلکے سے شانے اچکا دیے۔ کہا کچھ نہیں۔ کچھ تھا جو شمالہ مبین کو غیر آرام دہ کرنے لگا۔

"وہ بہت مہنگی ہے' زیاد۔"

"شادی ایک ہی دفعہ ہوتی ہے اور شادی کا تحفہ ایک ہی دفعہ دیا جاتا ہے۔" وہ دونوں لفٹ کی طرف جا رہے تھے اور ان کی سرگوشیاں جیولر صاحب یہاں سے سن سکتے تھے۔ جونیئر جیولر اب ڈسپلے باکسز اٹھا رہا تھا۔ دفعتاً ٹھہر کے کہنے لگا۔

"سر اس چوکور ڈائمنڈ کا مسز عبدالباری بھی پوچھ رہی تھیں۔ ان کو کیا کہوں؟"

"یہی کہ دستیاب ہے۔" وہ ان کو لفٹ کے اندر جاتے دیکھ رہے تھے۔

"لیکن زیاد صاحب اسے خریدنے کا کہہ رہے تھے۔"

"بیٹے...." انہوں نے اس کے کندھے کو ہلکا سا تھپکا۔ "ڈائمنڈ خریدنے والے ڈائمنڈ خرید کے ہی جاتے ہیں۔"

وہ دونوں باہر نکلے تو آسمان پہ ہلکی سی دھوپ نکلی تھی۔ دھند قدرے کم محسوس ہو رہی تھی۔

pklibrary.com

''ہم امی کو شادی کی شاپنگ میں شامل نہیں کر سکے۔ اس لیے سوچا کہ انگوٹھی انہی کے ساتھ خرید لوں۔'' وہ پارکنگ ایریا کی طرف جاتے ہوئے وضاحت کر رہا تھا۔

''شیور۔ جیسے آپ کو بہتر لگے۔ کیسی طبیعت ہے ان کی؟''

زیاد نے گردن جھکا دی۔ ''وہ ٹھیک نہیں ہیں۔'' گھٹن پھر سے بڑھنے لگی تھی۔

''میں بہت دعا کرتی ہوں ان کے لیے۔ وہ ٹھیک ہو جائیں گی۔'' وہ نرمی سے کہہ رہی تھی۔ وہ جواباً کچھ کہنے لگا جب....

''مالا باجی۔''

زیاد سلطان چونک کے گھوما۔ سامنے پارکنگ لاٹ میں ایک پٹھان بچہ بھاگتا ہوا آرہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کافی کا ڈسپوزیبل گلاس تھا۔ زیاد نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔

''زیاد.... یہ طوطی ہے۔ میرا بہت اچھا ہیلپر۔'' اس نے مسکرا کے کافی اس کے ہاتھ سے لی اور پیار سے اس کے بال بکھیرے۔ ''اس نے شادی کی بہت سی شاپنگ میرے ساتھ کروائی ہے۔ آتے ہوئے میں اسے ایک فرینڈ کے ریسٹوران میں چھوڑ آئی تھی جہاں یہ میری مرضی کی کافی بنوا رہا تھا۔ اور ہاں یہ میری ایک ساڑھی بھی میرے ساتھ پینٹ کروا رہا ہے۔''

طوطی جھینپ کے مسکرا دیا اور گردن اونچی کر کے دراز قد سے زیاد کو دیکھا۔ وہ اتنا پرجوش دکھائی نہیں دیتا تھا۔

''یہ وہ چاکلیٹس والے زیاد بھائی ہیں نا؟''

''چاکلیٹس؟'' زیاد چونکا۔ وہ تینوں پارکنگ ایریا میں دم توڑتی دھند کے درمیان کھڑے تھے۔

''ہاں جی۔ آپ کی لائی ساری چاکلیٹس میں ہی تو کھاتا ہوں۔'' طوطی نے دانت نکالے۔ مالا دھیرے سے ہنس دی۔

''کیا مطلب؟'' وہ مسکرا نہیں سکا۔ سانس تک رک گیا۔

''میں چاکلیٹس نہیں کھاتی نا۔ تو آپ کی چاکلیٹس یہی کھاتا ہے۔ یا اس کے بھائی۔ اور بدلے میں اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ یہ دوبارہ اسکول جانا شروع کرے گا۔'' وہ ہنس کے بولی۔ پھر زیاد کا چہرہ دیکھا۔ کچھ تھا اس کے چہرے پہ جو کشمالہ مبین کی مسکراہٹ پھیکی ہوئی۔ اس نے کافی طوطی کو تھمائی اور اسے کار میں بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ سر ہلا کے کار کی طرف بھاگ گیا۔

''کیا ہوا، زیاد؟''

''یعنی وہ تحفہ جو میں آپ کے لیے لاتا ہوں، وہ آپ اس... اس بچے کو دے دیتی ہیں؟'' بازو لمبا کر کے اس طرف اشارہ کیا جہاں کار کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ پڑ رہا تھا اور ماتھے پہ لکیریں تھیں۔

''میں چاکلیٹس نہیں کھاتی۔ اس لیے....''

''آپ کے نزدیک میرے تحفے کی یہ قدر ہے؟ پسند نہیں آیا تو خیرات کر دیا؟ ہیرے کی انگوٹھی پسند نہ آئی تو اسی کو دے دیجیے گا۔''

بے بسی بھرے غصے سے اس کی آواز اونچی ہو گئی۔

وہ چند لمحے کے لیے جیسے ششدر رہ گئی۔ گھڑیال نے بارہ بجا دیے تھے اور فیری ٹیل جیسے ٹوٹنے کو تھی۔

''زیاد آپ کو معلوم ہے کہ میں میٹھا نہیں کھاتی۔ سوائے چاکلیٹس کے میں آپ کے تمام تحفے استعمال کرتی ہوں۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں کہ.....'' وہ بہت حیرت اور الجھن سے اس کو دیکھتی کہہ رہی تھی جب اس لمحے کچھ ہوا۔

کچھ ایسا جو اس نے توقع نہیں کیا تھا۔

(''سحرِ عشق کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔'' وہ کتاب کھول کے چہرے کے سامنے کر چکا تھا۔

بیربل ٹھہر کے اسے دیکھنے لگا۔

''کیا مطلب؟ تم نے خود کہا تھا کہ جادوگر کسی پر بھی سحرِ عشق کروا سکتے ہیں۔''

pklibrary.com

''ہاں۔ یہ نہیں کہا تھا کہ وہ کامیاب بھی ہوتے ہیں۔ بلکہ....'' اس نے پڑھتے ہوئے صفحہ پلٹایا۔

''سحرِ عشق کا انجام وہ نہیں ہوتا جو تم سوچ رہے ہو۔ یہ سحر کروانے والے کو اس کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔''

''کیسی قیمت؟'')

وہ دونوں پارکنگ لاٹ میں آمنے سامنے کھڑے تھے۔ اس کی نظریں زیاد سلطان کے چہرے پہ تھیں اور اس لمحے کچھ ہوا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے زیاد کا چہرہ بدل گیا۔ وہ ایک بھیڑیے کا چہرہ بن گیا جس کے منہ پہ خون لگا ہوا تھا۔

کشمالہ بدک کے دو قدم پیچھے ہٹی۔ خوف سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

(''سحرِ عشق کروانے والا ایک شیطان سے مدد لیتا ہے۔ اس کے ذریعے خود کو محبوب کی نظروں میں خوبصورت دکھاتا ہے۔ اور یوں وہ اپنا کنٹرول شیطان کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ شیطان کو سب سے زیادہ جو چیز پسند ہے، وہ کنٹرول ہے۔ کسی انسان کی زندگی کو کنٹرول کرنا۔)

اگلے ہی لمحے اس کا چہرہ بدل گیا۔ واپس نارمل۔ کشمالہ نے پلکیں جھپکائیں۔ زیاد جھنجھلا کے کچھ کہہ رہا تھا لیکن وہ سفید چہرے کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھی۔

(اور شیطان صرف وہ نہیں کرتا جو ساحر اسے کہے۔ وہ اپنی شرارت کا اضافہ بھی کرتا ہے۔ وہ ساحر اور اس کے محبوب، دونوں کی زندگیوں کو کنٹرول کرنے لگتا ہے۔ وہ ان کو اپنی مرضی سے کچھ بھی دکھا سکتا ہے۔ ان کو ڈسٹرب کر سکتا ہے۔ خود جادو کروانے والے کو بھی۔)

''زیاد میں گھر جا رہی ہوں۔'' وہ اس کو دیکھے بنا تیزی سے کار کی طرف بڑھی۔ اسے سانس نہیں آ رہا تھا جیسے۔ وہ اس کے پیچھے لپکا۔

''کشمالہ سوری۔ میری بات سنیں....''

(اکثر اوقات شیاطین سحرِ عشق کو الٹا دیتے ہیں۔ جسے وہ خوب صورت بنا کے دکھا رہے تھے، اس کو کچھ اور بنا کے دکھاتے ہیں۔

''مثلاً کیا؟''

''مجھے نہیں معلوم۔ مختلف لوگوں کے مختلف تجربات ہوتے ہیں۔ شیطان کا مقصد صرف ان کی زندگیاں ڈسٹرب کرنا ہوتا ہے، اسی لیے سحرِ عشق کامیاب نہیں ہوتا کیونکہ شیطان جس رشتے میں داخل ہو جائے، اس میں برکت نہیں رہتی۔)

''پلیز اسٹاپ....'' زیاد اس کے پیچھے آ رہا تھا جب اس نے ہاتھ اٹھا کے اسے روکا۔ وہ نا سمجھی سے چند قدم کے فاصلے پہ رک گیا۔ وہ گہرے گہرے سانس لیتی خوف سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''میں گھر جا رہی ہوں۔ ہم بعد میں بات کریں گے۔'' اس نے کار کا دروازہ کھولا تو ہاتھ کپکپا رہے تھے۔

(جب انسان اپنے محبوب کو پانے کے لیے شیاطین کے پاس جائے تو وہ خود کو شیطان کے ہاتھ میں ایک کھلونا بنا دیتا ہے۔ وہ جو چاہے اس کے ساتھ کرے۔)

''مالا باجی کیا ہوا؟'' فرنٹ سیٹ پہ بیٹھا طوطی ہکا بکا رہ گیا۔ وہ لرزتے ہاتھوں سے کار اسٹارٹ کر رہی تھی۔ زیاد کار کے قریب آیا۔ وہ کچھ کہہ رہا تھا۔ معذرت۔ سوری۔ لیکن وہ نہیں سن رہی تھی۔

(''جادو ایک سراب ہے۔ ایک الوژن۔ کوئی انسان کسی کے دل میں جادو سے اپنی محبت پیدا نہیں کر سکتا۔ صرف اس کو ایک الوژن میں رکھ سکتا ہے۔ اور الوژن کا سارا مسئلہ یہ ہی ہے کہ وہ جتنا قریب آئے اتنا ہی جلدی کھل جاتا ہے۔''

''پھر ہماری ماں اتنے برس تک شمس کے ساتھ کیوں رہیں؟''

''اس کا جواب میں تمہیں پھر کسی وقت دوں گا۔'' ماہر نے کتاب چہرے کے سامنے کر لی۔)

وہ تیزی سے کار کو ریورس کر رہی تھی۔ دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ ہاتھوں میں ہنوز لرزش تھی اور

چہرہ زرد پڑ رہا تھا۔
اس نے دیکھا تھا جو اس نے دیکھا تھا۔ اور کوئی بھی چیز اس منظر کو اس کے ذہن سے کھرچ نہیں سکتی تھی۔

☆☆☆

دروازہ زوردار آواز سے بند ہوا تو نگینہ بیگم نے چہرہ اٹھایا۔
وہ اس وقت اپنے لاہور کے گھر کے ماسٹر بیڈروم میں بیٹھی تھیں۔ بستر پہ چند زیورات اور کف لنکس کے ڈبے پھیلے تھے۔ ساتھ کھڑی بنگالی ملازمہ مزید ڈبے کھول کھول کے سامنے رکھ رہی تھی۔ دروازہ ادھ کھلا تھا جس کے باعث باہر سے آتے قدموں کی آواز واضح سنائی دی۔
ملازمہ نامحسوس طریقے سے کمرے سے نکل گئی۔ نگینہ بیگم بھی مخملیں ڈبے کی طرف متوجہ ہوئیں جس میں سجا سیٹ آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا۔ انہوں نے دو انگلیوں سے اس کا ائیر رنگ اٹھایا۔
تیز قدم چوکھٹ پہ رکے۔ پھر زیاد کی جھنجھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔
"کچھ بھی ٹھیک سے کام نہیں کر رہا۔"
"کر رہا ہے۔ اگلے ہفتے تمہارا اور کشمالہ کا نکاح ہے۔" انہوں نے ائیر رنگ روشنی کی طرف اونچا کیا۔ پھر اسے الٹایا۔ اس کا سہارا ٹوٹا ہوا تھا۔
"وہ میری دی گئی چاکلیٹس نہیں کھاتی، امی۔"
وہ شکست خوردہ سا ان کے قدموں میں فرش پہ بیٹھا اور ان کے گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ لیے۔ اس کے چہرے پہ زمانے بھر کی بے بسی رقم تھی۔
"پہلے اس کی ڈیٹ آف برتھ غلط تھی۔ اب وہ چاکلیٹس نہیں کھاتی۔ ہر کچھ دن بعد ایک نئی رکاوٹ آ جاتی ہے۔" وہ دونوں مٹھیاں بھینچے تکلیف سے کہہ رہا تھا۔
"نیا سہارا لگے گا۔" انہوں نے افسوس سے سر ہلایا اور ائیر رنگ کو واپس ڈبے میں ڈالا۔
"امی کچھ کریں۔ ورنہ سب کچھ خراب ہو جائے گا۔"
"اگلے ہفتے نکاح ہے، زیاد۔" انہوں نے اب کے دوسرا ائیر رنگ اٹھایا تو ہاتھوں میں ذرا سی لرزش تھی۔
"آپ نے سنا نہیں؟ وہ میٹھا نہیں کھاتی، امی۔ اور اسی بات پہ ہمارا جھگڑا ہو گیا ہے۔"
"میں جانتی ہوں وہ میٹھا نہیں کھاتی۔ سب کچھ میٹھے میں نہیں ہوتا۔ اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔" وہ اب دوسرا ائیر رنگ الٹا پلٹا کے دیکھ رہی تھیں۔ وہ درست حالت میں تھا۔
"امی کچھ کریں۔ کوئی دم، کوئی وظیفہ، کوئی دعا۔ لیکن اب کچھ خراب نہیں ہونا چاہیے۔"
"نہیں ہو گا۔ خراب کرنے والے کو منظر سے ہٹا دیا ہے نا۔" وہ اب زیور واپس رکھ کے ڈبا بند کر رہی تھیں۔ زیاد نے چونک کے انہیں دیکھا۔ ماتھے پہ بل پڑے۔ لب بھینچ گئے۔
"وہ نہیں آئے گا نا؟"
"نہیں آئے گا۔" انہوں نے ایک دوسرا ڈبا اٹھایا۔ وہ بالکل پرسکون تھیں۔
زیاد نے گہری سانس خارج کی۔ اس کی رنگت بحال ہونے لگی۔ پھر ان کے بوڑھے ہاتھوں کی لرزش دیکھی۔ چہرے پہ سایہ سا گزرا۔ کندھے ڈھیلے ہوئے۔
"دوا لی آپ نے؟" اس نے ان کے گھٹنے پہ ہاتھ رکھے۔
"میرا مسئلہ دوا سے حل نہیں ہو گا۔" انہوں نے ڈبا رکھا اور اس کو پہلی بار فرصت سے دیکھا۔ پھر مسکرائیں اور اس کے شانے پہ اپنا بوڑھا جھریوں زدہ ہاتھ رکھا۔
"میرا وقت قریب ہے، زیاد۔ مجھے کوئی چیز نہیں بچا سکتی۔ لیکن میں اپنے بیٹے کو اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی دے کر جاؤں گی۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔"
زیاد کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس نے ان کے

pklibrary.com

ہاتھ کو دونوں ہاتھوں سے تھاما اور آنکھوں سے لگایا۔
"سرکار۔" اس کے لبوں سے عقیدت سے نکلا تھا۔ پھر نظریں اٹھا کے انہیں دیکھا۔
"ہم نے کچھ غلط تو نہیں کیا نا' امی۔"
"ہرگز نہیں۔" وہ طمانیت سے مسکرائیں۔ "محبت پیدا کرنا غلط تھوڑا ہی ہے۔ ہم محبت پھیلاتے ہیں۔ نفرت نہیں۔ اور محبت میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔" انہوں نے اپنا ہاتھ نکالا اور اس کے سر پہ رکھا۔
"لیکن آپ کو میں نے پہلے بھی کہا تھا' زیاد! آپ کو اسے ناراض نہیں کرنا۔ اس طرح آپ اس کو خود سے متنفر کر دیں گے۔"
زیاد نے پشیمانی سے آنکھیں بند کیں۔
"اس کو کال کریں۔ معافی مانگیں۔ اور معاملہ درست کرلیں۔ یاد رکھیں۔ ہم محبت بانٹتے ہیں۔ صرف محبت۔"
زیاد سلطان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "ہم محبت بانٹتے ہیں۔"
وہ مسکرائیں اور نرمی سے اس کے گال پہ ہاتھ رکھا۔ پھر بغور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔
"آپ نے دوا لے لی' زیاد؟"
کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ وہاں کوئی آواز نہ تھی۔ صرف نگینہ بیگم کی نظریں تھیں جو اس کے چہرے پہ جمی تھیں۔ بنا کسی سحر کے وہ ان کی نگاہوں میں دنیا کا سب سے خوبصورت نوجوان تھا۔
زیاد نے نفی میں سر ہلایا۔ اور گہری سانس لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔
"اب لوں گا۔"
"آپ کو خوشی چاہیے۔ آپ شادی کے بعد ہی خوش ہوں گے اور خوش رہنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ دوا نہ چھوڑیں۔"
اس کے جانے کے بعد انہوں نے دھیرے سے سامنے رکھا ڈبا بند کیا۔ چہرے پہ چھایا سکون اور اطمینان اب رفتہ رفتہ غائب ہونے لگا تھا۔ انہوں نے اوپر چھت کی طرف دیکھا اور زیر لب بڑبڑائیں۔
"وہ نہیں آئے گا نہیں آئے گا۔" چہرے پہ تفکر بھری لکیریں ابھرنے لگیں۔

☆☆☆

وہ گھر واپس آئی تو اس کا چہرہ سفید پڑ رہا تھا اور ٹانگوں میں گویا جان نہیں تھی۔ تیزی سے لاؤنج عبور کرکے اپنے کمرے کے دروازے تک آئی اور ہینڈل پہ ہاتھ رکھا ہی تھا کہ عقب سے کسی نے پکارا۔
"مالا؟"
وہ بدک کے مڑی۔ سانس گویا رک گیا۔
"کیا ہوا؟" ماہی چند کپڑے اٹھائے کھڑی تعجب سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ ماہی تھی۔ صرف ماہی۔ کوئی اور نہیں تھا۔ کشمالہ نے گہری سانس خارج کی۔
"تم نے مجھے ڈرا دیا۔"
"تم ٹھیک ہو؟"
"ہاں۔ مجھے کیا ہونا ہے؟" وہ زبردستی مسکرائی۔ اسی لمحے کہیں پس منظر میں موسیقی گونجی۔ ایک مانوس سی دھن۔
ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔ نہ آواز نہ گانا۔ صرف موسیقی کی دھن۔
وہ چونکی۔
"یہ میوزک کہاں بج رہا ہے؟"
"میوزک؟" ماہی نے تعجب سے اسے دیکھا اور پھر دائیں بائیں۔ "کون سا میوزک؟"
"نہیں۔ کچھ نہیں۔" اس نے سر جھٹکا اور تیزی سے اندر جا کے دروازہ بند کرلیا۔
میوزک کی آواز اب بند ہو چکی تھی۔ اس نے سینے پہ ہاتھ رکھ لیا اور وہیں زمین پہ بیٹھتی چلی گئی۔ دل ہنوز زور زور سے دھڑک رہا تھا۔
"یہ کیا دیکھا تھا میں نے؟" بے یقینی سے خود سے سوال کیا۔ کمرے نے جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھے گیا۔

بیڈ کا دوسرا کنارہ خالی تھا۔ وہاں اب ماں نہیں تھیں۔ وہ ہوتیں تو بتاتیں کہ کیا کرنا ہے۔ وہ ہوتیں تو زندگی مختلف ہوتی۔

اس نے دھیرے سے اپنے دونوں گالوں کو چھوا۔ آنکھیں بند کیں۔ گہری گہری سانس لی۔ لیکن آج وہ سانس اسے ریلیکس کرنے میں ناکام ہو رہی تھی۔ آج وہ کھلتے بند ہوتے نل کے پاس جا کے چلا بھی نہیں سکتی تھی کہ میرا پیچھا چھوڑ دو۔ آج کچھ نیا ہوا تھا۔

پہلے الجھن ہوتی تھی۔ پریشانی۔ عدم تحفظ کا احساس۔ ایک کے بعد ایک گارڈ رکھا۔ پھر پرواہ کرنی چھوڑ دی۔ ماں کو کھو دیا۔ اب کیا کھونا رہ گیا تھا۔ پہلے جو تھا وہ خوابوں میں تھا۔ یا خون کے چھینٹوں کی صورت نظر آتا تھا۔ ایسا نہ تھا کہ نظر آئے لیکن وجود نہ رکھے۔ اگر جادوگر نے اس کی گردن دبوچی تھی تو خون نکلا تھا۔ وہ حقیقت تھا۔

لیکن جو آج ہوا تھا' ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

کیا یہ اس کا وہم تھا یا حقیقت؟

کھڑکی پہ دھیرے سے دستک ہوئی۔ دو دفعہ۔ پھر وقفہ۔ پھر تین دفعہ۔ وہ چونکی۔ کھڑکی کون کھٹکھٹا سکتا تھا؟ پھر دھیرے سے اٹھی اور آہستہ قدموں سے چلتی کھڑکی تک آئی۔ پردے پہ ہاتھ رکھا۔ اسے ہٹا دے؟ یا نہ ہٹائے؟

دل بری طرح دھڑکا۔ ٹانگیں کمزور ہوئیں۔ لرزتی انگلیوں سے پردہ سرکایا۔ چہرہ شیشے کے قریب کیا۔ باہر پھیلا لان دھوپ سے چمک رہا تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ کیا واقعی کسی نے دستک دی تھی یا اس کا ذہن اس کے ساتھ کوئی کھیل کھیل رہا تھا؟

پہلے اس ان دیکھی مخلوق سے خوف آتا تھا۔ آج اس سے خوف نہیں آ رہا تھا۔ اپنے آپ سے آ رہا تھا۔

کھڑکی کو پھر سے کوئی بجانے لگا۔ ہیپی برتھ ڈے ٹو یو کی طرز پہ۔

"کیا میں یہ سب تصور کر رہی ہوں؟ اسٹریس؟ پیرانویا؟" اب کہ وہ پردہ ہٹانے نہیں اٹھی۔ بیڈ کے کنارے پہ لیٹ گئی اور کشن کانوں پہ رکھ لیا۔ وہ تھکی ہوئی تھی۔ اسٹریس میں تھی۔ اسے سو جانا چاہیے۔ جب وہ آنکھیں کھولے گی تو یہ سب ایک برے خواب کی طرح فضا میں تحلیل ہو چکا ہوگا۔

☆☆☆

سیاہ سفید اپارٹمنٹ میں مدھم زرد بتیاں جل رہی تھیں۔ سیاہ پردے ہٹے ہوئے تھے اور دور تک پھیلی شہر کی بتیاں اور باسفورس کنارے بندھی کشتیاں دکھائی دیتی تھیں۔ بیربل ایک صوفے پہ لمبا لیٹا تھا۔ سینے کے اوپر دونوں ہاتھوں میں موبائل پکڑے وہ مسکرا کے کچھ ٹائپ کر رہا تھا۔

بیساکھیوں کی ٹک ٹک کی آواز پہ فیضی حانم نے چونک کے پیچھے دیکھا۔ ماہر اپنے کمرے سے نکل کے آتا دکھائی دے رہا تھا۔ دونوں بیساکھیوں اور درست ٹانگ کے سہارے' دوسرے پاؤں کو قدرے ہوا میں اٹھائے' وہ ٹی شرٹ اور ٹراؤزر میں ملبوس تھا' ماتھے پہ بال بکھرے تھے اور چہرہ پہلے سے کمزور دکھائی دیتا تھا۔ وہ فکرمندی سے آگے بڑھیں۔

"آپ خود کیوں آئے؟ مجھے آواز دے دی ہوتی۔"

"آواز دیتا تو یہ سب کیسے دیکھتا؟" اس نے ایک تیز نگاہ کچن کاؤنٹر پہ ڈالی۔

فیضی حانم نے اس کی نگاہ کے تعاقب میں دیکھا۔ کاؤنٹر پہ بیکری کا کھلا باکس رکھا تھا جس میں چند پیسٹریز دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ شرمندگی سے آگے بڑھیں اور جلدی سے اسے بند کر دیا۔

"میرے گھر میں یہ پروسیسڈ شوگر اور میدے سے بنی چیزیں کیوں موجود ہیں؟" وہ برہمی سے کہتا بیساکھی کے سہارے آگے بڑھا تو ایک دوسری ڈش دکھائی دی جس میں چند ادھ کھائے بقلاوے رکھے تھے۔

"بقلاوے؟ سیریسلی؟ بقلاوے؟" اس نے گھور کے انہیں دیکھا۔ "کبھی ترکوں کو کھاتے دیکھا

ہے بقلاوے؟ نہیں۔ کیونکہ کوئی ترکی میں بقلاوے نہیں کھاتا سوائے سیاحوں کے۔ آپ کو اپنی صحت کا خیال ہے؟"

"وہ آدمی کہہ رہا ہے جو اپنی صحت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے آج آفس گیا تھا۔" بیربل نے مسکراتے ہوئے موبائل سے نظر اٹھائے بغیر کہا۔ فیضی حانم سر جھکائے اب وہ چیزیں سمیٹ رہی تھیں۔

"تمہیں اس وقت اپنی بیکری میں ہونا چاہیے تھا' بی۔" وہ اب سہاروں سے چلتا' آتش دان کی طرف جا رہا تھا۔ لکڑی کے فرش پہ بیساکھیوں کی ٹک ٹک سیدھی سر پہ جا کے بجتی تھی۔

"ایک روبوٹ کافی ہے نا اس گھر میں' برو۔" وہ ٹائپ کرتے ہوئے مسلسل مسکرا رہا تھا۔ ماہر آتش دان تک پہنچا' اور لائٹر اٹھایا۔ ایک بیساکھی پھسل کے نیچے جا گری۔ اس نے کوفت سے اسے دیکھا۔ پھر دور صوفے پہ لیٹے بیربل کو۔

"اس کے نام کا پہلا حرف کیا ہے؟"

"کس کا؟" بیربل ہنوز ٹائپ کر رہا تھا۔

"جس لڑکی کے ساتھ لگے ہوئے ہو۔"

بیربل فرید کے ہاتھوں سے فون گرتے گرتے بچا۔ گڑبڑا کے ایک دم اٹھ بیٹھا۔ گردن موڑ کے اسے دیکھا۔ وہ آتش دان کے ساتھ کھڑا تھا اور ایک بیساکھی قدموں میں گری تھی۔

"کون... لڑکی؟ میں کسی لڑکی سے بات نہیں کر رہا۔ تمہاری نصیحت پہ عمل کرتے ہوئے آج کل صرف خود پہ فوکس کر رہا ہوں۔" بظاہر سرسری انداز میں کہتا وہ اس کے پاس آیا اور جھک کے بیساکھی اٹھائی۔

"یہ تو میں اپنے کیک اور میکرونز کی تصویریں دیکھ کے خوش ہو رہا تھا۔ آج ہم نے ایک بہت بڑی پارٹی کے لیے کیکس ڈلیور کیے ہیں۔" بیساکھی اسے تھماتے ہوئے وہ سنبھل کے مسکرایا اور موبائل اسکرین اس کی طرف لہرائی۔

"کچھ لوگ اپنے گھر میں میرے کیکس پسند نہیں کرتے' لیکن دوسروں کو میری بیکری کا نام ضرور تجویز کرتے ہیں۔" شرارت سے مسکرایا۔ انداز معنی خیز تھا۔

"میں کسی کو تمہاری بیکری تجویز نہیں کرتا۔ مجھے دوسرے انسانوں کی صحت کا خیال ہے۔" وہ لائٹر سے اب موم بتی سلگا رہا تھا۔ آتش دان کے شیلف پہ بنی ہلال کی تصویر مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہی تھی۔

بیربل جواباً ہنس دیا جیسے یقین نہ آیا ہو۔ پھر ایک خیال سے اس کی آنکھیں چمکیں۔

"اس ایونٹ کی تصویریں مالک کو بھیجتا ہوں۔ وہ سمجھتا ہے میری بیکری فلاپ ہے۔"

"تمہاری بیکری فلاپ ہے۔ کیونکہ تم توجہ' محنت اور روٹین سے کام نہیں کرتے۔" وہ قدم قدم لنگڑاتے ہوئے چلتا ایل شیپ صوفے تک آیا۔ بیربل برا مانے بغیر مسکرا کے موبائل کے بٹن دبا رہا تھا۔

"دیکھنا۔ جل جائے گا روبوٹ۔"

"مالک تمہاری پرواہ کرتا ہے' اسی لیے تمہیں ڈانٹتا ہے۔" وہ سامنے صوفے پہ بیٹھا۔ ٹانگ مڑی تو لبوں سے کراہ نکلی۔ چہرے پہ تکلیف کے آثار مرتب ہوئے۔ بیساکھیاں پھر سے نیچے جا گریں۔

"مالک سوائے ماہر کے نہ کسی کی پرواہ نہیں کرتا۔ نہ پیار۔" اس نے گویا ناک سے مکھی اڑائی۔ پھر ایک دم وہ چونک کے ماہر کو دیکھنے لگا۔

"ایک منٹ ایک منٹ... ماہر بے کے پاس آج میرے ساتھ بیٹھنے کے لیے وقت کہاں سے آ گیا؟ پچھلے دو ماہ سے تم یا کتابیں پڑھتے تھے یا کمرے میں بند رہتے تھے۔"

ماہر خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ بیربل کی آنکھوں میں شرارتی چمک ابھری۔

"تمہیں مجھ سے کچھ چاہیے' ہے نا؟"

"کیا تم...." ماہر کھنکھارا۔ بیربل مسکراہٹ دبائے سانس روک کے اس کا منتظر تھا۔

pklibrary.com

"کیا تم چند دن کے لیے میری وہیل چیئر چلا سکتے ہو؟"

بیربل کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ کندھے ڈھلک گئے۔

"کیوں؟" خفگی سے پوچھتا کچن کی طرف بڑھا۔ ماہر نے جواب نہیں دیا۔

"ڈاکٹر نے تمہیں بیساکھی استعمال کرنے کے لیے کہا ہے۔" وہ فریج تک گیا اور دروازہ کھول کے اندر جھکا۔

"وہیل چیئر تمہیں سست کردے گی۔" ایک کین نکال کے اس کا ڈھکن کھولا اور فریج کا دروازہ کھلا چھوڑ کے لاؤنج کی طرف واپس آیا۔ فیضی حانم نے زیرلب بڑبڑاتے ہوئے دروازہ بند کیا۔

"بس چند دن کے لیے۔"

"کیوں؟ کہیں جانا ہے کیا؟" اس نے کھڑے کھڑے سوڈا کا کین لبوں سے لگایا۔

"ہاں۔ لاہور۔"

سوڈا فوارے کی صورت اس کے لبوں سے باہر نکلا۔ کین ہاتھ سے گرتے گرتے بچا۔ وہ دوہرا ہو کے کھانسا۔

"کیا؟ لاہور؟" وہ دوبارہ کھانسا۔ سوڈا کپڑوں اور فرش دونوں پر گرا تھا۔ فیضی حانم اُف اللہ میاں کہتی تیزی سے آگے آئیں اور کین اس کے ہاتھ سے لیا۔

"ہاں۔ لاہور۔" وہ بہت ضبط سے اس کی اوور ایکٹنگ دیکھ رہا تھا۔

"اچھا وہ کیوں؟" بیربل کی آنکھوں میں چمک ابھری۔

"کام ہے۔" ماہر نے ہاتھ بڑھا کے سائیڈ ٹیبل سے پیپر ٹاول اٹھایا اور اس کی طرف بڑھایا۔

"اس کام کے نام کا پہلا حرف کیا ہے؟" وہ مسکرا کے پیپر ٹاول سے شرٹ کا گریبان رگڑنے لگا۔ ماہر کہنی صوفے کے ہتھے رکھے، انگلیاں گال تلے جمائے، ماتھے پر بل لیے اسے دیکھے گیا۔

"ایم۔ ہے نا؟" بیربل ہنس کے اپنے سوال کا جواب دیتا سامنے بیٹھا اور پیپر ٹاول بھینچ کے فیضی حانم کی طرف اچھالا۔

"K." وہ دھیرے سے بولا تو بیربل نے ماتھے کو چھوا۔

"اوہ ہاں۔ K۔" پھر ٹیک لگا کے ٹانگ پہ ٹانگ جمائی۔ اور سوچنے والے انداز میں گال تلے ہاتھ رکھے۔

"لیکن میں نہیں آسکتا۔"

"اور وہ کیوں؟"

"مجھے توجہ، محنت اور روٹین سے اپنی فلاپ بیکری پہ کام کرنا چاہیے۔"

"بیربل....!" اس کی آواز جیسے ہی سخت اور بلند ہوئی، وہ اسی تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"آرہا ہوں۔ آرہا ہوں۔ کب چلنا ہے؟" خفگی سے دونوں ہاتھ اٹھا دیے۔ "ویسے تمہیں کیئر ٹیکر نرس کا بندوبست کرنا چاہیے تھا۔" برا مان کے بولا۔ پھر ماہر کا چہرہ دیکھ کے ٹھٹکا۔

"اوہ۔ یقیناً پہلے تم نے نرس کو ساتھ لے جانے کا فیصلہ کیا ہوگا۔ لیکن خرچہ بہت آرہا ہوگا۔ پھر تم نے سوچا، بیربل سے وہی کام مفت میں کروالوں۔"

"بالکل۔" ماہر فرید نے سر کو خم دیا۔ بیربل نے افسوس سے اس کو دیکھا۔

"ویسے تم کئی ہفتے پہلے بھی پاکستان جاسکتے تھے۔ میں نے کتنا کہا۔ تم نہیں گئے۔ اب کیوں جارہے ہو؟"

"کیونکہ زارا نے آج ایک ایسی بات کہی جو میرے ذہن سے نکل نہیں پارہی۔" اس کی آواز اب دھیمی تھی۔ شکست خوردہ سی۔

"لیکن اگر اس جادوگر نے تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو؟ اس نے یہ ایکسیڈنٹ تمہیں روکنے کے لیے کروایا تھا۔" اس کی آواز میں تشویش تھی۔

ماہر نے فرش پہ رکھی بیساکھیاں اٹھائیں، اور

pklibrary.com

ان کو کہنیوں سے لگاتا اٹھا۔ چہرے پہ تکلیف ابھر کے معدوم ہوئی۔

"ماہر فرید کسی سے نہیں ڈرتا۔ نہ کسی انسان سے۔ نہ کسی شیطان سے۔" اس کی آنکھوں میں جھانک کے ایک ایک لفظ ادا کیا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ بیساکھیوں کی ٹک ٹک اور موم بتی کی خوشبو سارے میں پھیلی تھی۔

دفعتاً بیریل کے ہاتھ میں پکڑا موبائل تھرتھرایا تو وہ چونکا۔ مالک کا میسج آیا تھا۔

"ایک پارٹی سے فلاپ بیکری "برانڈ" نہیں بن جاتی۔"

گو کہ الفاظ ٹائپ شدہ تھے' لیکن وہ ان کو مالک کی آواز میں اپنے کانوں میں سن سکتا تھا۔ اس کے لب مسکراہٹ میں ڈھلے۔

"جل گیا روبوٹ۔"

☆☆☆

اسٹوڈیو کی کھڑکی سے آتی تیز روشنی میں چوکور فریم پہ تانا گیا ریشمی کپڑا چمک رہا تھا۔ فریم کے گرد دو اسٹولز رکھے تھے جن میں سے ایک پہ وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ بال فرنچ چوٹی میں بندھے تھے اور وہ گم صم سی ہاتھ میں پکڑے برش کو دیکھ رہی تھی۔

"مالا باجی آپ پریشان ہیں؟" طوطی دوسری جانب بیٹھا' دونوں گالوں کو ہتھیلیوں پہ رکھے اسے تشویش سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے چونک کے چہرہ اٹھایا۔ پھر اسے دیکھ کے مسکرائی اور برش نیچے رکھ دیا۔

"کچھ سوچ رہی تھی۔"

"آپ کا فون کافی دیر سے بج رہا ہے۔"

مالا نے ایک نظر قریب رکھے فون کو دیکھا جو بنا آواز کے تھرتھرا رہا تھا۔ پھر بے دلی سے واپس برش کو دیکھنے لگی۔ وہ اس سے ابھی بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اسے کسی سے تو بات کرنا تھی۔ ایک دم اس نے برش رکھا اور موبائل اٹھایا۔

پھر کانٹیکٹ لسٹ کھولی۔

ایم سے ماہی۔ ماہی نیچے گھر میں ہی موجود تھی۔ اس کے سامان کی پیکنگ وغیرہ کروا رہی تھی۔ لیکن وہ ماہی سے کیا کہتی؟ زیاد نے مجھ سے عجیب طریقے سے بات کی ہے؟ ماہی کو ہر ایک پہ شک کرنے کی عادت تھی۔ وہ فوراً سے خالہ کی بات پہ غور کرنے لگ جائے گی۔ اونہوں۔

اس نے لسٹ نیچے کی۔ صفورا؟ لیکن نہیں۔ زیاد کی اتنی تعریفیں کرنے کے بعد اس سے کیا کہوں؟

"مالا باجی آپ پینٹ کیوں نہیں کر رہیں؟" طوطی ریشم پہ بنے ادھورے پھول کو فکر مندی سے دیکھ رہا تھا۔

"میں اپنے دوستوں کے نام دیکھ رہی ہوں۔" وہ ابھی تک لسٹ اوپر نیچے کر رہی تھی۔

"آپ کے تو بہت دوست ہیں' باجی۔ جب بھی آپ کو کوئی کام ہوتا ہے' کہتی ہیں فلاں کلاس فیلو کے بوتیک پہ چلتے ہیں۔ فلاں کلاس فیلو کا ریستوران ہے۔" وہ اس کے انداز میں نقل اتار کے بولا تو وہ ہنس دی۔

"کیونکہ میں نے ایک معتبر یونیورسٹی سے ایم بی اے کیا ہے' لڑکے۔ میرے کلاس فیلوز اپنی اپنی زندگیوں میں کامیاب ہیں۔ تم نے درست کہا۔ میرے بہت دوست ہیں کیونکہ میں کسی کو دشمن نہیں بناتی نہ لوگوں کو ناراض کرتی ہوں۔ لیکن....." اس کی فون پہ جھکی نظروں میں اداسی بھر گئی۔ "لیکن اب جب مجھے بات کرنی ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ کوئی دوست اصلی نہیں ہے۔ سب بس کام تک محدود ہیں۔ یہ فیور چاہیے۔ وہ کام کروانا ہے۔"

طوطی اب بور ہو کے چاک سے اسکیچ پہ لکیریں کھینچنے لگا۔ وہ اسے نہیں سن رہا تھا۔ وہ شاید خود کلامی کر رہی تھی۔

دفعتاً اس کا انگوٹھا ایک نام پہ رکا۔ ماہر فرید۔ ایک تلخ مسکراہٹ لبوں پہ در آئی۔ باقی سب دوست تھے۔ وہ کیا تھا؟ دوست تو ہرگز نہ تھا۔ اس سے تو غصے اور نفرت کا تعلق تھا۔ اس کو نہیں پکارنا۔ اس نے خود

pklibrary.com

سے بہت پہلے وعدہ کیا تھا۔
"کیا واقعی غصے اور نفرت کا تعلق قائم تھا؟"
اس نے دل کو ٹٹول کے دیکھا۔ وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ نہ نفرت۔ نہ غصہ۔ بس دکھ تھا۔ دھوکے کا زخم تھا۔ لیکن معافی بھی نہیں تھی۔ بیچ کا راستہ بھی نہ تھا۔
"ہائے اللہ...." طوطی کی چیخ پہ اس نے چونک کے سر اٹھایا۔ وہ خوفزدہ نگاہوں سے ریشم کو دیکھ رہا تھا جہاں ایک جگہ اس سے غلطی سے پینٹ کا چھینٹا پڑ گیا تھا۔
"میں نے آپ کی ساڑھی خراب کر دی...."
اس نے بے یقینی سے مالا کو دیکھا۔ مالا نے ایک گہری سانس خارج کی۔
"ابھی ٹھیک ہو جائے گی۔" اس نے آرام سے ایک کاٹن بڈ اٹھایا اور اس دھبے سے پینٹ اتارنے لگی۔ گیلا پینٹ سرعت سے صاف ہونے لگا۔ طوطی کی رنگت ہنوز اڑی ہوئی تھی۔
"جانتے ہو خوشی یا پریشانی میں سب سے پہلے انسان میں کیا بدلتا ہے؟"
طوطی نے نا سمجھی سے اسے دیکھا۔ پھر سوچا۔
"کپڑے؟"
"نہیں۔ انسان کا سانس۔ ہر جذبہ انسان کا سانس بدلتا ہے۔ چاہے خوشی ہو۔ چاہے خوف۔ اگر ہم اپنا سانس کنٹرول کرنا سیکھ جائیں تو ہم سب کچھ کنٹرول کر سکتے ہیں۔ اپنی زندگی بھی۔ اور اپنے ذہن کو بھی۔ میری ساڑھی خراب نہیں ہوئی۔ اور ذرا سے دھبے کی وجہ سے تمہیں اپنا سانس خراب نہیں کرنا چاہیے۔" کاٹن بڈ رکھا اور اسے دیکھ کے نرمی سے مسکرائی۔ طوطی نے ایک گہری سانس خارج کی اور پورے دل سے مسکرا دیا۔
"طوطی... طوطی...." نیچے سے ماہی آوازیں دے رہی تھی۔ طوطی خان کے چہرے کے زاویے بگڑے۔ سر جھٹکتا اٹھا اور دروازہ کھول کے دھپ دھپ سیڑھیاں اترتا نیچے چلا گیا۔
"کیا ہے ماہی باجی؟" بے زاری سے طوطی کی آواز آئی۔
"نکمے لڑکے.... چلو یہ کارٹن اوپر لے کر جاؤ۔" وہ تحکم سے کہہ رہی تھی۔
"ماہی باجی .... آپ نے کبھی چائلڈ لیبر کے قوانین پڑھے ہیں؟"
"ابھی کان کے نیچے دوں گی تو سارے قوانین بھول جائیں گے۔ پورا دن تمہیں چاکلیٹس کھلاتی ہوں۔ تھوڑا سا کام بھی کرواؤ ساتھ۔"
وہ بڑبڑاتا ہوا کارٹن اٹھائے اوپر آیا۔
"قسم کھا رہا ہوں، مالا باجی۔ یہ آپ کی سوتیلی بہن ہے۔" دھپ سے کارٹن ایک کونے میں رکھا جہاں اور بھی بہت سے کارٹن رکھے تھے۔ وہ جواباً کچھ کہنے لگی جب سماعتوں میں کچھ گونجا۔ وہ ایک دم ٹھہر گئی۔
ہپی برتھ ڈے ٹو یو۔ یہ گانا یا الفاظ نہیں تھے۔ صرف موسیقی تھی۔ جیسے کوئی اس طرز پہ کوئی آلہ موسیقی بجا رہا ہو۔ صرف ایک دھن۔
"تم نے یہ آواز سنی؟ کہیں میوزک بج رہا ہے۔" وہ چونکنے انداز میں دائیں بائیں دیکھنے لگی۔
طوطی نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔
"نہیں باجی۔ آپ کے کان بج رہے ہیں۔" اور حیرانی سے سر جھٹکتا واپس سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ ابھی اسے ماہی کے کئی دوسرے کام بھی کرنے تھے۔
وہ جہاں تھی، وہیں بیٹھی رہ گئی۔ موسیقی کی آواز اسے ابھی تک سنائی دے رہی تھی۔ یہ ہپی برتھ ڈے ٹو یو والا میوزک ہی تھا۔ وہ اسے پہچانتی تھی۔ بے اختیار اس کی انگلیوں نے سیاہ فاختہ والے لاکٹ کو چھوا۔
نظریں فون پہ جھکیں، تو دیکھا... وہاں کاشیکٹ لسٹ میں ماہر فرید کا نام ہنوز جگمگا رہا تھا۔
لیکن یہ طے تھا کہ وہ اسے کال نہیں کرے گی۔
وہ کیا جانے کہ اَن دیکھی آوازیں اور وجود نہ رکھنے والے چہرے کیا ہوتے ہیں؟

pklibrary.com

☆☆☆

سلطان صاحب کے گھر کے لاؤنج میں نیم اندھیرا سا تھا۔ بنگالی ملازمہ پانی کا گلاس اٹھائے تخت تک آئی۔ وہاں نگینہ بیگم براجمان تھیں۔ گاؤ تکیے کا سہارا لیے وہ ایک پہلو کے بل نیم دراز آنکھیں موندے تسبیح کے دانے گرا رہی تھیں۔

ملازمہ کھنکھاری۔

"آپ کی دوا کا وقت ہو گیا ہے بی بی۔"

انہوں نے آنکھیں کھولیں۔ چہرہ نحیف اور کمزور لگتا تھا۔ سر پہ پہنا سفید دوپٹہ کلائیوں میں سونے کے کنگن اور کندھوں کے گرد بھوری شال۔ وہ بیماری میں بھی لباس کا خیال رکھتی تھیں۔ ہلکا سا مسکرائیں اور دھیرے سے کہنی کے سہارے سیدھی ہو بیٹھیں۔ ملازمہ ادب سے قریبی موڑھے پہ بیٹھی۔ پانی کا گلاس انہیں تھمایا اور باکس سے گولیاں نکالیں۔

"زیاد صاحب بہت پریشان لگ رہے ہیں۔ کیا زیادہ جھگڑا ہوا ہے مالا بی بی کے ساتھ؟" سپاٹ انداز میں پوچھتے ہوئے ایک گولی نگینہ بی بی کی ہتھیلی پہ رکھی۔

"ٹھیک ہو جائے گا۔ کوئی حل نکال لیں گے۔" انہوں نے گولی پھانکی۔ اور پانی کا گلاس لبوں سے لگایا۔ ہاتھ کپکپا رہے تھے۔

"آپ کی طبیعت کیسے سنبھلے گی؟"

"آخری حملہ شدید تھا۔ عمل الٹا پڑ گیا۔ ایسا کبھی کبھار ہو جاتا ہے۔"

انہوں نے افسوس سے نفی میں سر ہلایا۔ پھر دوسری گولی اس کی ہتھیلی سے اٹھائی۔

"لیکن اس بات کو تین مہینے سے اوپر ہو گئے ہیں۔ اب تک موکلوں کی طاقت بحال ہو جانی چاہیے۔"

انہوں نے عینک کے اوپر سے اسے دیکھا اور مسکرائیں۔

"وہ بہتر ہو رہے ہیں۔" ان کی آواز سرد سرگوشی جیسی تھی۔ ایسی سرگوشی جو طوفانی ہوائیں کرتی ہیں۔ البتہ بنگالی ملازمہ کے چہرے پہ کوئی خوف تھا نہ پریشانی۔ بس ایک عقیدت مندی تھی۔ اور بہت سا ادب۔

"تمہارے گھر میں سب خیریت ہے؟" انہوں نے مسکراتے ہوئے بغور اسے دیکھا۔ وہ بھی مسکرائی۔ اس کے ہونٹ موٹے اور آنکھیں گہری تھیں۔

"آپ کی دعا سے سب خیر ہے۔" ان بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں معنی خیز تاثر تھا۔

تبھی موبائل بجنے لگا تو اس نے جلدی سے باقی دوائیں نگینہ بیگم کی ہتھیلی پہ رکھیں اور بھاگ کے اندر کمرے میں گئی۔ واپس آئی تو ایک سیاہ اسمارٹ فون ہاتھ میں تھا۔

"تم سنو۔" انہوں نے اکتاہٹ سے ہاتھ جھلا دیا۔ "اور کہو کہ آج کل سرکار کوئی عمل نہیں کر رہیں۔"

اس نے سر اثبات میں ہلایا اور فون کان سے لگایا۔ دوسری طرف کی بات سن کے اس نے فون نیچے کیا اور دھیرے سے بولی۔

"ائیرپورٹ والے اے ایس ایف کے افسر کا فون ہے۔"

نگینہ بیگم چونکیں۔ تیزی سے کپکپاتا ہاتھ بڑھایا اور فون اس سے جھپٹنے والے انداز میں لیا۔

"کیا بات ہے قریشی؟" ان کا لہجہ چوکنا تھا۔

"سرکار . . . آپ کو ڈسٹرب کرنے کی معذرت۔" وہ بہت عقیدت سے بولا۔ "آپ نے کہا تھا کہ آپ کو اطلاع کروں اگر وہ آدمی....." رک کر نام پڑھا.... "ماہر فرید اس ملک میں داخل ہو۔"

وہ سانس روکے سن رہی تھیں۔

"وہ آج صبح پہنچنے والی فلائٹ میں اپنے بھائی کے ساتھ موجود تھا۔ میں نے پاسپورٹ کنٹرول ڈیسک کی لسٹ میں اس کا نام دیکھا تو..."

نگینہ بیگم کی رنگت سیاہ پڑنے لگی۔ ایسے جیسے

pklibrary.com

بہت سا زہر پی لیا ہو۔ انہوں نے فون پرے ڈال دیا۔ ''وہ کیسے آ گیا؟ وہ چل نہیں سکتا تھا۔'' وہ بڑبڑائیں۔ چہرے پہ شدید بے بسی اور تکلیف ابھری۔

''موکلوں نے خبر نہیں دی؟'' ملازمہ نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ انہوں نے برہمی سے اسے دیکھا۔

''موکلوں کے بس میں سب کچھ نہیں ہوتا۔ ان کی ہر خبر درست نہیں ہوتی۔ میں نے بھی کئی دن سے اس کی خبر نہیں لی تھی۔ سوچا تھا مسئلہ نہیں کرے گا۔''

''پریشان نہ ہوں بی بی۔ وہ کیا کر لے گا؟'' اس نے نرمی سے ایک اور گولی سامنے کی۔

''وہ سب خراب کر دے گا' اندرانی۔'' انہوں نے دو انگلیوں کے پوروں سے گولی پکڑی۔ اور اسے بنا پانی کے پھانک لیا۔ آنکھوں میں پریشانی بھی تھی اور خوف بھی۔

''وہ سب خراب کر دے گا۔ وہ مجھے ڈھونڈ لے گا۔'' پھر ایک تاسف بھری نظر زیاد کے کمرے کے بند دروازے پہ ڈالی۔

''وہ میرے بیٹے کا گھر نہیں بسنے دے گا۔ اسے خوش نہیں ہونے دے گا۔ سب خراب کر دے گا۔''

''اب آپ کیا کریں گی؟'' اندرانی نامی ملازمہ فکرمندی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

''میں وہ کروں گی جو پہلے نہیں ہو سکا۔'' وہ سیدھی ہو کے بیٹھیں اور کپکپاتے ہاتھوں سے تکیے کے ساتھ رکھا دوسرا فون اٹھایا' جو ان کے عام استعمال میں تھا۔

''جب کینچوا کنڈی میں ڈال کے پانی میں پھینکا جائے اور مچھلی اس کو نہ پکڑے تو کیا کرنا چاہیے؟''

''کیا؟''

''کنڈی دوبارہ سے پانی میں ڈالنی چاہیے۔ ایک کینچوا میرے پاس ابھی ہے جسے اس دفعہ وہ ضرور پکڑے گی۔'' ان کے چہرے پہ ہلکی سی مسکراہٹ در آئی۔ انہوں نے کانٹیکٹ لسٹ کھولی اور کشمالہ کے نمبر پہ انگلی رکھی۔

''ہیلو بیٹا... کیسی ہو؟'' ان کی آواز نرم اور میٹھی ہو گئی۔ جیسے شہد ہو۔ جیسے ملائی ہو۔ ''مجھے تم سے ایک کام تھا۔''

☆☆☆

ڈرائیور سفید ایس یو وی خاموشی سے چلا رہا تھا۔ کار میں ہیٹر کی گرمائش تھی۔ البتہ باہر آج زیادہ سردی نہ تھی۔ گدلی دھند نے سردی کا تاثر دے رکھا تھا۔

وہ پچھلی سیٹ پہ بیٹھا' باہر بھاگتے درختوں کے جھروکوں سے نظر آتی نہر کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے سفید شرٹ کے ساتھ سیاہ سوٹ پہن رکھا تھا۔ بال ماتھے سے پیچھے کو جمائے گئے تھے اور رخسار کا نشان ویسا ہی تھا۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' ساتھ بیٹھا بیربل کھنکھارا۔

''اس سے ملنے جس کے لیے میں آیا ہوں....'' ماہر ہنوز باہر دیکھتا رہا۔

بیربل اپنے بھائی کے حلیے کے برعکس جینز شرٹ کے اوپر جیکٹ پہنے ہوئے تھا۔ گھنگریالے بال' ایک کان میں بالی۔ کلائی میں بہت سے بینڈز۔ اور لبوں پہ بکھری معنی خیز مسکراہٹ۔

''اس کے گھر یا ورک پلیس؟'' احتیاط سے پوچھا۔

''ورک پلیس۔'' جواب سپاٹ اور سنجیدہ تھے۔ بیربل نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔

''اکیلے چلے جاتے۔ میری کیا ضرورت تھی؟''

''تم میرے نرس ہو۔'' وہ ابھی تک شیشے سے باہر دیکھ رہا تھا۔

''تم یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ تم مجھے مورل

pklibrary.com

سپورٹ کے لیے ساتھ لے کر جا رہے ہو۔ لیکن نہیں۔" بیربل بدمزہ ہوا اور سر جھٹک کے باہر دیکھنے لگا۔ اب منظر بدل چکا تھا۔ بائیں طرف بہت سی عمارتیں دکھائی دے رہی تھیں۔

"ویسے ماہر....." وہ کچھ یاد کر کے کہنے لگا۔ "تم اور میں کبھی ویکیشن پر نہیں گئے جیسے دوسرے بہن بھائی جاتے ہیں۔ میں پاکستان ہمیشہ اکیلا آتا تھا یا پھر .... (منہ کڑوا ہوا) مالک کے ساتھ زبردستی آنا پڑتا تھا۔"

"تم مالک کے ساتھ ویکیشن پہ کب گئے؟" وہ چونک کے اسے دیکھنے لگا۔

"جب میں اپنی بیکری شروع کرنے جا رہا تھا اور مجھے پیسے چاہیے تھے لیکن تم ساری جائیداد پہ سانپ بن کے بیٹھے تھے۔ تب تم نے شرط رکھی تھی کہ اگر میں نے مالک کو اپنے بزنس پلان پہ راضی کر لیا تو تم مجھے سرمایہ دے دو گے۔" کچھ یاد کر کے مسکرایا۔ "مالک نہیں چاہتا تھا کہ میں استنبول میں بیکری بناؤں۔ اس لیے وہ مجھے کئی جگہوں پہ لے کر گیا۔ کہ شاید میں استنبول کو بھلا دوں۔"

"ہاں اور تم نے اسے بہت گھمانے کے بعد بھی اپنی ضد جاری رکھی۔ اس کی بات مان لیتے تو آج تمہاری بیکری کامیاب ہوتی۔" وہ افسوس سے سر ہلا کے پھر سے باہر دیکھنے لگ گیا۔

چند لمحے خاموشی سے کٹے۔ پھر بیربل کی زبان پہ کھجلی ہوئی۔

"اس کا ردعمل کیا ہوگا تمہیں دیکھ کے؟"

"کیا فرق پڑتا ہے؟ میں ہلال کے لیے اس سے ملنے جا رہا ہوں۔" بے نیازی سے شانے اچکائے۔ بیربل اسے دیکھ کے رہ گیا۔

"اس کی ورک پلیس تو کافی خوبصورت ہے۔"

چند منٹ بعد وہ دونوں کار سے باہر تھے۔ بیربل اس کی وہیل چیئر دھکیل رہا تھا۔ ساتھ ہی گردن موڑے ستائش سے اطراف میں دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک مرمریں فرش والی عمارت میں داخل ہوئے۔ اس کی ہدایت کے مطابق وہ وہیل چیئر سیدھا لفٹ کی طرف لے آیا۔

"اس کا ٹیسٹ کافی اچھا ہے۔ آرٹسٹک۔"

"کیونکہ وہ آرٹسٹ ہے۔" ماہر کا لہجہ سپاٹ تھا۔ کوئی تاثر نہیں۔ کوئی جذبہ نہیں۔

لفٹ کے دروازے ایک مرمریں سٹنگ روم کے دہانے پہ کھلے۔ بیربل وہیل چیئر آگے لے آیا۔ سامنے انٹرکام پہ بیٹھی لڑکی نے ان کو دیکھ کے شناسائی سے سر ہلایا اور فون اٹھا کے کچھ کہنے لگی۔

بیربل ابھی تک ستائش سے اطراف میں دیکھ رہا تھا۔ خوبصورت ڈیکور۔ قیمتی پینٹنگز۔ تب ہی وہ چونکا۔ ایک دم دائیں بائیں دیکھا۔

"یہاں پودے نہیں ہیں۔" بے اختیار ماہر کو دیکھا۔ وہ سامنے آفس کے بند دروازے کو دیکھ رہا تھا۔

بیربل کے ذہن میں الارم سا بجا۔

"ایک منٹ... ایک منٹ...." وہ تیزی سے سیدھا ہوا۔

"ہم کس سے ملنے آئے ہیں؟"

ماہر فرید نے جواب نہیں دیا۔ سامنے دیکھتا رہا۔

تب ہی آفس کا دروازہ کھلا اور ہیل کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ بیربل فرید کی نگاہیں اوپر اٹھیں۔

سامنے ایک سفید کافتان پہنے، بوائے کٹ بالوں والی دراز قد عورت چلتی آ رہی تھی۔ اس کی چمکدار آنکھیں اسموکی میک اپ سے سجی تھیں۔

"کے فار کبیرہ" بیربل فرید کے لب بے یقینی سے کھلے کے کھلے رہ گئے۔ ماہر نے چہرہ اس کی طرف جھکایا۔

"زارا نے مجھے احساس دلایا کہ میرے اور کبیرہ سادان کے درمیان ایک چیز مشترک ہے۔ میں اسی کا کھوج لگانے آیا ہوں۔"

"خوش آمدید مسٹر ماہر فرید۔ پلیز اندر آئیں۔" ان کے استقبال کے لیے باہر آئی کبیرہ

pklibrary.com

بیگم اب ان کے قریب آچکی تھیں۔
بہت سی کڑواہٹ بیربل کے حلق میں گھل گئی۔
☆☆☆
گدلی دھند میں ڈوبی شام سارے لاہور کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھی۔
مبین منزل کے پیچھے بنے کچن گارڈن میں بھی وہی دھند پھیلی تھی۔ وہاں زیادہ دور تک دیکھنا ممکن نہ تھا۔ لیکن اگر تم دیکھو تو وہ گھاس پہ بیٹھی تھی۔ ڈھیلا ڈھالا سا سویٹر پہنے' پیروں کی آلتی پالتی کیے۔ اس کی نظریں فاختہ کی قبر پہ جھکی تھیں جہاں تازہ گھاس اگی تھی۔ گود میں رکھا موبائل آج خاموش تھا۔ زیاد نے کالز اور میسجز کرنا بند کردیے تھے۔ اور اسے یہی خاموشی چاہیے تھی۔
وہ اپنی غلطیوں کی ذمہ داری لیا کرتی تھی۔ اور دوسروں کی غلطیاں جلدی معاف نہیں کرتی تھی۔ کیا اسے اپنا برسوں پرانا طرز زندگی بدلنے کی ضرورت تھی؟
وہ دھیرے دھیرے سر دینکوں پہ ہاتھ پھیر رہی تھی۔ ذہن دور کہیں پیچھے جا رہا تھا۔
☆☆☆
۴ سال پہلے
یہ ان دنوں کی بات ہے جب اسے اوشن (Ocean) ریستوران کے لیے لاہور سے اسلام آباد آئے ایک سال ہو چکا تھا۔
اسے ریستوران کی رینویشن میں چند ماہ لگے تھے اور اب وہ مکمل طور پہ چالو ہو چکا تھا۔ البتہ ابھی تک وہ ایک کامیاب ریستوران نہیں بنا تھا۔ ظہیر کے لیے وہ ایک ایسا کنواں تھا جو پیسے کھا رہا تھا' لیکن پیسے واپس نہیں آرہے تھے۔
وہ ان دنوں ماموں کے گھر کی بالائی منزل پہ بطور پے انگ گیسٹ رہتی تھی۔ ماموں پہلے اس سے کرایہ لینے پہ راضی نہیں تھے لیکن وہ بنا کرایے کے رہنا نہیں چاہتی تھی سو بہت بحث و تمحیص کے بعد بالآخر وہ راضی ہو گئے تھے۔ اس کی ان سے ملاقات کم ہی ہوتی۔ وہ صبح سے رات تک ریستوران میں ہوا کرتی تھی۔ اور گھر بس سونے کے لیے آتی۔
ایک ایسی ہی رات وہ اپنے کمرے میں سو رہی تھی جب اس کا موبائل بجنے لگا۔
وہ موبائل سائیلینٹ کر کے نہیں سوتی تھی۔ اس کا موبائل ایک دن میں کئی دفعہ بجتا تھا۔ کبھی کنسٹرکشن کا کوئی نیا مسئلہ۔ کبھی فوڈ سپلائی میں گڑبڑ۔ جب وہ ریستوران سے باہر ہوتی' اس کے فون پہ موجود سی ٹی وی کیمروں کی ایپ اس کی توجہ اوشن سے بھٹکنے نہیں دیتی تھی۔
تیز گھنٹی نے اسے جگا دیا۔ ساڑھے گیارہ کا وقت ہوا تھا اور ریستوران کے ہیڈ شیف کی کال آرہی تھی۔
"میم... آپ کہاں ہیں؟" وہ جیسے چلا رہا تھا۔
"کیا ہوا؟" اس کا دل زور سے دھڑکا۔
"ریستوران کے کچن میں آگ لگ گئی ہے۔ ہم نے فائر بریگیڈ کو بلوالیا ہے۔ آپ جلدی پہنچیں۔"
کشمالہ مبین کو بات سمجھنے میں چند لمحے لگے اور پھر وہ بجلی کی سی تیزی سے بستر سے نکلی۔
اوشن جس کو اس نے بہت محنت سے بنایا اور سجایا تھا' اس میں آگ لگی تھی۔ ایک سال کی محنت جل رہی تھی۔ اور تب ہی اسے کچھ یاد آیا۔
"اور میرا آفس؟ کیا وہ محفوظ ہے؟"
"ابھی وہاں آگ نہیں پہنچی۔ لیکن کچھ کہہ نہیں سکتا۔"
"اوہ نو۔" تیزی سے جوتے پہنے' دوپٹہ اٹھایا اور پرس لیے باہر بھاگی۔
اس کے آفس میں اس کا لاکر تھا جو اس کے فنگر پرنٹ سے کھلتا تھا۔ وہ وہاں نصب کیا گیا تھا اور اسے اس وقت نکالا نہیں جا سکتا تھا۔ اس میں بہت کچھ تھا۔ اس کی سیونگز۔ اہم ڈاکومنٹس۔ بہت سا کیش۔ وہ سارا وقت ریستوران میں ہوتی تھی۔ اور

ہر ریستوران اونر کی طرح وہ اپنے آفس کو محفوظ ترین جگہ تصور کرتی تھی۔

"لاکر فائر پروف نہیں تھا۔ اف اللہ....."

وہ تیزی سے ڈرائیو کرتی بار بار اپنے فون کو دیکھ رہی تھی۔ سانس پھولا ہوا تھا۔ چہرے پر اب بھی ایکنی تھی۔ البتہ پہلے سے کافی کم۔ بال کندھوں تک آتے تھے اور ماتھے پر بینگز کی صورت میں کٹے تھے۔ اسٹیئرنگ وہیل پہ رکھے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ وہ بار بار ایکسلیٹر پہ پاؤں رکھتی۔ اسپیڈ تیز تھی۔

اسی لمحے اس کی کار کے سامنے کوئی تیزی سے آیا۔

بس ایک لمحہ اور اس نے زور سے بریک پہ پیر رکھا۔ ٹائر چرچرائے۔ کار جھٹکے سے رکی۔ اس کا اپنا سر زور سے اوپر جا لگا۔ ایئر بیگز کھل گئے۔

ایک لمحے کے لیے ساری دنیا گھوم گئی۔ اگلے ہی لمحے وہ ائیر بیگز اور سیٹ بیلٹ سے خود کو آزاد کرتی تیزی سے باہر بھاگی۔ جھٹکا کھانے سے قبل وہ دیکھ چکی تھی کہ اس کی کار نے کسی کو ٹکر ماری تھی۔

وہ ایک آدمی تھا۔ لباس سے مفلوک الحال لگتا تھا۔ وہ کار سے ٹکرا کے دور جا گرا تھا۔ خون کا فوارا اس کے سر سے بہہ رہا تھا۔ ایک عورت اس کے پیچھے بھاگتی ہوئی آرہی تھی۔ وہ اونچی آواز میں چلاتے ہوئے اس کو روک رہی تھی۔ قریب آئی تو سارا منظر دکھائی دیا۔ خون میں لت پت آدمی۔ ایک رکی ہوئی کار جس کی ہیڈ لائٹس روشن تھیں اور ڈرائیونگ دور کھلا تھا۔ اور ایک پریشان سی لڑکی جو زخمی آدمی پہ جھکی ہوئی تھی۔

وہ چیخیں مارتی ہوئی اس کی طرف بھاگی۔

"یہ کیا کیا؟ میرے بندے کو مار دیا تم نے....."

اس نے کندھوں سے پکڑ کے کشمالہ کو پرے ہٹایا۔

"آئی... آئی ایم سوری....." کشمالہ مبین کا سانس بری طرح پھول رہا تھا۔ ہاتھ پیروں میں جان نہیں تھی۔ آدمی سر پہ ہاتھ رکھے کراہ رہا تھا۔

"کمال.... کمال...." وہ عورت اس پہ جھکی چیخ رہی تھی۔

"سر پھٹا ہے اس کا۔ زیادہ گہری چوٹ نہیں ہے۔ اس جگہ اپنا دوپٹہ رکھو۔ جلدی رکھو۔" چلا کے ہدایت دی۔ عورت جلدی جلدی دوپٹے کا گولہ بنا کے اس کے سر پہ رکھنے لگی۔

کشمالہ نے سر اٹھا کے سڑک کو دیکھا۔ قریب میں چند دکانیں تھیں۔ لوگ بھاگتے ہوئے اس طرف آرہے تھے۔ اس کے حواس بحال ہونے لگے۔ یہاں تھوڑی دیر میں لوگ جمع ہو جائیں گے۔ رات کے وقت وہ ایک ہجوم کے گھیرے میں؟ ہرگز نہیں۔

"اس کو ہسپتال لے جاؤ۔ قریب میں ہسپتال ہے۔ اور وہاں جا کے مجھے کال کرو۔" وہ تیزی سے اٹھ کے کار تک گئی۔

"تم... تم بھاگ رہی ہو؟" عورت نے غصے سے پلٹ کے اسے دیکھا۔

"بھاگ نہیں رہی۔ میرے آفس میں آگ لگی ہے۔ مجھے جلدی پہنچنا ہے۔" وہ بھاگتے ہوئے واپس آئی۔ پرس سے چند نوٹ اور اپنا کارڈ زبردستی اس کے ہاتھ میں تھمایا۔

"اس کا زخم گہرا نہیں ہے۔ اسے کچھ نہیں ہوگا۔ لیکن میرا بہت نقصان ہو جائے گا۔" نگاہ اٹھا کے دیکھا۔ چند لوگ اس طرف آرہے تھے۔ وہ پنجوں کے بل سڑک پہ بیٹھی جلدی جلدی بولنے لگی۔ "یہاں کوئی بھی اس کو ہسپتال لے جائے گا۔ پلیز میری بات سمجھو۔ وہاں جا کے مجھے کال کر دینا۔ اس پہ میرا نمبر لکھا ہے اور پیسے بھی۔ مری کار کا نمبر تم دیکھ چکی ہو۔ میں بھاگ نہیں رہی۔ میں ایک گھنٹے تک سیدھی ہسپتال پہنچ جاؤں گی۔"

اگلے لمحے وہ تیزی سے واپس آئی۔ ہجوم اکٹھا ہونے لگا تھا۔ لوگ اس کی طرف اشارہ کر کے اونچی آواز میں کچھ کہہ رہے تھے۔ اس نے دروازے بند کر لیے۔ کسی نے اس کا شیشہ کھٹکھٹایا۔ لیکن اس کا

ایک ہاتھ گیئر پہ تھا اور پیر ایکسلیٹر پہ۔ تیزی سے کار کو ریورس کیا اور زن سے آگے بھگا لے گئی۔

پھر بیک ویو مرر میں دیکھا۔ کوئی اس کے پیچھے نہیں آ رہا تھا۔ اس کی پیشانی پسینے سے تر تھی اور سانس بری طرح پھول رہا تھا۔

(تمہیں اس کو ہسپتال لے جانا چاہیے تھا۔)

کسی نے اندر ہی اندر اسے ملامت کیا۔ لیکن اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"اوشن زیادہ اہم ہے۔ میرے ڈاکومنٹس۔ پیسے۔ قیمتی چیزیں۔ اور پھر وہاں بہت لوگ جمع ہیں۔ ساتھ ہی ہسپتال ہے۔ اسے کوئی ہسپتال لے جائے گا۔ اس کا سر پھٹا تھا۔ وہ بچ جائے گا۔ وہ بچ جائے گا۔ وہ بچ جائے گا۔" وہ خود سے بڑبڑا رہی تھی۔

مطلوبہ اسٹریٹ میں کار موڑتے ہی اس کی نگاہ اوشن کی طرف بلند ہوئی۔ وہ چار دیواری میں بنا ایک اطالوی بنگلے کی طرز کا ریستوران تھا جو کہ درختوں کے پیچھے چھپا تھا۔ وہاں چند کارز کھڑی تھیں۔ لیکن کوئی دھواں نہ تھا۔ نہ آگ کے شعلے۔ نہ فائر بریگیڈ۔ اس کے چہرے پہ اچنبھا ابھرا۔

وہ کار کھڑی کر کے بھاگتی ہوئی اندر آئی۔ اندر مین ہال اندھیرا تھا۔

"ظہیر۔ عباس۔ لالک۔" اس نے ڈرتے ڈرتے پکارا۔

تب ہی فضا میں موسیقی سی بج اٹھی۔ اندھیرے میں ایک دھن۔

ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔ ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔

اسی لمحے ساری بتیاں جل اٹھیں۔ شور سا بلند ہوا۔ وہ جہاں تھی وہیں کھڑی رہ گئی۔ شاک سے آنکھیں اور لب پتھر ہو گئے۔

سامنے ایک بڑی ٹیبل پہ کیک رکھا تھا اور اس کے اردگرد ریستوران کے تمام ویٹرز اور اس کے چند دوست کھڑے دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں ظہیر اور اس کی بیوی بھی شامل تھے۔ وہ سب ہنس رہے تھے۔ میوزک بج رہا تھا۔ تالیاں بجا کے اس کا استقبال کر رہے تھے۔

وہ وہیں چوکھٹ میں کھڑی تھی۔ شاکڈ۔ ششدر۔ نگاہیں گھما کے اطراف میں دیکھا۔ اوشن ٹھیک تھا۔ اوپر بنا اس کا آفس بھی ٹھیک تھا۔ سب کچھ ٹھیک تھا۔

"سرپرائز..." اس کی اسسٹنٹ صاعقہ ہنستے ہوئے کیک پر موم بتیاں جلا رہی تھیں۔ اس کی نظریں گھڑی کی طرف اٹھیں۔ بارہ بج چکے تھے۔

"یہ پرینک تھا؟" اس کو اپنی آواز کنویں سے آتی سنائی دی۔ جواب میں ایک قہقہہ سنائی دیا۔

"آپ سارا دن ہمارے اور اوشن کے لیے کام کرتی ہیں میم۔ ہم آپ کے لیے کچھ اسپیشل کرنا چاہتے تھے۔"

وہ سب مسکراتے ہوئے اس کو دیکھ رہے تھے۔

"تھینک... تھینک یو۔" وہ بدقت مسکرائی۔ پھیکی' خوف زدہ سی مسکراہٹ۔

"آپ کے ہاتھ پر خون لگا ہے۔" ایک دم صاعقہ نے کہا تو سب چونکے۔ اس نے بے اختیار اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔ دائیں ہاتھ پہ زخمی راہگیر کا خون واضح نظر آ رہا تھا۔ اس نے چہرہ اٹھایا۔ تمام نظریں اس پہ تھیں۔ سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔

"اوہ نہیں۔ یہ تو.... دراصل...." اس کا دماغ تیزی سے کام کرنے لگا۔ "راستے میں سڑک پہ ایک... ایک فاختہ مری پڑی تھی۔ اس کا... اس کا خون ہے۔" وہ جلدی سے مسکرا کے کہتے ہوئے آگے آئی۔

"تھینک یو اس سب کے لیے۔ تھینک یو گائز۔ میں ہاتھ صاف کر لوں۔" اس نے اپنا بزنس فیس آن کر لیا۔ سب کی سانس میں سانس آئی۔ میوزک پھر سے بجنے لگا۔

وہ تیزی سے ریسٹ روم کی طرف آئی اور اسے اندر سے بند کر لیا۔ پھر ہاتھ اوپر اٹھا کے دیکھا۔ تازہ خون۔ خوف' بے یقینی آنکھوں میں بھر

گئی۔

"یہ کیا ہو گیا؟" اس نے دبل کے سینے پہ ہاتھ رکھا۔ "اگر وہ مر گیا تو؟"

پس منظر میں وہی میوزک سنائی دے رہا تھا۔ ہپی برتھ ڈے ٹو یو۔ ہپی برتھ ڈے ٹو یو۔

وہ تیزی سے نل تلے ہاتھ کیے خون کو رگڑ رہی تھی۔ گلابی پانی بہہ کے سنک کے سوراخ سے نیچے جاتا زمین میں جذب ہو رہا تھا۔

☆☆☆

یہ قاسم فرید کے آفس کا منظر تھا جو ایک برس قبل ان کی وفات کے وقت سے ماہر کے زیر استعمال تھا۔ اس شام وہ مینیجر ٹیبل کے بجائے کھڑکی کے قریب بچھی ورک ٹیبل پہ موجود نظر آرہا تھا۔ سفید شرٹ کی آستین موڑے سامنے رکھے ماڈل پہ چہرہ جھکائے وہ احتیاط سے ایک ٹکڑا جوڑ رہا تھا۔ یہ اپارٹمنٹ بلڈنگ کا ایک ماڈل تھا۔ ہر چند لمحے بعد وہ رکتا، نفی میں سر ہلاتا اور پھر سے کچھ تبدیل کرتا۔

آفس میں مسلسل کرسی کے ٹائرز کی چیں چیں سنائی دے رہی تھی۔ یہ مینیجر ٹیبل کے پیچھے رکھی اونچی کنٹرول چیئر سے آرہی تھی جس پہ بیٹھی ہلال اسے مسلسل دائیں بائیں ہلا رہی تھی۔ نظریں ماہر کے چہرے پہ جمی تھیں جو متوجہ نہیں ہو رہا تھا۔ میز پہ اس کا گلابی بیک پیک رکھا تھا۔

جس روز وہ قطر سے اس کے لیے اسٹرابری والی کینڈل لیے اپنی ماں اور شمس کی دہلیز پہ گیا تھا، اس واقعے کو قریباً ایک سال گزر چکا تھا۔

"آپ بار بار قطر کیوں چلے جاتے ہو، ماہر بھائی؟" اس نے پکارا۔ وہ کام کے دوران اسے یار بار پکارتی تھی۔ وہ بیربل کو اس کے نام سے پکارتی تھی لیکن اسے بھائی کہتی تھی۔

"کیونکہ میں وہاں کام کرتا ہوں۔ اور مجھے قطر اچھا لگتا ہے۔" وہ سر جھکائے ایک کاغذ سے کچھ پڑھ رہا تھا۔

"آپ اس دفعہ قطر سے میرے لیے کچھ نہیں لائے؟" اس نے پھر سے سوال پوچھا۔ وہ جیسے بور ہو رہی تھی۔

"لایا ہوں۔ دینا بھول گیا۔ دوسرے نمبر کی دراز کھولو۔" وہ ماڈل پہ جھکا تھا۔

ہلال کی آنکھیں چمکیں۔ تیزی سے پیر نیچے کیے اور مطلوبہ دراز کھولی۔ اندر ایک سفید ڈبہ رکھا تھا۔ اس کے چہرے پہ مسکراہٹ اُمڈ آئی۔ جلدی سے ڈبے کی ربن اتاری۔ پھر احتیاط سے ڈھکن ہٹایا۔ اندر جھانکا۔ اگلے ہی لمحے اس کا چہرہ اتر گیا۔

"پھر وہی؟ سینٹڈ کینڈل؟" اس نے کینڈل جار زور سے میز پہ رکھا۔ شیشے کے لکڑی سے ٹکرانے کی آواز آئی تو ماہر نے چہرہ اٹھا کے اسے دیکھا۔ وہ بہت خفگی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"اس میں چاکلیٹ اور کافی کی خوشبو ہے۔ تمہیں اچھی لگے گی۔" اس کا چہرہ دیکھ کے وہ مسکرایا۔

"قطر میں کینڈلز کے علاوہ کچھ نہیں ملتا؟" ہلال ست روی سے اسے واپس ڈالنے لگی۔ اس نے اسے سونگھا تک نہیں تھا۔ "آپ نے مجھے اب تک آٹھ کینڈلز دی ہیں۔ میں اتنی ساری کینڈلز کا کیا کروں؟ آپ کے آفس یا گھر میں ایک بھی کینڈل نہیں ہے۔ خود نہیں استعمال کرتے۔ بس میرے لیے لاتے ہو۔"

وہ بڑبڑاتے ہوئے ربن واپس باندھ رہی تھی۔

ماہر دھیرے سے ہنس دیا۔ اور کاغذ ایک طرف رکھ کے پیچھے ٹیک لگالی۔

"جب تک تم خوشبودار کینڈل جلاؤ گی نہیں، اس کی قدر نہیں کر سکوگی۔"

"بیربل میرے لیے چاکلیٹس لاتا ہے۔ ٹوائز لاتا ہے۔ اسٹوری بکس لاتا ہے۔ آپ صرف کینڈلز لاتے ہو۔"

"کہا نا، ایک دن تم ان کینڈلز کو پسند کرنے لگو گی۔"

pklibrary.com

ہلال نے چہرہ دونوں ہتھیلیوں پہ گرادیا اور خفگی سے اسے دیکھنے لگی۔

"پاپا کہہ رہے تھے ہم شاید پاکستان شفٹ ہوجائیں۔" تھوڑی دیر بعد وہ آہستہ سے بولی تو وہ چونکا۔ آنکھوں میں اچنبھا در آیا۔

"کیوں؟"

"پتا نہیں۔ لیکن اگر ہم پاکستان چلے گئے تو میں آپ سے کیسے ملوں گی؟"

ماہر کے لب بھنچ گئے۔ ماتھے پہ تفکر کی لکیریں ابھریں۔ لیکن پھر وہ زبردستی مسکرایا۔

"ڈونٹ وری۔ میں ان سے بات کروں گا۔"

تبھی دروازے پہ دستک ہوئی۔ انگوٹھی سے دی جانے والی دستک۔ وہ اس کو پہچانتا تھا۔ ہلال بھی اسے پہچانتی تھی۔ اسی لیے فوراً سے اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنا گلابی بیک پیک اٹھالیا۔

"میں ہلال کو پک کرنے آئی تھی۔" چند لمحے بعد وہ ان کے سامنے کھڑی تھیں۔ ہلال بھاگتی ہوئی گئی اور ان کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔ انہوں نے نرمی سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ پھر چہرہ اٹھا کے اسے دیکھا۔

"آپ ٹھیک ہیں؟" وہ ماں کو دیکھ کے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں۔" چند لمحے وہ خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ وہ ان سے اس سے زیادہ بات نہیں کیا کرتا تھا۔ لیکن آج اسے کرنی تھی۔

"شمس پاکستان کیوں شفٹ ہونا چاہتا ہے؟" یہ نام لیتے ہوئے بھی اس حلق تک کڑوا ہوجاتا تھا۔

رابیل نے گہری سانس لی۔

"اس کی جاب چلی گئی ہے۔ اس کو پاکستان میں ایک اچھی جاب کی آفر ہوئی ہے۔ اس کا بزنس مائنڈ سیٹ نہیں ہے۔ اس لیے وہ چاہتا ہے کہ وہ اس آفر کو قبول کرلے اور ہم پاکستان چلے جائیں۔"

"بس؟" ماہر بغور ان کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

رابیل نے جیسے تھوک نگلا۔

"ہاں بس۔"

"نہیں۔ شمس نے کچھ اور بھی کہا ہوگا۔" وہ بنا پلک جھپکے ان کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کررہا ہوگا۔ "کہ میں پاکستان والی آفر نہیں لوں گا اگر..... اگر....؟" اس نے ابرو اٹھایا۔

رابیل کے چہرے پہ سایہ سا لہرایا۔

"اگر اس کو.... یہاں کوئی اچھی جاب مل جائے۔ یہیں سے فیئر میں کہیں۔" انہوں نے نگاہیں جھکادیں۔

ماہر نے کرب سے آنکھیں بند کیں اور کنپٹی مسلی۔ وہ اس کی ماں نہیں تھیں۔ وہ شمس کی بیوی تھیں۔ وہ اس کا مدعا لے کر سامنے آئی تھیں۔ واللہ وہ لوگوں کے بارے میں کبھی غلط نہیں ہوتا تھا۔

"شمس چاہتا ہے کہ میں اسے اپنی کمپنی میں جگہ دوں ورنہ وہ ہلال اور آپ کو یہاں سے لے کر چلا جائے گا۔" بہت سا غصہ اندر ابلنے لگا۔ وہ مزید کچھ کہتا لیکن...

"آپ پاپا کو یہاں جاب دے دو گے تو ہم یہاں سے نہیں جائیں گے؟" ہلال ایک دم چہکی۔ وہ چونکا۔ وہ بھول گیا تھا کہ وہ یہاں کھڑی تھی۔ ایک دم اسے احساس ہوا کہ اس کے پیروں میں نادیدہ زنجیریں پڑ چکی ہیں۔

وہ بدقت مسکرایا۔ "آف کورس۔ میں شمس کو اپنے قریب جاب دلوادوں گا۔ آپ لوگ پاکستان نہیں جائیں گے۔ شمس سے کہیے گا کہ مجھ سے ملے۔"

"تھینک یو ماہر۔" ان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ انہوں نے دروازہ کھولا تو ہلال آگے بھاگ گئی۔ وہ بھی آگے بڑھنے لگیں لیکن ماہر ان کے قریب آیا اور پیچھے سے ان کے کان کے قریب جھکا۔

"آپ کے شوہر کی موت میرے ہاتھوں لکھی ہے۔ کب، کہاں، میں نہیں جانتا۔ لیکن واللہ وہ میرے ہاتھ سے ہی مرے گا۔" سرگوشی میں کہا

pklibrary.com

اور واپس پلٹ گیا۔ مٹھیاں غصے سے بھینچ رکھی تھیں اور چہرہ سرخ پڑ رہا تھا۔

رابیل چونک کے اسے دیکھنے لگیں لیکن اب اس کی ان کی طرف پشت تھی۔ کہنے کو کچھ نہیں بچا تھا۔ وہ ہلال کے پیچھے چل دیں۔

ماہر نے موبائل اٹھایا۔ پھر رکھ دیا۔ مالک یہاں تھا نہیں۔ وہ آج کل بیر بل کو مختلف سائٹس وزٹ کروانے ملک سے باہر گیا ہوا تھا۔ بیر بل کو بیکری کا بخار چڑھا تھا اور ماہر نے شرط رکھی تھی کہ اگر وہ مالک کو کنوینس کر لے، تو وہ اسے پیسے دے دے گا۔ مالک کی غیر موجودگی میں اس کے قریب کوئی ایسا قابل اعتماد انسان نہ تھا جس سے وہ مشورہ کر سکے۔ جس کے ہاتھ بالآخر اس کی کمزوری آ گئی تھی۔

☆☆☆

نرم دھوپ اوشن کے برآمدے میں چھن چھن کے آ رہی تھی۔ برآمدے سے باہر نکلو اور دائیں طرف مڑ جاؤ تو ایک چھجا سا بنا تھا جس ساتھ بوگن ویلیا کا درخت کھڑا تھا۔ اس کے نیچے ایک کرسی میز بچھی تھی۔ یہاں بیٹھو تو سرما کی دھوپ بہت اچھی لگتی۔ نہ بہت سیدھی۔ نہ بہت ٹھنڈی۔ سردیوں میں وہ اس جگہ پہ بیٹھا کرتی تھی۔ یہاں اسے دن کی روشنی کے باوجود قدرے پرائیویسی مل جاتی کیونکہ یہاں سے ریستوران کا اکثر حصہ دکھائی نہ دیتا۔ سو وہ سکون سے اپنا کام کرتی رہتی۔

البتہ آج وہ کام نہیں کر رہی تھی۔ وہ وہیں بیٹھی اضطراب سے انگلیوں مروڑ رہی تھی۔ گزشتہ دو راتوں سے وہ ٹھیک سے سوئی نہیں تھی۔ بار بار اپنے موبائل کی بجھی اسکرین کو دیکھتی۔ اس نے اس عورت کو اپنا کارڈ دیا تھا۔ پھر وہ کال کیوں نہیں کر رہی تھی؟ کال آئے، وہ علاج کا خرچہ مانگے، اور یہ معاملہ ختم ہو۔

اسی لمحے گھنٹی بجی۔ اس نے تیزی سے فون اٹھایا۔ اگلے ہی لمحے جوش ماند پڑا۔

ماں کی کال آ رہی تھی۔

"کیسی ہو بیٹے؟" ان کی آواز سے لگ رہا تھا کہ فون گاؤ تکیے پہ اسپیکر پہ رکھے خود تخت پہ بیٹھی ساتھ ساتھ کوئی سبزی چھیل رہی تھیں۔ یہ ان کا سبزی کاٹنے کا وقت ہوتا تھا۔ اور اس وقت وہ ہر روز اسے کال کیا کرتی تھیں۔ وہ ماں کو کم ہی کال کرتی تھی۔ وہ بھول جاتی۔ یا وہ مصروف ہو جاتی۔ ویسے بھی ماں خود کال کر لیتی تھیں۔ اسے کم ہی ضرورت پڑتی۔

"ٹھیک ہوں، ماں۔" وہ پھیکا سا مسکرائی۔ یہاں سے برآمدے کا جو حصہ اسے دکھائی دیتا تھا، وہ خالی تھا۔ دور باغیچے میں بھی اکا دکا لوگ تھے جو ناشتہ کر رہے تھے۔

"آواز سے ٹھیک نہیں لگ رہیں۔ پریشان ہو لیکن ہمیشہ کی طرح بتاؤ گی نہیں۔" ان کا انداز سادہ تھا۔ پرسکون۔

مالا کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ کیسے پتا چل جاتا تھا انہیں ہر دفعہ؟

"مجھ سے ایک غلطی ہو گئی ہے، ماں۔" اس کا گلا رندھنے لگا۔

"جان بوجھ کے کی تھی؟" ان کا انداز نرم تھا۔

"نہیں۔ ہرگز نہیں۔ جو بھی ہوا، غلطی سے ہوا تھا۔" اس نے پلکیں جھپکائیں۔ ایک آنسو ٹوٹ کے گال پہ لڑھک گیا۔

"پھر اس کو سدھار لو۔"

"کیسے؟" اس نے ہتھیلی کی پشت سے گال رگڑا۔ ایک ہچکی سی آئی۔ سانس بے ترتیب ہونے لگا۔

"اس دنیا میں غلطی کا نتیجہ بھگتنا پڑتا ہے۔ جب غلطی سامنے آئے تو اس پہ اصرار نہ کرنا۔ معافی مانگ کے اس کو سدھار لینا۔"

"او کے۔" اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ نظریں اپنے پیروں پہ جمی تھیں جو اس نے میز پر رکھے ہوئے تھے۔ ان پہ سیدھی دھوپ پڑ رہی تھی۔

حورِ جہاں بیگم اپنے تخت پہ براجمان تھیں۔ اسپیکر فون بند کیا تو گیلی انگلی سے پانی کا دھبہ فون

اسکرین پہ لگ گیا۔ وہ پرواہ کیے بنا واپس آلوؤں کے تھال کی طرف متوجہ ہوئیں جن کو کاٹ کاٹ کے پانی کے برتن میں ڈال رہی تھیں۔

"دھیان سے۔ گر جاؤ گے۔" بخت بی پریشانی سے کہہ رہی تھیں۔ حور جہاں نے چہرہ اٹھا کے دیکھا۔ وہ اپنے نواسے کے پیچھے بھاگ بھاگ کے ہلکان ہو رہی تھیں جو لاؤنج میں بھاگتا جا رہا تھا۔ کبھی کسی میز سے ٹکرانے لگتا تو کبھی لڑکھڑانے کے قریب ہوتا۔ ہر دفعہ بخت بی اسے گرنے سے بچالیتیں۔

"اسے ایک دفعہ گرنے دو' بختو۔"

بخت بی نے پلٹ کے خفگی سے انہیں دیکھا۔

"اسے چوٹ لگ گئی تو؟"

"بچے جب بڑے ہونے لگیں تو انہیں ان کے حصے کی غلطیاں کرنے دینی چاہئیں۔ گرے گا نہیں تو اسے گرنے کی تکلیف کیسے معلوم ہوگی؟" انہوں نے کہتے ہوئے ایک نظر گاؤ تکیے پہ رکھے موبائل کو دیکھا جس کی اسکرین پہ پانی کا قطرہ ابھی تک ٹھہرا تھا۔ اور دوبارہ سبزی کاٹنے لگیں۔

وہ ابھی تک اپنے دھوپ سے سنہری ہوتے پیروں کو دیکھ رہی تھی۔ سانس ہنوز بے ترتیب تھا۔ تب ہی کانچ کے اسٹیل سے ٹکرانے کی آواز سنائی دی تو چونکی۔ گردن موڑ کے دیکھا۔

ستون کی اوٹ میں برآمدے کا جو حصہ دکھائی دے رہا تھا وہاں ایک ویٹر کھڑا جھک کے ایک میز پہ کافی رکھ رہا تھا۔ یہ میز اسے آدھی دکھائی دے رہی تھی۔ تب ہی اس نے سمجھا کہ خالی ہے۔ مگر... اس نے گردن کھینچی۔ نگاہ کا راستہ صاف ہوا۔ وہاں کوئی بیٹھا تھا۔

بجلی کی تیزی سے مالا نے پیر نیچے کیے۔ جوتے پہنے۔ اور ٹھیک سے بیٹھی۔ لباس کی نادیدہ شکنیں درست کیں۔ وہ یہاں بیٹھ کے ذاتی کالز اٹینڈ نہیں کرتی تھی۔ صرف اس صورت میں کرتی جب قریب میں کوئی نہ ہوتا۔ یونہی شرمندگی سی ہوئی۔ اس آدمی کو ساری آوازیں جاتی رہی ہوں گی۔

اور اس کی آواز بھی یہاں تک پہنچ رہی تھی۔ وہ چونکی۔ وہ آدمی ویٹر سے شکایتی لہجے میں کچھ کہہ رہا تھا۔

وہ تیزی سے اٹھی اور ستون کی اوٹ سے نکلی۔ پھر دو اسٹیپ چڑھ کے برآمدے میں آئی۔ یہاں چھاؤں تھی۔

اب اسے کونے والی میز پہ بیٹھا شخص صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ ایک سوٹ میں ملبوس ادھیڑ عمر آدمی تھا جس کے بال براق سفید تھے۔

"یہ اوٹ ملک نہیں ہے۔" وہ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے کافی کا کپ واپس رکھتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"سر یہ اوٹ ملک کی کافی ہی ہے۔" ویٹر منمنایا۔

"سر میں مینیجر ہوں۔ کوئی ایشو ہے کیا؟" وہ بہت شائستگی سے کہتے ہوئے ان کے سامنے آئی۔ ویٹر ادب سے دو قدم ایک طرف ہوا۔ سلور بالوں والے آدمی نے نگاہیں اٹھا کے اسے دیکھا۔ ان کا چہرہ ایسا تھا جیسے برف کا بنا ہو۔

"میں لیکٹوز انٹولرنٹ ہوں۔ آپ کے ویٹر کو میں نے اپنی کیپی چینوں میں اوٹ ملک ڈالنے کی ہدایت کی تھی۔ لیکن اس نے میری کافی ڈیری ملک سے بنائی ہے۔"

(لیکٹوز انٹولرنٹ لوگ وہ ہوتے ہیں جو ڈیری ملک یا اس سے بنی چیزیں استعمال نہیں کر سکتے۔)

"لالک؟" اس نے نگاہیں اٹھا کے لالک نامی ویٹر کو دیکھا۔ وہ خود باریستا (کافی آرٹسٹ) بھی تھا اور بہت اچھی کافی بناتا تھا۔

"میں نے اوٹ ملک ہی ڈالا ہے۔" اس نے بات دہرائی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

☆☆

pklibrary.com

اس کے بارے میں اک بار استخارہ کر
جو عشق راس نہ آیا، اسے دوبارہ کر

سفر وفاؤں کا بارِ دگر نہیں ہوتا
جو مل گیا ہے، اسی خواب پر گزارہ کر

کچھ ایسا کر کہ میرا دل قرار پا جائے
کوئی تو راہ سجھا، کوئی تو اشارہ کر

جہانِ تازہ ہے، ہجر و وصال سے آگے
محبتوں میں نیا کوئی استعارہ کر

مرے عزیز وسیع و عریض ہے دنیا
درونِ ذات سے باہر کا بھی نظارہ کر

نئے نصاب کھلیں گے بساطِ ہستی کے
تو اپنے سوزِ نہاں کو ذرا شرارہ کر

محمود غزنوی

مجھے مت بتانا،

کہ تم نے مجھے چھوڑنے کا ارادہ کیا تھا
تو کیوں... اور کس وجہ سے
ابھی تو تمہارے بچھڑنے کا دکھ بھی نہیں کم ہوا
ابھی تو میں —
باتوں کے، وعدوں کے شہرِ طلسمات میں
آنکھ پر خوش گمانی کی پٹی لیے
تم کو پیڑوں کے پیچھے درختوں کے جھنڈ
اور دیوار کی پشت پر ڈھونڈنے میں مگن ہوں
کہیں پر تمہاری صدا اور کہیں پر تمہاری ہوا
مجھ پہ ہنسنے میں مصروف ہے
ابھی تک تمہاری ہنسی سے نبرد آزما ہوں
اور اس جنگ میں... میرا ہتھیار
اپنی وفا پر بھروسا ہے اور کچھ نہیں
اسے کند کرنے کی کوشش نہ کرنا
مجھے مت بتانا...

پروین شاکر

pklibrary.com

شگفتہ جاہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"آدمی اسی کے ساتھ ہوگا، جس کے ساتھ اس کی محبت ہوگی۔"

(بخاری ومسلم)

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ "آدمی کچھ لوگوں سے محبت کرتا ہے، حالانکہ وہ ان سے ملا نہیں (یعنی ان کے ہم مرتبہ نہیں)"
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"آدمی ان کے ساتھ ہوگا جن سے محبت کرتا ہوگا۔"

فوائد ومسائل

☆ اس میں خیر وصلح کے ساتھ محبت رکھنے کی فضیلت کے علاوہ اللہ کے فضل وکرم کا بھی بیان ہے کہ وہ ان سے محبت رکھنے کی وجہ سے ان سے کم مرتبہ لوگوں کو بھی بلند تر درجوں پر فائز کر کے محبوبین کے ساتھ ملا دے گا۔

☆ اس میں یہ ترغیب ہے کہ برے اور بد کردار لوگوں کے ساتھ خصوصی تعلق اور محبت نہایت خطرناک ہے کہ کہیں انسان کا حشر ان ہی کے ساتھ نہ ہو۔

حکمران کے اثرات

حجاج کے زمانے میں جب لوگ صبح کو بیدار ہوتے اور ایک دوسرے سے ملاقات ہوتی تو پوچھتے گزشتہ رات کون قتل کیا گیا، کس کو پھانسی کے پھندے پر لٹکایا گیا اور کس کی پیٹھ کوڑوں کی مار سے چھلنی ہوئی۔

ولید بن عبدالملک کثیر مال وجائیداد والا اور عمارتیں بنانے کا خواہاں تھا۔ چنانچہ اس کے زمانے میں لوگ ایک دوسرے سے مکانات کی تعمیرات، نہروں کی کھدائی اور درختوں کی افزائش کے متعلق پوچھا کرتے تھے۔

جب سلیمان بن عبدالملک نے ولی عہد کی کرسی سنبھالی تو وہ کھانے پینے اور گانے بجانے کا شوقین تھا۔ چنانچہ لوگ اچھے کھانے، گانے والیوں اور لونڈیوں کے متعلق ایک دوسرے سے پوچھتے اور یہی ان کا موضوع سخن بھی ہوتا۔

اور جب عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دور آیا تو لوگوں کی آپس میں اس قسم کی گفتگو ہوتی کہ "قرآن کتنا یاد کیا، ہر رات کتنا ورد کرتے ہو، رات کو کتنے نوافل پڑھتے ہو، فلاں آدمی نے کتنا قرآن یاد کیا اور فلاں شخص مہینے میں کتنے روزے رکھتا ہے۔"

بڑا کون......؟

تیرہ سال بعد کیس ختم ہونے پر بزرگ سائل نے جج کو دعا دی۔ "اللہ تجھے ترقی دے اور تھانیدار بنائے۔"
جج نے بزرگ کی سادگی پر مسکراتے ہوئے کہا۔ "بزرگو! جج، تھانیدار سے بڑا ہوتا ہے۔"
بزرگ بولے۔ "نہیں بیٹا! تھانیدار بڑا ہوتا ہے۔"
جج نے کہا۔ "وہ کیسے؟"
بزرگ بولے۔ "آپ کو کیس ختم کرنے میں تیرہ سال لگے۔ تھانیدار نے شروع میں ہی بول دیا تھا کہ پانچ ہزار دے دو، معاملہ ابھی ختم کروا دیتا ہوں۔"

کارگر نسخہ

ایک پاپ سنگر کو ایک صاحب نے اپنے گھر گانا گانے کے لیے بلایا۔ گلوکار نے بڑے اسٹائل سے پوچھا۔ "سب سے پہلے کون سا گانا سناؤں؟"
"کوئی سا بھی سنا دو، ہمیں تو پڑوسیوں سے مکان خالی کروانا ہے۔" انہوں نے جواب دیا۔

مارک ٹوئن کہتے ہیں

☆ تعلیم زیادہ تر ان باتوں پر مشتمل ہوتی ہے

pklibrary.com

جنہیں ہم بھول چکے ہوتے ہیں۔

☆ صحت پر کتابیں پڑھتے ہوئے محتاط رہیے۔ کتابت کی غلطی سے آپ کی موت بھی واقع ہوسکتی ہے۔

☆ احمقوں سے کبھی بحث مت کرو۔ وہ تمہیں کھینچ کر اپنی سطح پر لے آئیں گے اور پھر تجربے سے تمہیں مات دے دیں گے۔

☆ ہمیشہ درست کرو۔ ایسا کرنا کچھ لوگوں کو ممنون کرے گا اور باقیوں کو چونکا دے گا۔

☆ اپنا منہ بند رکھ کر لوگوں کو یہ سمجھنے دینا کہ آپ بے وقوف ہیں۔ اس سے بہتر ہے کہ آپ اپنا منہ کھول کر سارے شکوک رفع کر دیں۔

پچھتاوا

بیگم نے اتوار کے روز شوہر کو آڑے ہاتھوں لیا۔ ''چھٹی کے دن تو کچھ وقت میرے لیے بھی نکال لیا کرو۔''

شوہر نے موبائل چارجنگ پر لگایا اور بولا۔

''بہتر ہے بیگم! آج کا پورا دن تمہارے نام۔''

پھر اس نے گھوم کر پورے گھر کا جائزہ لیا اور بولا۔ ''آج کھانا ماسی کے ہاتھ کا نہیں، تمہارے ہاتھ کا پکا کھاؤں گا، دیکھو! گھر میں ہر طرف جالے لگے ہوئے ہیں، کبھی کبھار صاف بھی کر لیا کرو، میری شرٹ کے بٹن ٹوٹ گئے ہیں، انہیں بھی ٹھیک کر دو اور ہاں، چائے پینے کو دل کر رہا ہے، ایک کپ چائے تو بنا دو۔''

بیگم نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ''یہ لو جی! آپ کا موبائل فل چارج ہو گیا۔''

رنگ اور خواتین

☆ جو خواتین سبز رنگ پسند کرتی ہیں، وہ ہر حال میں خوش رہتی ہیں۔

☆ جن خواتین کی پسند سرخ رنگ ہو، وہ ہمیشہ غصے میں رہتی ہیں۔

☆ سفید رنگ پسند کرنے والی خواتین امن پسند ہوتی ہیں۔

☆ وہ خواتین جو رونا دھونا بچائے رکھتی ہیں، کالا رنگ پسند کرتی ہیں۔

☆ گلابی رنگ چاہنے والی خواتین قناعت پسند ہوتی ہیں۔

☆ پیلا رنگ پسند کرنے والی خواتین نرم خو ہوتی ہیں۔

☆ جو خواتین بلندی کی جستجو رکھتی ہیں۔ وہ نیلا رنگ پسند کرتی ہیں۔

☆ گلابی رنگ چاہنے والی خواتین قناعت پسند ہوتی ہیں۔

☆ پیلا رنگ پسند کرنے والی خواتین نرم خو ہوتی ہیں۔

☆ وہ خواتین بلندی کی جستجو رکھتی ہیں۔ جو نیلا رنگ پسند کرتی ہیں۔

☆ نارنجی رنگ پسند کرنے والی خواتین نخرے والی ہوتی ہیں۔

☆ جامنی رنگ چاہنے والی خواتین سچائی پسند ہوتی ہیں۔

☆ بھورا رنگ پسند کرنے والی خواتین محنتی اور سخت جان ہوتی ہیں۔

دیس دیس کی باتیں

☆ جب آپ پیاس سے مر رہے ہوں تو اس وقت کنواں کھودنے میں بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔

(جاپانی کہاوت)

☆ جو ہاتھوں سے کام نہیں لیتا وہ انسان نہیں جانور ہے۔

(چینی کہاوت)

☆ خواہشیں بچے جنتی ہیں، انسان کسی حال میں خوش نہیں رہ سکتا۔

(یونانی کہاوت)

☆ اندھوں کے لیڈر بھی اندھے ہوا کرتے ہیں۔

(جرمن کہاوت)

☆ سستی چیزیں اچھی نہیں ہوتیں اور اچھی چیزیں سستی نہیں ہوتیں۔

(چینی کہاوت)

☆☆

pklibrary.com

خالدہ جیلانی

سونیا ربانی ____ قاضیاں محلہ بالا

محبتوں کا مجھ سے نصاب مانگتا تھا
چاہتوں کا اپنی حساب مانگتا تھا
عجیب شخص تھا سب کچھ جاننے کے باوجود
اکثر وہ اپنی باتوں کا جواب مانگتا تھا

مہناز ربانی ____ نامعلوم

تو جو شہر ہی میں مقیم ہے تو مسافرت کی فضا ہے کیوں
تیرا کارواں جو نہیں گیا تو ہوا میں گرد ہے کس لیے

طوبیٰ اظہر ____ کراچی

شب کی تنہائی میں اب تو
اکثر گفتگو تجھ سے رہا کرتی ہے

رضوانہ وقاص ____ کرلال پری پور

وہ جو سوچتا ہے اس کی وضاحت بھی نہیں کرتا
وہ کھل کے محبت بھی نہیں کرتا
جتنا ٹوٹ کے چاہا ہے ہم نے تمہیں
اس طرح تو کوئی عبادت بھی نہیں کرتا

نادیہ یاسر ____ گوجر خان

تو محبت سے کوئی چال تو چل
ہار جانے کا حوصلہ ہے مجھے

صدف ناز انصاری ____ ملتان

دن کے اجالوں جیسی سیاہ رات ہے
تصور اس کا ہے اسی کی بات ہے
میری شخصیت کا اور کوئی نہیں حوالہ
وہ شخص ہی اب میری ذات ہے

ہمزہ عاقب ____ گرین سٹی

اس تکلف کی محبت میں ضرورت کیا ہے
ہم نفس تیری مدارات سے گھبراتا ہوں
چال چلنے کا نہ انداز سلیقہ آیا
کس لیے آج میں شہ مات سے گھبراتا ہوں

بشریٰ محسن ____ گلشن معمار

داستان دل کی بہت عام ہوئی جاتی ہے
ایک خواہش ہے جو عام ہوئی جاتی ہے
لمحہ زیست بدل ڈالا ہے کس نے آخر
شام سے پہلے یہاں شام ہوئی جاتی ہے

عائشہ ____ کراچی

سچ ہمیشہ ہی برا لگتا ہے
اچھے لگتے مگر فسانے ہیں

فاکہہ سہیل ____ کراچی

شکست شب بس اک آواز دینا
جنوں کی حد پہ آنا چاہتا ہوں
جو میرے ساتھ چلنا چاہتا ہو
میں ایسا اک زمانہ چاہتا ہوں

صائمہ جبیں ____ کے ڈی اے

نئے کچھ بھی نہیں اقدام اپنے
وہی معمول کے ہیں کام اپنے

عذرا ناصر ____ کراچی

نہیں دیکھنا اب مجھے آئینہ
اسے توڑ دو یا مٹا دو مجھے

حمدہ خان ____ گلستان جوہر

چلتے چلتے یاد آیا رستے میں
بچپن دکھ کے بھول آیا رستے میں
اس قدر مہنگائی میں لینا چاہتا ہوں
وہ لمحہ جو خرید نہ سکا سستے میں

اقصیٰ ناصر ____ کراچی

ممکن نہیں ہے مجھ سے یہ طرز منافقت!
اے دنیا تیرے مزاج کا بندہ نہیں ہوں میں

pklibrary.com

ناہید اسمٰعیل کی ڈائری سے

زندگی کی حقیقت بیان کرتی عمار اقبال کی یہ مختصر سی غزل مجھے بہت پسند آئی آپ سب کی نذر کر رہی ہوں اس امید پر کہ آپ کو بھی پسند آئے گی۔

رنگ و رس کی ہوس اور بس
مسئلہ دسترس اور بس

یوں بُنی ہیں رگیں جسم کی
ایک نس، ٹس سے مس اور بس

سب تماشائے کُن ختم شد
کہہ دیا اس نے بس اور بس

کیا ہے مابینِ صیاد و صید
ایک چاکِ قفس اور بس

اس مصور کا ہر شاہکار
ساٹھ پینسٹھ برس اور بس

مناہل بٹ کی ڈائری سے

محسن نقوی میرے پسندیدہ شاعروں میں سے ہیں، ان کی یہ غزل مجھے بہت پسند ہے۔

نہ وہ ملتا ہے نہ ملنے کا اشارہ کوئی
کیسے امید کا چمکے گا ستارہ کوئی

حد سے زیادہ کسی سے بھی محبت کرنا
جان لیتا ہے سدا، جان سے پیارا کوئی

بے وفائی کے ستم تم کو سمجھ آ جاتے
کاش! تم جیسا اگر ہوتا تمہارا کوئی

چاند نے جاگتے رہنے کا سبب پوچھا ہے
کیا کہیں، ٹوٹ گیا خواب ہمارا کوئی

سب تعلق ہیں ضرورت کے یہاں پر محسن
نہ کوئی دوست، نہ اپنا، نہ سہارا کوئی

خنسا احمد کی ڈائری سے

عرصہ پہلے لکھی میری ڈائری میں لکھی شعیب تنویر کی غزل قارئین کی نذر

بہت فرسودہ لگتے ہیں مجھے اب پیار کے قصے
گل وگلزار کی باتیں، لب ورخسار کے قصے

یہاں سب کے مقدر میں! فقط زخم جدائی ہے
سب ہی جھوٹے فسانے ہیں وصال یار کے قصے

بھلا عشق و محبت سے کسی کا پیٹ بھرتا ہے
سنو تم، کو سناتا ہوں میں کاروبار کے قصے

مرے احباب کہتے ہیں یہی اک عیب ہے مجھ میں
سر دیوار لکھتا ہوں پس دیوار کے قصے

کہانی قیس و لیلیٰ کی بہت ہی خوب ہے لیکن
مرے دل کو لبھاتے ہیں رسن ودار کے قصے

میں کیسے خون روتا ہوں وطن کی داستانوں پر
کبھی تم بھی تو سن جاؤ مرے آزار کے قصے

شعیب، اکثر میں لوگوں سے اسی کارن نہیں ملتا
وہی بے کار کی باتیں وہی بے کار کے قصے

فاکہہ سہیل کی ڈائری سے

میری ڈائری میں لکھی آج کی ایک خوب صورت غزل

شوق کو عازم سفر رکھیے
بے خبر بن کے سب خبر رکھیے

pklibrary.com

چاہے نظریں ہوں آسمانوں پر
پاؤں لیکن زمین پر رکھیے

بات کیا ہے یہ کون دیکھے گا
آپ لہجے کو پر اثر رکھیے

جانے کس وقت کوچ کرنا ہو
اپنا سامان مختصر رکھیے

ایک ٹک مجھ کو دیکھے جاتی ہیں
اپنی نظروں پہ کچھ نظر رکھیے

ارم کمال کی ڈائری سے

یہ غزل ایک دوست نے بھیجی تھی۔ اچھی لگی تو ڈائری میں لکھ لی آپ بھی پڑھیے۔

اے دل وہ عاشقی کے فسانے کدھر گئے
وہ عمر کیا ہوئی، وہ زمانے کدھر گئے

ویراں ہیں صحن و باغ، بہاروں کو کیا ہوا
وہ بلبلیں کہاں، وہ ترانے کدھر گئے

ہے نجد میں سکوت، ہواؤں کو کیا ہوا
لیلائیں ہیں خموش، دوانے کدھر گئے

اجڑے پڑے ہیں دشت، غزالوں پہ کیا بنی
سونے ہیں کوہسار، دوانے کدھر گئے

وہ ہجر میں وصال کی امید کیا ہوئی
وہ رنج میں خوشی کے بہانے کدھر گئے

دن رات مے کدے میں گزرتی تھی زندگی
اختر، وہ بے خودی کے زمانے کدھر گئے

ثوبیہ قطب کی ڈائری سے

احمد فراز کی یہ غزل مجھے بہت پسند ہے، آپ کے لیے

ہر کوئی دل کی ہتھیلی پہ ہے صحرا رکھے
کسے سیراب کرے، وہ کسے پیاسا رکھے

عمر بھر کون نبھاتا ہے تعلق اتنا
مری جان کے دشمن، تجھے اللہ رکھے

ہم کو اچھا نہیں لگتا کوئی ہم نام ترا
کوئی تجھ سا ہو تو پھر نام بھی تجھ سا رکھے

دل بھی پاگل ہے کہ اس شخص سے وابستہ ہے
جو کسی اور کا ہونے دے نہ اپنا رکھے

ہنس نہ اتنا بھی فقیروں کے اکیلے پن پر
جا خدا میری طرح تجھ کو بھی تنہا رکھے

یہ قناعت ہے اطاعت ہے کہ چاہت ہے فراز
ہم تو راضی ہیں، وہ جس حال میں جیسا رکھے

آمنہ زاہد کی ڈائری سے

مجھے نامعلوم شاعر کی یہ نظم اچھی لگی تو میں نے اسے اپنی ڈائری کی زینت بنالیا۔

آہٹ سی کوئی آئے تو لگتا ہے کہ تم ہو
سایہ کوئی لہرائے تو لگتا ہے کہ تم ہو
جب شاخ کوئی ہاتھ لگاتے ہی چمن میں
شرمائے، لچک جائے تو لگتا ہے کہ تم ہو
صندل سے مہکتی ہوئی پرکیف ہوا کا
جھونکا کوئی ٹکرائے تو لگتا ہے کہ تم ہو
اوڑھے ہوئے تاروں کی چمکتی ہوئی چادر
ندی کوئی بل کھائے تو لگتا ہے کہ تم ہو
جب رات گئے کوئی کرن میرے برابر
چپ چاپ سو جائے تو لگتا ہے کہ تم ہو

☆☆

pklibrary.com

خبریں و بریں

واصفہ سہیل

اہلیت

خلیل الرحمان قمر ہر وقت خبروں میں رہتے ہیں چاہے ان کا ڈراما آرہا ہو یا نہیں، انہوں نے کوئی متنازعہ بیان دیا ہو یا نہیں، لوگ انہیں ڈسکس کرتے ہیں۔ گزشتہ دنوں ریشم نے ایک پروگرام میں ان کے متعلق بیان دیا تھا۔ ان کے لکھے کو پسند کرنے والے بے شمار ہیں تو ان پر تنقید بھی اتنی ہی ہوتی ہے۔

خلیل الرحمان قمر نے کہا ہے کہ "میں اپنے لکھے ہوئے کی حفاظت کرتا ہوں (کیسے؟) لوگ مجھے بد لحاظ سمجھتے ہیں لیکن کوئی کیا کہتا اور سوچتا ہے، مجھے کسی کی کوئی پروا نہیں میں اپنے اوپر ہونے والی تنقید کو تنقید نہیں بلکہ حسد سمجھتا ہوں (آہم!) اور مجھے ایسے لوگوں پر ترس آتا ہے۔ میں ایسے لوگوں کو بیمار کہتا ہوں اور بیماروں کی صحت یابی کے لیے دعا کرنی چاہیے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ میرے ڈائیلاگز میں لفاظی بہت زیادہ ہوتی ہے، ان سے اتنا ہی کہنا چاہوں گا کہ میں تو عام حالات میں عامیانہ بات نہیں کرتا تو لکھتے ہوئے کیسے کروں گا۔ (ہیں جی!) اگر کسی میں میرے ڈائیلاگز سمجھنے کی اہلیت ہی نہیں ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ ڈائیلاگ نہیں لفاظی ہے تو وہ دراصل اپنی کم عقلی کو ظاہر کر رہا ہوتا ہے۔ صاف بات ہے جو میرا لکھا ہوا سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے، میں ان کے لیے لکھتا بھی نہیں ہوں۔"

اپنے اسکرپٹ کے حوالے سے بات کرتے ہوئے انہوں نے کہا "جہاں تک میرے لکھے ہوئے میں تبدیلی کی بات ہے تو کسی کی جرات نہیں کہ وہ میرے لکھے میں تبدیلی کرے۔ اگر اداکار لکھ سکتے ہیں تو وہ لکھیں۔ میں ایکٹنگ کر لیتا ہوں۔"

pklibrary.com

خواہش

ماڈلنگ سے اپنے شوبز کیریر کا آغاز کرنے والی آمنہ الیاس نے اداکاری کے میدان میں بھی جھنڈے گاڑ دیے ہیں۔ آمنہ الیاس کے بارے میں گزشتہ دنوں یہ خبریں آرہی تھیں کہ انہوں نے اپنے چہرے کی سرجری کرائی ہے۔ آمنہ الیاس نے اس بات کی تردید کی ہے۔

ایک پروگرام میں آمنہ الیاس نے کہا کہ "وہ کسی کو (کس کو؟) مارنے پیٹنے میں بہترین تجربہ رکھتی ہیں (کس کو ڈرا رہی ہیں) اور ان کی یہ مہارت کسی سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ اگر وہ اداکارہ نہ ہوتیں تو ریسلر بنتیں۔ (تو بنی کیوں نہیں؟)

ناکامی

پاکستانی اداکاراؤں کی عجیب و غریب خواہشات جان کر کبھی کبھی تو بہت حیرت ہوتی ہے۔ اب ماہرہ خان کو ہی دیکھ لیں۔ خیر سے ایک شادی ناکام ہو چکی ہے۔ ایک بیٹا بھی ہے۔ پھر بھی ان کی خواہش ہے کہ اگر انہیں موقع ملتا تو وہ ہولی ووڈ اداکار پچپن سالہ جونی ڈیپ سے شادی کرتیں۔ (ویسے چالیس سال کے بعد پچپن سالہ سے شادی کی خواہش غلط تو نہیں) جب کہ ایکشن ہیرو ٹام کروز، لیناڑو ڈوڈی کیپریو کے ساتھ محبت کرتیں۔ (ہیں شادی کسی سے اور محبت کسی سے دوسری شادی بھی ناکام ہو جاتی پھر تو۔)

مہربانی

پاکستان ایک غریب ملک ہے۔ عوام مہنگائی کے ہاتھوں انتہائی پریشان ہیں اس غریب ملک میں ایک طبقہ ایسا ہے جو مہنگائی کو جوتے کی نوک پر رکھتا ہے۔ جوتے پر یاد آیا اداکارہ مہوش حیات نے لاکھوں روپے کے جوتے سیٹ پر گم ہونے کا انکشاف کیا ہے۔

مہوش حیات کے مطابق لندن میں ہماری شوٹنگ چل رہی تھی جس کے لیے میں استعمال میں آنے والی چیزوں کے ساتھ کچھ ایسی چیزیں بھی لے کر گئی تھی کہ وہ ضرورت پڑنے پر استعمال کی جاسکیں ان ہی چیزوں میں میرے ایک جوڑی جوتے بھی تھے جس میں سے ایک جوتا سیٹ پر گم ہو گیا۔ (چلو جی ایک جوتا لے کر کسی نے کیا کرنا ہے؟) میں نے اور ٹیم نے مل کر بہت ڈھونڈا لیکن جوتا نہ مل سکا۔ پھر ہمایوں سعید نے میرے کہنے پر وہ جوتا مجھے دلایا (آہم یعنی اگر کسی کا لاکھوں کا جوتا کھو جائے سیٹ پہ تو ہمایوں سعید اس کی پے منٹ کر دیتے ہیں۔ واہ جی واہ)

☆☆

نایاب ہیں ہم

امت الصبور

اس بے کراں اور لامحدود کائنات میں زندگی اتنی ہی پرانی ہے جتنی یہ کائنات ہے۔ یہ کائنات اسی طرح قائم رہے گی۔ زندگی بھی چلتی رہے گی —— زندگی کیا ہے؟ رفاقتیں، محبتیں، نفرتیں، عداوتیں، خواہشیں، آرزوئیں، انسان اپنی دھن میں مگن دوڑتا بھاگتا رہتا ہے۔ زندگی سے الجھتے، جھگڑتے کبھی خوش، کبھی ناراض اور موت یک دم آ کر سارے قصے ختم کردیتی ہے۔ ہر رشتے، ہر تعلق سے بے نیاز، ہر خوشی اور غم سے لاتعلق انسان خاموشی سے دوسری دنیا کے سفر پر نکل جاتا ہے۔ انسان کو تو نہ زندگی پر اختیار ہے نہ موت پر۔ اس نگار خانۂ ہستی میں انسان تماشا بھی خود ہے اور تماشائی بھی خود ہی ہے۔

ابھی خالدہ جیلانی کا دکھ تازہ ہی تھا کہ ادارے کے ایک پرانے رکن عابد حسین صاحب بھی دنیا سے رخصت ہوگئے۔ کم گو، سادہ مزاج عابد حسین —— نے ایک طویل عرصہ اس ادارے میں گزارا، وہ بہت کم بولتے تھے لیکن سمجھتے بہت زیادہ تھے۔ بڑے تحمل سے دوسروں کی باتیں سنتے رہتے لیکن کسی غلط بات پر خاموش نہ رہتے، اپنی بات ضرور کہتے لیکن کبھی بحث نہ کرتے۔ میں بہت جذباتی تھی۔ (اب بھی ہوں) کوئی اپنا مسئلہ پیش کرتا تو عابد صاحب سے جا کر کہتی، وہ میری پریشانی سے بالکل متاثر نہ ہوتے مسکرا کر بہت رسان سے کہتے۔

”آپ تک غلط اطلاع پہنچائی گئی ہے۔ ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔“ میں اس وقت خاموش تو ہوجاتی لیکن اپنی بات پر قائم رہتی لیکن وقت نے ثابت کیا کہ کسی کے متعلق ان کی رائے بالکل درست ہوتی تھی، انہوں نے جس جس کے متعلق جو کچھ کہا تھا، وہ بعد میں بالکل درست ثابت ہوا۔

اب تو کمپوزنگ نے بہت آسانیاں کردی ہیں، کہانیاں بہت جلد کمپوز ہوجاتی ہیں۔ پہلے قلم سے کتابت کی جاتی تھی۔ یہ بہت مشکل اور وقت طلب کام تھا۔ میری ہمیشہ کوشش ہوتی تھی کہ پرچے میں بہترین تحریریں شامل ہوں۔ اگر کسی اچھی مصنفہ کی کوئی اچھی تحریر پرچا پریس جانے سے دو دن پہلے بھی موصول ہوتی تھی تو میری کوشش ہوتی کہ اس کو اسی شمارے میں شامل کرلیا جائے۔ تین چار کاتب مل کر کتابت کرتے۔ ہمیں دیر تک دفتر میں بیٹھنا پڑتا۔ عابد صاحب کے ذمے پیسٹنگ کا کام تھا، ان کا کام رک جاتا۔ وہ خاموشی سے میٹر کا انتظار کرتے۔ کبھی کسی ناگواری کا اظہار نہ کیا۔ نہ ہی میٹر جلد دینے کا مطالبہ کیا۔

وہ بہت پرسکون اور شائستہ طبیعت کے مالک تھے کون ہے جس کی زندگی میں کوئی مسئلہ یا پریشانی نہ ہو لیکن عابد صاحب کمال شخص تھے۔ اتنے طویل عرصے میں انہیں میں نے کبھی کسی پریشانی کا اظہار کرتے نہیں دیکھا۔ ان کا موڈ خراب نہیں دیکھا، کبھی کسی سے تلخی سے بات کرتے نہیں سنا، کبھی کسی کے ساتھ سخت رویہ نہیں، اور کبھی کسی سے ان کی شکایت نہیں سنی۔ یہ نہیں تھا کہ وہ لوگوں کو سمجھتے نہ تھے ان کو پہچانتے نہ تھے۔ لیکن یہ ان کا ظرف تھا کہ کبھی زبان سے اظہار نہ کیا۔

کسی بھی ادارے کی کامیابی کسی ایک فرد کی کوشش اور محنت کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ اس میں بہت

pklibrary.com

سارے لوگوں کی محنت اور کوشش شامل ہوتی ہے۔ یہ ٹیم ورک ہوتا ہے۔ ادارہ خواتین کے پرچوں کی کامیابی میں عابد صاحب کا بھی بڑا حصہ تھا۔ ان کا کام بہت محنت اور توجہ کا متقاضی تھا۔ ذرا سی غلطی سے سب الٹ پلٹ ہوجاتا لیکن انہوں نے کبھی کوئی کوتاہی نہیں کی ہمیشہ اپنا کام پوری توجہ سے کیا۔

عابد صاحب بڑی پابندی سے وقت پر آتے کبھی چھٹی نہیں کی۔ بارش ہو، ہڑتال ہو، شہر کے حالات کشیدہ ہوں، ٹرانسپورٹ بند ہو، وہ کسی نہ کسی طرح وقت پر آفس پہنچ جاتے۔ کراچی میں ایک دور ایسا بھی آیا تھا جب کراچی مقتل بنا ہوا تھا۔ شہر میں آئے دن ہنگامے ہوتے رہتے تھے۔ گھر والے مجھ سے کہتے کہ آج آفس نہ جاؤ آفس بند ہوگا۔ لیکن میں اطمینان سے آفس آجاتی۔ مجھے یقین ہوتا تھا کہ آفس کھلا ہوگا اور کوئی آئے یا نہ آئے عابد صاحب ضرور اپنی سیٹ پر موجود ہوں گے۔ اور کبھی ایسا نہ ہوا کہ میرا یہ یقین غلط ثابت ہوا ہو۔ حتیٰ کہ جس دن ان کا ولیمہ تھا اس دن بھی وہ آفس میں بیٹھے تھے۔

جس دن عابد حسین صاحب کی طبیعت خراب ہوئی تو اس دن بھی وہ آفس میں کام کر رہے تھے۔ آفس کے لوگ انہیں اسپتال لے گئے۔ معدہ میں کوئی مسئلہ تھا۔ پھر اچانک حالت اتنی بگڑ گئی کہ وینٹی لیٹر پر آگئے۔ بیس بائیس دن وینٹی لیٹر پر رہے۔ سب مایوس ہونے لگے تھے کہ ان کی حالت سنبھلنے لگی وینٹی لیٹر بھی ہٹا دیا گیا۔ پھر ایک دن وہ صحت یاب ہو کر آفس آگئے۔ آفس میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ انہوں نے دوبارہ کام سنبھال لیا تھا۔

انتقال سے چند دن پہلے میں نے انہیں دیکھا، وہ دیوار سے ٹیک لگائے خاموش کھڑے تھے۔ چہرے پر تکلیف کے آثار تھے، مجھے تھوڑی سی تشویش ہوئی۔ لیکن پھر کچھ دیر بعد انہیں نارمل انداز میں کام کرتے دیکھا تو مطمئن ہوگئی۔

دوسرے دن آفس آئی تو پتا چلا کہ کل عابد صاحب کی طبیعت خراب ہوگئی تھی، انہیں اسپتال لے کر گئے تھے جہاں وہ ایڈمٹ کر لیے گئے ہیں ان پر ڈینگی کا حملہ ہوا تھا۔ اور اس بار وہ اسپتال سے اپنے پیروں پر چل کر واپس نہیں آئے۔

جانے والے اپنی اچھی بری یادیں چھوڑ کر چلے جاتے ہیں لیکن عابد صاحب کے ساتھ گزارے وقت کا کوئی ایک بھی ایسا لمحہ یاد نہیں آرہا ہے۔ جو ناخوش گوار اور تکلیف دہ ہو۔ کوئی ایک بات، کوئی ایک تلخ جملہ بھی نہیں۔ ہمیشہ انہیں مسکراتے ہی دیکھا ایسے درویش صفت لوگ کم ہی پائے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو جنت کے باغوں میں سے ایک باغ بنا دے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔

قاری بہنوں کے لیے خوشخبری

نمرہ احمد کا مشہور و معروف ناول

"مصحف"

بہترین کاغذ' خوب صورت سرورق' مضبوط جلد اور بڑے سائز پر

قیمت صرف: 600/

40% فیصد ڈسکاؤنٹ

رعایتی قیمت: 360/

پاکستان میں ہر اچھے بک اسٹال پر دستیاب ہے۔

منگوانے کا پتہ۔

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37 اردو بازار کراچی

فون: 02132216361

واٹس اپ نمبر: 03478356396

pklibrary.com

آپ کا باورچی خانہ

بشریٰ طارق

1۔آپ کھانا پکاتے وقت کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں؟ پسند، ناپسند گھر والوں کی صحت؟

ج: کھانا پکاتے وقت پسند ناپسند کو ہی مدنظر رکھنا پڑتا ہے ہماری فیملی جتنی چھوٹی ہے کھانے کے معاملے میں سب کی پسند ناپسند میں اتنا ہی فرق ہے جتنا ہمارے حکمرانوں کے قول و فعل میں ہوتا ہے۔

روزانہ دو ڈشز بنتی ہیں پھر بھی کھانے کی میز پر چیخ چیخ ہونا روز کا معمول ہے۔ایک دو کی پسند کا خیال رکھو تو باقی لوگوں کو اعتراض ہے۔علی کو تو ساری سبزیوں سے چڑ ہے سوائے بینگن کے اور نعمان تو باقی سبزیاں چھوڑو، آلو بھی شوق سے نہیں کھاتا۔جب بھی پکانے کی بات ہو، ہمارے گھر 1965 کی جنگ جیسا ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔

"آج آلو مٹر پکیں گے۔" "یہ میرا حکم ہے۔"

اور صبا تو ہر وقت کڑھی کی گردان شروع کیے رکھتی ہے۔

اس لیے ہم صرف پسند ناپسند کو مدنظر رکھتے ہیں غذائیت کو گھاس بھی نہیں ڈالتے، شاید یہی وجہ ہے کہ صحت بھی ہم سے دور بھاگتی ہے۔

س2۔گھر میں اچانک مہمان آجائیں؟

ج: ہائے اس سوال نے تو دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہے ہمارے ہاں اکثر مہمان بنا بتائے ہی آتے ہیں بہت مرتبہ کہا ہے بھئی، آنے سے پہلے فون کھڑکا لیا کرو میسج ہی بھیج دیا کرو مگر ناں جی! مجال ہے جو کسی نے کان دھرا ہو سب بغیر بتائے ہی آتے ہیں۔ بہرحال مہمان چاہے بتا کر آئیں یا بغیر بتائے۔ ہو ہی نہیں سکتا کہ ایک ڈش پکے دو تین تو لازمی پکیں گی، دو میں سے ایک ڈش چن لی جاتی ہے جو ہے چکن کڑاہی ۔چکن کڑاہی کی ترکیب حاضر ہے۔

چکن	ایک کلو
نمک	حسب ضرورت
لال مرچ	حسب ضرورت
ہلدی	آدھا چائے کا چمچہ
دہی	آدھی پیالی
ٹماٹر	دو عدد
مکھن یا مارجرین	ایک کپ
پیاز	ایک عدد
ادرک	آدھا چائے کا چمچہ

ترکیب:

سب سامان سوائے مارجرین کے چکن سمیت کڑاہی میں ڈال دیں اور ڈھکن سے ڈھانپ دیں دس پندرہ منٹ اپنے ہی پانی میں پکنے دیں اب مارجرین بھی ڈال دیں اور پھر سے ڈھک دیں پانچ سے سات منٹ بعد بھون لیں اور پھر ادرک اور دھنیا باریک باریک کاٹ کر ڈال دیں اور کڑاہی میں ہی پیش کریں۔ داد وصول کریں اور مجھے دعائیں دیں۔

س3۔کچن عورت کی سلیقہ مندی کا؟

ج: کوئی خاص اہتمام نہیں بس ایک اصول اپنائیں جو چیز استعمال کریں فوراً جگہ پر رکھ دیں یہ بات میری امی نے اس وقت میرے ذہن میں ڈال دی تھی جب میں پہلی دفعہ کچن میں گئی تھی۔ کیونکہ ادھر ادھر بکھری چیزیں ہم دونوں کو پسند نہیں۔ برتن ساتھ ساتھ دھوئیں کوئی پرانا تولیہ ہو تو اس کے چھوٹے ٹکڑے کر کے ایک جوتے کے ڈبے میں رکھ کر کچن میں رکھ لیں اور کام کرتے وقت ساتھ ساتھ شیلف اور چولہا صاف کرتی جائیں ذرا سی محنت سے کچن صاف نظر آنے لگے گا۔

pklibrary.com

س 4۔ صبح کا ناشتا ہمارے لیے بہت اہمیت؟
ج: ہمارا خاندانی مسئلہ ہے عورت چاہے کسی اور کام میں ماہر ہو یا نہ ہو کھانا پکانے میں ماہر ہونی چاہیے، اس لیے میں نے بھی جلد ہی کھانا پکانا سیکھ لیا۔ کسی مجبوری کے تحت نہیں بلکہ شوق سے۔
لیکن پکانے میں اگر کچھ مشکل لگتا ہے تو وہ ہے ناشتا بنانا، جانے کیوں میرا دل کرتا ہے کہ سارا دن چاہے جو مرضی پکالو مگر ناشتا کوئی اور بنادے، چائے تو ہمارے ناشتے کا لازمی جزو ہے چاہے جون جولائی کی گرمی ہی کیوں نہ ہو۔ پورا دن فریش گزارنے کا دارو مدار صرف ناشتے پر ہے۔ ہم سب تو ہیوی ناشتا کرتے ہیں سوائے ابو کے، وہ صرف فروٹ، کیک اور ایک کپ چائے کا لیتے ہیں۔ باقی ہم سب کی پسند مختلف ہے۔ علی ہمیشہ پراٹھا تیل میں تر بتر اور ساتھ میں دہی کھاتا ہے۔ چھوٹے صاحب زادے میٹھا آملیٹ ساتھ ڈبل روٹی کے تین چار سلائس اور ایک کپ دودھ پینا پسند کرتا ہے۔ اور میں تو جو چیز مل جائے کھالیتی ہوں بقول امی کے میری دکان (یعنی معدے) پر ہر چیز بکتی ہے اور اور میری چرخی (یعنی زبان) ہر وقت چلتی ہے۔ پھر بھی ہم کبھی کبھی مشترکہ طور پر کھٹا میٹھا آملیٹ ودھ توس بناتے ہیں جو کہ نہایت لذیذ ہوتا ہے اور لائٹ بریک فاسٹ بھی۔ آپ کے لیے بھی اس کی ترکیب حاضر ہے۔

کھٹا میٹھا آملیٹ

اشیاء	
انڈے	چار عدد
سرخ مرچ	ایک چٹکی
کالی مرچ	ایک چٹکی
کٹی مرچ	ایک چٹکی
نمک	حسب ضرورت
گرینڈ کی ہوئی شوگر	ایک چٹکی
کیچپ	حسب ضرورت

تمام اشیاء کو انڈوں میں ڈال کر مکسچر بنالیں اور اس کا خوب بڑا سا آملیٹ بنالیں اس کے 4 ٹکڑے کرلیں۔ اب توس لے کر اسے بیچ میں سے کاٹ لیں۔ اس کے بعد نیچے تھوڑی سی کیچپ ڈال کر اوپر آملیٹ رکھ کر دبا دیں۔ گرم گرم دودھ پتی کے ساتھ نہایت لذیز توس کھائیں اور مجھے شاباش دیں۔

5۔ گھر سے باہر کھانا فیشن؟
باہر کھانے کی بات کرتے ہو
دل جلانے کی بات کرتے
ہم نے کبھی ہوٹل میں چائے نہیں پی
تم کھانا کھانے کی بات کرتے ہو
(خیر یہ تو مذاق ہے) جی جناب آپ ہمیں بیک ورڈ سمجھیں یا کچھ اور، بہر حال ہمارے ہاں آج بھی خواتین کے ساتھ ہوٹلنگ کرنے کو معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اور ہمیں اپنی روایات اور اقدار سے بہت پیار ہے۔

6۔ کھانا پکاتے ہوئے ڈش کا انتخاب؟
پکوڑے کھانے کا مزہ برسات کے علاوہ کسی اور موسم میں نہیں آتا اور نہ ہی گرم گرم سوپ اور چائے گرمیوں میں مزہ دیتے ہیں۔ لیکن جہاں تک آئس کریم اور کولڈ ڈرنک کی بات ہے، ان کا مزہ تو کڑکڑاتی ہوئی سردی میں ہی آتا ہے۔ جب آئس کریم اور کولڈ ڈرنک جم رہی ہو، دانت بج رہے ہوں ٹھٹھرتے رہو اور ان چیزوں کا لطف اٹھاؤ۔
میرا کہنا تو یہ ہے کہ اگر آپ کا کچھ اچھا پکانے کا دل چاہ رہا ہے تو پھر اگر کم محنت بھی کی جائے تو کھانا بہت اچھا بن جاتا ہے لیکن اگر آپ دل سے نہیں پکا رہے اور موڈ سخت آف ہے تو پھر چاہے گھنٹوں محنت کرتے رہو، رزلٹ اتنا اچھا نہیں آتا سو میری رائے میں اتنی محنت کریں جتنا دل چاہتا ہے۔ زیادہ ٹینشن لینے کی ضرورت نہیں۔

☆☆

pklibrary.com

موسم کے پکوان

واصفہ سہیل

اچاری دہی مرچیں

اجزاء:

دہی	ایک پاؤ
زیرہ	دو چائے کے چمچے
کڑی پتے	چار عدد
املی کا رس	آدھا کپ
نمک	ایک چائے کا چمچہ
ہلدی	آدھا چائے کا چمچہ
چینی	ایک چائے کا چمچہ
ہرا دھنیا	آدھی گٹھی
تیل	آدھا کپ
ہری مرچیں	آدھا پاؤ
رائی	دو چائے کے چمچے
سونف	ایک کھانے کا چمچہ
کلونجی	ایک چائے کا چمچہ

ترکیب:

ایک دیگچی میں تیل گرم کر کے ہری مرچیں تل لیں۔ ایک پیالے میں دہی، سونف، کلونجی، رائی، نمک، ہلدی، کڑی پتے، چینی، املی کا رس اور زیرہ مکس کر لیں۔ پھر اسے باقی تیل میں ڈال کر اچھی طرح بھونیں۔ جب وہ خشک ہو جائے تو ہری مرچیں اور ہرا دھنیا ڈال کر چولہا بند کر دیں۔ اچاری دہی مرچیں تیار ہیں۔

آلو کے چپلی کباب

اجزاء:

ابلے چھلے آلو	دو کپ
پیاز	ایک کپ
ٹماٹر	ایک کپ
ہرا دھنیا	آدھا کپ
ہری مرچ	حسب ضرورت
کٹا دھنیا	ایک کھانے کا چمچہ
ادرک	ایک کھانے کا چمچہ
کٹا سفید زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
کٹا انار دانہ	ایک کھانے کا چمچہ
بریڈ کرمز	دو کھانے کے چمچے
کٹی لال مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
ہلدی	دو چٹکی
کارن فلار	دو کھانے کے چمچے
انڈے	دو عدد
تیل	تلنے کے لیے
ٹماٹر	حسب ضرورت

ترکیب:

آلوؤں کو ابال کر چھیل لیں پیاز، ٹماٹر اور ہری مرچوں کو باریک کاٹ لیں۔ انڈوں کو پھینٹ کر ایک چمچہ تیل میں آدھے کچے پکے کر لیں۔ اب کٹے ٹماٹر اور تیل کے علاوہ تمام اجزا کو ہلکے ہاتھ سے ملائیں۔ پھر چپلی کباب بنا کر ٹماٹر کا سلائس لگا دیں اور گرم تیل میں تل لیں۔ آخر میں سلاد کے ساتھ سرو کریں۔

چکن چلی گارلک کری

اجزاء:

چکن	آدھا کلو
ادرک لہسن	دو کھانے کے چمچے
کری پاؤڈر	ایک کھانے کا چمچہ
تندوری مسالا	ایک کھانے کا چمچہ
سفید زیرہ	چار چائے کے چمچے
پسی لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ

pklibrary.com

پسے ٹماٹر	چار کپ
گھی	حسب پسند
نمک	حسب ضرورت
ہرا دھنیا	آدھا گٹھی
لمبائی میں کٹی ہری مرچ	چھ سے سات عدد
باریک کٹا لہسن	چار کھانے کے چمچے

ترکیب:
چکن میں پسا ادرک لہسن کا نمک اور دو کھانے کے چمچے گھی ڈال کر پکائیں کہ چکن گل جائے۔ ایک دیگچی میں گھی گرم کرکے لہسن اور ہری مرچ تل کے نکال لیں۔ اب اس میں ادرک لہسن کا پیسٹ، کری پاؤڈر، تندوری مسالا، زیرہ، ٹماٹر اور پسی لال مرچ ملا کر مسالا بھون لیں۔ پھر اس میں پکی چکن اور ہرا دھنیا ڈال کر دم پر رکھ دیں۔ آخر میں ڈش میں نکال کر تلی ہری مرچ اور لہسن سے گارنش کرکے سرو کریں۔

مٹن نوابی گریوی

اجزاء:

مٹن	آدھا کلو
پیاز	ڈیڑھ کپ
ٹماٹر	تین سے چار کپ
نمک	ایک چائے کا چمچہ
ہلدی	آدھا چائے کا چمچہ
لال مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
بھنا، کٹا زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
پسا دھنیا	ایک چائے کا چمچہ
پسا گرم مسالا	آدھا چائے کا چمچہ
دہی	ایک کپ
تیل	حسب ضرورت
مکس ثابت گرم مسالا	حسب ضرورت
کٹی ہری مرچ	دو سے تین عدد
ہرا دھنیا	گارنش کرنے کے لیے

ترکیب:
بکرے کا گوشت سلائس پیاز، پسے ٹماٹر، نمک، پسی ہلدی، پسی لال مرچ، بھنا، کٹا زیرہ، پسا دھنیا، پسا گرم مسالا اور دہی ڈال کر ایک گھنٹہ میری نیٹ کرلیں۔ پھر دیگچی میں تیل گرم کرکے مکس ثابت گرم مسالا چند منٹ بھونیں۔ اس کے بعد سلائس ہری مرچیں اور میری نیٹ کیا ہوا مٹن شامل کرکے دس منٹ بھون لیں۔ اب اس میں دو کپ پانی ڈال کر اتنی دیر پکائیں کہ گوشت گل جائے۔ آخر میں ہرا دھنیے سے گارنش کرکے گرم گرم سرو کریں۔

قلاقند فروٹ کسٹرڈ

اجزاء:

قلاقند	پانچ عدد
کٹا سیب	ایک عدد
کٹی ناشپاتی	ایک عدد
کسٹرڈ پاؤڈر	ڈھائی کھانے کے چمچے
اخروٹ	پندرہ عدد
دودھ	ڈیڑھ کپ
پسی چینی	پانچ کھانے کے چمچے
ثابت انار	گارنش کے لیے
انگور	گارنش کے لیے

ترکیب:
پیالے میں تھوڑا سا دودھ ڈال کر کسٹرڈ پاؤڈر حل کرلیں۔ پھر باقی دودھ گرم کرکے کسٹرڈ پاؤڈر کا مکسچر ڈالیں اور اتنا پکائیں کہ مکسچر گاڑھا ہوجائے۔ اس کے بعد پسی چینی شامل کرکے پکائیں۔ اب اس میں قلاقند ڈال کر مکس کرلیں اور اتنی دیر پکائیں کہ مکسچر گاڑھا ہوجائے۔ پھر اس میں آدھے اخروٹ اور سیب شامل کرکے مکس کرلیں۔ اس کے بعد بیکنگ ڈش میں تیار کیا ہوا آدھا کسٹرڈ ڈالیں۔ اب اس میں کٹی ناشپاتی شامل کرکے باقی کسٹرڈ کا مکسچر ڈالیں۔ پھر اسے، ثابت انار، باقی اخروٹ اور انگور سے گارنش کرکے ایک سے دو گھنٹے فریج میں رکھ دیں۔ آخر میں مزے دار قلاقند فروٹ کسٹرڈ ٹھنڈا پیش کریں۔

☆☆

pklibrary.com

نام نہیں لکھا

س: ”عدنان بھائی میں کافی عرصے سے خواتین پڑھ رہی ہوں، آپ کے مشورے بھی پڑھتی ہوں آج اپنا مسئلہ لے کے آئی ہوں......

میری شادی کو چار سال ہو گئے ہیں، دو نندیں ہیں شادی شدہ، میرے شوہر اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے ہیں۔ شادی سے پہلے وہ دبئی میں رہتے تھے شادی کے بعد میں بھی دبئی چلی گئی، دو سال بہت اچھے گزرے۔ سکون سے، میری ایک بیٹی بھی ہے ڈھائی سال کی۔ شادی کے تین سال بعد مسئلے اسٹارٹ ہو گئے۔ میرے والد نے مجھے جہیز میں بہت سارا سامان دیا تھا جو کہ مجھے سب چھوڑ کر دبئی جانا پڑا۔ میری ساس نندیں پیچھے سے بہت آرام سے سارا سامان استعمال کرتی رہیں، یہاں تک کہ میری الماری کھول کے اس میں سے بھی چیزیں نکال لیتیں جب ویڈیو کال پہ بات ہوتی تو نندوں کے بچوں کے ہاتھوں میں چیزیں نظر آتیں۔ خیر جب میری بچی کی پیدائش ہوئی تو میری ساس نے مجھے کچھ بھی نہیں دیا۔ بیٹی کو بھی ٹوٹے ہوئے ٹاپس دیے۔ بچی کا سارا سامان بھی ننھیال کی طرف سے تھا۔ باقی سارا خرچا میرے شوہر نے اٹھایا۔ جب میری نند کے بچہ ہوا۔ تو میری ساس نے مجھے اور میرے شوہر کو بھیج کے میں ہزار کا بچے کا اور ماں کا سامان بھیجا مٹھائی الگ بھیجی اور نند کے ساتھ جا کے بھی رہیں۔

میرا مسئلہ یہ ہے کہ ساس میری نندوں کا ہی ہر وقت کرتی رہتی ہیں۔ میں جاب کرتی ہوں ساس سسر سارا دن گھر میں ہوتے ہیں میری بیٹی میری امی سنبھالتی ہیں۔ میں گھر کا سارا کام کرتی ہوں مگر ساس کے رویے کی وجہ سے مجھے پینک اٹیکس پڑنے لگے ہیں۔ اٹیک کے بعد میری ہمت بالکل ختم ہو جاتی ہے میں بہت کمزور ہو گئی ہوں۔ سائیکاٹرسٹ کو بھی دکھایا۔ انہوں نے کوئی دوائی نہیں دی۔ کہا آپ نارمل ہیں، آپ اپنے غصے کو اندر دباتی ہیں اس کی وجہ سے آپ کو پینک اٹیکس آتے ہیں۔

اب مسئلہ یہ ہے کہ ساس کی آواز بھی سنائی دے جائے تو مجھے غصہ آنے لگتا ہے میں ان کو برداشت نہیں کر پا رہی...... ظاہر ہے شوہر اکلوتے ہیں تو ہم الگ گھر بھی نہیں لے سکتے، والدین کی وجہ سے ہی ہم پاکستان شفٹ ہوئے تھے...... اب آپ بتائیں میں کیا کروں...... کیسے یہ سب حل ہوگا؟ آپ کی مدد چاہیے......؟“

ج: ”عزیز بہن! معذرت کے ساتھ یہ آپ کی تنگ دلی ہے آپ کو کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں، بس تھوڑا دل بڑا کر لیں سارے مسئلے حل ہو جائیں گے اور یہ کوئی مشکل کام بھی نہیں۔ بس خود کو سمجھانے کی ضرورت ہے۔ آپ کے شوہر گھر کے اکلوتے بیٹے ہیں۔ یوں سمجھیں کہ والد کے بعد گھر کے سربراہ وہی ہیں۔ اگر ساس کہیں دینا دلانا کرتی ہیں تو اس سے آپ کے شوہر کی ہی عزت بڑھے گی اور آپ کی توقیر میں بھی اضافہ ہوگا۔ بات تب ہے کہ آپ اس گھر کو اپنا گھر سمجھیں۔ اس طرح کی چھوٹی چھوٹی چیزوں پر دل برا کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ چیزیں تو اور بھی خریدی جا سکتی ہیں لیکن اس طرح کے رویے سے آپ کی کے دل میں گھر نہیں کر سکتیں جو باتیں آپ نے لکھی ہیں وہ تقریباً ہر گھر کا قصہ ہیں بلکہ اس سے دس گنا زیادہ باتیں ہوتی ہیں۔

آپ کی ساس اگر بیٹی کو آپ کے مقابلے میں زیادہ قیمتی چیزیں دیتی ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ بیٹی پرائے گھر کی ہے۔ ہمارے معاشرے میں سسرال میں بیٹی کی عزت بنانے کے لیے میکے سے اس طرح کا دینا دلانا عام رواج ہے۔ جبکہ آپ کے ساتھ تو گھر کی بات ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ آپ کی ساس کی مجبوری ہو۔ بیٹی کے سسرال والے اس طرح کے مطالبات کرتے ہوں۔

pklibrary.com

آپ کے والدین نے بقول آپ کے آپ کو بہت سارا جہیز دیا تھا اور بچی کے لیے سارا سامان بقول آپ کے ننھیال کی طرف سے تھا۔ اگر آپ کی بھابھی اعتراض کرتیں تو آپ کو اور آپ کے والدین کو کتنا دکھ ہوتا۔
تھوڑی سی برداشت اور تحمل سے کام لیں گی تو یہ آپ کے حق میں ہی بہتر ہوگا۔ سسرال میں آپ کی عزت میں اضافہ ہوگا۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آپ کی صحت اچھی رہے گی ...... ورنہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر کڑھ کڑھ کر آپ اپنی صحت تباہ کرلیں گی۔

نجمہ خان۔ کراچی

س۔ عدنان بھائی! ہوسکتا ہے میرا مسئلہ آپ کو عام سا لگے لیکن یہ میرے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ دس سال پہلے ہماری شادی ہوئی یہ ہماری پسند کی شادی تھی۔ میرے والدین تو راضی تھے لیکن ان کے گھر والوں کو اعتراض تھا، ان کے گھر والے جنید کی شادی ان کی خالہ کے گھر کرنا چاہتے تھے۔ یہ اکلوتے بیٹے تھے۔ والدین سے ضد کرکے اپنی بات منوالی۔ ہماری شادی ہوگئی۔ شادی کے بعد جنید توقع سے بڑھ کر اچھے شوہر ثابت ہوئے۔ گھر والوں کا رویہ بھی ٹھیک تھا۔ جنید نے مجھے بھرپور محبت دی۔ میری ہر خواہش پوری کی۔ مجھے اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آتا تھا۔ بس ایک کمی تھی اور وہ اتنی بڑی کمی تھی کہ اس نے ہماری ساری خوشیاں مٹی کردیں۔ وہ تھی اولاد کی کمی۔ سنسان گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا۔ میں نے سروس کرنا چاہی لیکن گھر بیٹھ کر نوکروں سے کام لیتے اتنی آرام طلب ہوگئی تھی کہ سروس کی پابندی برداشت نہ کرسکی۔
جنید کو بھی بچوں کی چاہ تھی لیکن انہوں نے میری دل جوئی کی خاطر کبھی اس کا اظہار نہ کیا والدین نے کئی بار دبے لفظوں میں دوسری شادی کا کہا لیکن ان کے سختی سے انکار پر خاموش ہوگئے۔
دو ماہ پہلے ان کی خالہ زاد اپنے بچوں کے ساتھ ہمارے گھر آئی۔ شادی کے بعد وہ کینیڈا چلی گئی تھی۔ پاکستان آئی تو خالہ کے گھر بھی آئی، وہ ہمارے گھر ایک ہفتہ رہی۔ اس کے چار بچے ہیں بہت پیارے اور ذہین، اس نے ان کی بہت اچھی تربیت کی تھی۔ ایک ہفتہ ہمارے گھر خوب رونق رہی، بچوں کی ہنسی، ان کے کھیل کود نے جیسے گھر کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔
وہ تو ایک ہفتہ رہ کر چلی گئی۔ لیکن اس کے جانے کے بعد جنید بہت چپ چپ نظر آئے۔ میں یہ بتانا بھول گئی کہ میں ڈاکٹروں سے معائنہ کراچکی ہوں، جنید مجھے باہر بھی لے کر گئے لیکن سب نے یہی کہا کہ میں ماں نہیں بن سکتی۔ خرابی مجھ میں ہے۔
اب جنید نے فیصلہ سنادیا ہے کہ وہ دوسری شادی کررہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں تم میری اولین چاہت ہو، تمہاری جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔ میں یہ شادی صرف بچوں کی خاطر کررہا ہوں۔"
عدنان بھائی! مجھے بتائیں میں کیا کروں؟ مجھ سے یہ برداشت نہیں ہورہا، مجھے شدید گھٹن محسوس ہوتی ہے، لگتا ہے میں مرجاؤں گی۔ رات رات بھر جاگتی رہتی ہوں۔ خود کو بہت سمجھاتی ہوں لیکن طبیعت نہیں سنبھلتی۔ کس طرح حالات سے سمجھوتا کروں۔
ج۔ اچھی بہن میں آپ کا دکھ سمجھ سکتا ہوں۔ شوہر کو بانٹنا آسان نہیں ہوتا۔ لیکن بے شمار عورتیں اس دکھ سے گزرتی ہیں اور برداشت بھی کرلیتی ہیں۔ آپ کے شوہر کوئی غیر شرعی کام نہیں کررہے۔ بچوں کی خواہش کسے نہیں ہوتی۔ آپ سوچیں تو یہ آپ کے لیے بھی اچھا ہے۔ آپ کے محبوب شوہر کے بچے ہوں گے، آپ کو ماں کہہ کر پکاریں گے۔ آپ کے گھر میں بچوں کی چہکار گونجے گی۔ بڑھاپے میں وہ آپ کا اور آپ کے شوہر کا سہارا بنیں گے آپ نے ان کو محبت دی تو وہ آپ کے ہی بن کر رہیں گے۔
آپ کے شوہر کی شادی کے معاملات طے پاچکے ہیں وہ، یہ شادی ضرور کریں گے۔ اگر آپ ان کی خوشی دیکھتے ہوئے سمجھوتا کرلیں گی تو گھر میں آپ کا مقام برقرار رہے گا۔ بصورت دیگر آپ کو جو حاصل ہے، اسے بھی کھو بیٹھیں گی۔

☆☆

pklibrary.com

ختم نبوت ﷺ زندہ باد　　　　عظمت صحابہ زندہ باد

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ:

معزز ممبران: آپ کا وٹس ایپ گروپ ایڈمن "**اردو بکس**" آپ سے مخاطب ہے۔

آپ تمام ممبران سے گزارش ہے کہ:

- گروپ میں صرف PDF کتب پوسٹ کی جاتی ہیں لہذا کتب کے متعلق اپنے کمنٹس / ریویوز ضرور دیں۔ گروپ میں بغیر ایڈمن کی اجازت کے کسی بھی قسم کی (اسلامی وغیر اسلامی، اخلاقی، تحریری) پوسٹ کرنا سختی سے منع ہے۔
- گروپ میں معزز، پڑھے لکھے، سلجھے ہوئے ممبرز موجود ہیں اخلاقیات کی پابندی کریں اور گروپ رولز کو فالو کریں بصورت دیگر معزز ممبرز کی بہتری کی خاطر ریموو کر دیا جائے گا۔
- کوئی بھی ممبر کسی بھی ممبر کو انباکس میں میسیج، مس کال، کال نہیں کرے گا۔ رپورٹ پر فوری ریموو کر کے کاروائی عمل میں لائے جائے گی۔
- ہمارے کسی بھی گروپ میں سیاسی و فرقہ واریت کی بحث کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔
- اگر کسی کو بھی گروپ کے متعلق کسی قسم کی شکایت یا تجویز کی صورت میں ایڈمن سے رابطہ کیجئے۔
- سب سے اہم بات:

گروپ میں کسی بھی قادیانی، مرزائی، احمدی، گستاخِ رسول، گستاخِ امہات المؤمنین، گستاخِ صحابہ و خلفائے راشدین حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی المرتضیٰ، حضرت حسنین کریمین رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین، گستاخ اہلبیت یا ایسے غیر مسلم جو اسلام اور پاکستان کے خلاف پراپیگنڈا میں مصروف ہیں یا ان کے روحانی و ذہنی سپورٹرز کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے لہذا ایسے اشخاص بالکل بھی گروپ جوائن کرنے کی زحمت نہ کریں۔ معلوم ہونے پر فوراً ریموو کر دیا جائے گا۔

- تمام کتب انٹرنیٹ سے تلاش / ڈاؤنلوڈ کر کے **فری آف کاسٹ** وٹس ایپ گروپ میں شیئر کی جاتی ہیں۔ جو کتاب نہیں ملتی اس کے لئے معذرت کر لی جاتی ہے۔ جس میں محنت بھی صَرف ہوتی ہے لیکن ہمیں آپ سے صرف دعاؤں کی درخواست ہے۔
- عمران سیریز کے شوقین کیلئے علیحدہ سے عمران سیریز گروپ موجود ہے۔
- **لیڈیز کے لئے الگ گروپ کی سہولت موجود ہے جس کے لئے ویریفیکیشن ضروری ہے۔**
- اردو کتب / عمران سیریز یا سٹڈی گروپ میں ایڈ ہونے کے لئے ایڈمن سے وٹس ایپ پر بذریعہ میسیج رابطہ کریں اور جواب کا انتظار فرمائیں۔ برائے مہربانی اخلاقیات کا خیال رکھتے ہوئے موبائل پر کال یا ایم ایس کرنے کی کوشش ہر گز نہ کریں۔ ورنہ گروپس سے تو ریموو کیا ہی جائے گا بلاک بھی کیا جائے گا۔

نوٹ: ہمارے کسی گروپ کی کوئی فیس نہیں ہے۔ سب فی سبیل اللہ ہے

0306-7163117	0343-7008883	0333-8033313
محمد سلمان سلیم	پاکستان زندہ باد	راؤ ایاز

پاکستان زندہ باد　　　　پاکستان پائندہ باد

اللہ تبارک تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو

شبانہ علی...... سیالکوٹ

س: میرے بال جس تیزی سے گر رہے ہیں، لگتا ہے بہت جلد گنجی ہو جاؤں گی۔ بالوں میں بالکل چمک نہیں سارے ہی ٹوٹکے آزما چکی ہوں۔ آپ بتایئے کیا کروں۔

ج: بالوں اور جلد دونوں کے لیے سب سے اہم چیز ہماری غذا ہے اگر ہماری غذا متوازن ہے تو یقیناً بال بھی اچھے ہوں گے، اس لیے سب سے پہلے اپنی غذا پر توجہ دیں۔ آئرن بالوں کی مضبوطی اور چمک کے لیے بہت ضروری ہے، وٹامن اے اور ای بھی بہت فائدہ مند ہے۔ آج کل سیبوں کا موسم ہے۔ آپ چھلکوں سمیت سیب کھائیں۔ سبزیاں اور پھل زیادہ استعمال کریں۔ بالوں پر مفید اثرات ہوں گے۔

بالوں میں تیل ضرور لگائیں۔ بال لمبے اور گھنے کرنے کے لیے سرسوں یا زیتون کا تیل مناسب ہے۔ آپ چاہیں تو ناریل کا تیل بھی استعمال کر سکتی ہیں۔ یاد رہے تیل صرف چند گھنٹے ہی لگانا ہے۔ زیادہ دیر تیل لگا رہے تو مسامات بند ہو جائیں گے۔

روزانہ سوتے وقت بالوں میں کئی بار کنگھی کریں۔ اسی طرح بالوں میں سے گرد و غبار نکل جاتا ہے۔ دوران خون تیز ہوتا ہے جس سے بال تیزی سے بڑھتے ہیں۔ بال گرنے کی ایک وجہ خشکی بھی ہے۔ آپ زیتون کا تیل سر میں لگائیں۔ پھر ایک تولیہ گرم پانی میں گیلا کر کے نچوڑ لیں اور اسے بالوں پر باندھ لیں۔ ایک گھنٹے بعد کسی اچھے شیمپو سے بال دھولیں۔ آپ کے سر کے مسامات کھل جائیں گے۔ خشکی کا خاتمہ ہو جائے گا۔

بالوں میں چمک پیدا کرنے کے لیے شیمپو کرنے کے بعد تھوڑا سا سرکہ یا لیموں کا عرق پانی میں ملا کر سر کے بالوں میں لگائیں۔ تھوڑی دیر بعد بال دھولیں۔ بالوں چمک آجائے گی۔

نوال احمد...... کراچی

س: چھ ماہ بعد میری شادی ہونے والی ہے لیکن میرا مسئلہ میرے دانت ہیں۔ میرے دانت تھوڑے باہر نکلے ہوئے ہیں۔ ان کا رنگ بھی پیلا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ ان کا علاج ہو سکتا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ دانت اندر ہو جائیں اور ان کا رنگ سفید ہو جائے۔ پلیز کوئی سستا سا علاج بتایئے گا۔ کیوں کہ میں بہت مہنگا علاج افورڈ نہیں کر سکتی۔

ج: نوال آپ کو دانتوں میں بریسز لگوانا پڑے گا۔ اگر آپ نے فوری بریسز لگوا لیا تو چھ ماہ میں کافی فرق پڑے گا لیکن اس کے لیے آپ کو کسی ماہر ڈاکٹر سے مشورہ لینا پڑے گا۔ کراچی میں ڈاکٹر شہباز خالق بہت اچھے ڈاکٹر ہیں۔ آپ ان سے کنسلٹ کر سکتی ہیں۔ ان کی فیس بھی مناسب ہے۔ دانتوں پر پالش سے آپ کے دانت صاف ہو سکتے ہیں۔ آپ ڈاکٹر صاحب سے اس نمبر پر فون کر کے ٹائم لے سکتی ہیں۔ 0345-2889262

کوثر...... میاں چنوں

س: میری عمر تیس سال ہے، میرے بال تیزی سے سفید ہو رہے ہیں۔ میں بالوں میں سیاہ کلر لگاتی ہوں۔ جس سے بال سیاہ تو ہو جاتے ہیں لیکن صاف پتا چلتا ہے کہ بال رنگے گئے ہیں۔ کوئی ایسی ترکیب بتائیں کہ سفید بال چھپ جائیں لیکن یہ محسوس نہ ہو کہ بالوں کو رنگا گیا ہے۔

ج: بال سیاہ بھی ہو جائیں اور یہ بھی محسوس نہ ہو کہ بالوں کو رنگا گیا ہے اور قدرتی سیاہ نظر آئیں۔ اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ بالوں میں آملہ لگائیں۔ رات کو مٹھی بھر آملے لے کر پانی میں بھگو دیں۔ صبح انہیں پیس کر بالوں میں لگالیں۔ دو گھنٹے لگا رہنے دیں پھر بال شیمپو کر لیں۔ کچھ عرصہ بعد آپ کے بال قدرتی سیاہ نظر آئیں گے۔ تازہ آملہ نہ ہو تو آملہ پاؤڈر بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس کو پانی میں گھول کر پیسٹ بنالیں۔ کچھ دیر لگا رہنے دیں پھر دھولیں۔ بہترین نتائج کے لیے اس میں تھوڑی سی مہندی بھی ملالیں۔

pklibrary.com